# شیرازہ

۹

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

# شیرازہ

سری نگر، کشمیر

جلد:۵۵ | شیرازہ | شمارہ:۱۲-۱۰

نگراں : عزیز حاجنی

مدیراعلیٰ : محمد اشرف ٹاک

مدیر : سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ: عبدالمنان گورسی

مطبع: قاف پرنٹرس

سال اشاعت: اکتوبر - دسمبر 2017

ISSN نمبر: 2277-9833

قیمت: 60 روپئے

"شیرازہ" میں جو مضامین اور تخلیقات شائع ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کلاًیا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

(ادارہ)

☆..........خط و کتابت کا پتہ:

مدیر "شیرازہ" اُردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

e-mail: salimsalik2012@gmail.com

Mob No:- 9419711330 - 9419072288

# فہرست

# حرفِ آغاز

دسمبر کا مہینہ کشمیر میں سرد موسم کا سخت ترین اور صبر آزما حصّہ ہوتا ہے۔ اِسی مہینے میں گزشتہ کئی برسوں کے دوران کشمیری ادب و ثقافت سے جُڑی کئی نامور شخصیات ہم سے رُخصت ہو گئیں جن میں اردو اور کشمیری کے نامور شاعر حکیم منظور، نامور ڈرامہ نگار اور قلمکار علی محمد لون، سرکردہ افسانہ نگار عمر مجید، شاعر، محقق اور مترجم ارجن دیو مجبور، کلچرل اکیڈیمی کے ایک سابق چیف ایڈیٹر (انسائیکلو پیڈیا) سیّد محمد احمد اندرابی، افسانہ نگار اور قلمکار بشیر اختر، ممتاز شاعر، محقق، مترجم لوک ادب پر گہری نظر رکھنے والے مصنف غلام نبی ناظرؔ، شاعر اور محقق ڈاکٹر فرید پربتیؔ، کہنہ مشق افسانہ نگار محی الدین شاہ شاعر سجاد حسین، ماہرِ اقبالیات محمد امین اندرابی وغیرہ شامل ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی مذکورہ ادیبوں اور ثقافت شناس شخصیات کو شایانِ شان خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے ہر سال مختلف تقاریب کا اہتمام کرتی ہے۔ اِس روایت کی پاسداری کرتے ہوئے دسمبر ۲۰۱۷ء میں کئی تقاریب کا اہتمام کیا گیا جن میں ان کے کنٹری بیوشن کو اُجاگر کرتے ہوئے زبان و ادب کے لئے اُن کی بے پناہ خدمات کے گونا گوں پہلوؤں پر مقالات پیش کئے گئے اور اُن کے مشن کو آگے لے جانے کے عہد کا اعادہ کیا گیا۔ ''شیرازہ'' ان شخصیات کو اپنا خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اور اپنے محترم قارئین سے گزارش کرتا ہے کہ ان کی حیات کے بعض ممکنہ مخفی گوشے اُجاگر کرنے کے لئے ہمیں اپنے قلمی تعاون سے نوازیں۔ کیوں کہ زندہ قومیں اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرتی ہیں اور اُن کے کارناموں کو اُجاگر کرنے کے لئے ہمہ تن کوشاں رہتی ہیں۔

زیرِ نظر شمارے میں کئی تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں اور ہر ایک کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن ڈاکٹر محمود شیخ کا مضمون ''امیجری کا زوال'' کئی لحاظ سے توجہ کا مستحق ہے کیوں کہ ایسے

موضوعات پر مضامین خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں فاضل مضمون نگار نے مشرقی ادب کو مغربی ادب پر اس وجہ سے فوقیت دی ہے کہ یورپ کے تمام ترقی یافتہ ممالک کا دامنِ ادب اخلاقیات اور آفاقیت سے تہی دست ہے۔ بے یقینی، تشکیک، وسوسہ اور انتشار مغربی فن و فلسفہ اور ادب کا ماحصل ہے جب کہ مشرقی ادب کے قصّوں، کہانیوں اور حکائتوں نے اخلاقی موضوعات کے فروغ میں نہایت موثر کردار ادا کیا ہے۔ اِسے دیگر الفاظ میں ''ادبِ عالیہ'' بھی کہا جا سکتا ہے جو کہ ہماری ادبی روایات کا خاصا رہا ہے اور اِس سلسلے میں آئندہ بھی وسعت دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

❁

زیرِ نظر شمارے میں ہم نے ''شیرازہ'' کے کینواس کو مزید وُسعت دینے کی سعی کی ہے تا کہ یہ مجلّہ محض خانہ پُری کے بجائے عصری تقاضوں کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکے۔ اسی کوشش کے ایک حصّے کے طور پر ریاست کی نامور اردو شاعرہ محترمہ رُخسانہ جبین کے ساتھ اُن کی سخنوری پر گفتگو، خورشید بسمّل پر اُن کے ہم عصر پروفیسر ظہور الدین کے تاثرات اور ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے ایک سابق سیکریٹری خالد بشیر احمد کے سوانحی کوائف کا احاطہ کرنے والے مضمون ''اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے'' شامل ہیں۔ اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے ہم نے بعض مقتدر قلمکاروں سے گزارش کی ہے۔ اُمید ہے کہ وہ ہماری استدعا کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اس سلسلے کو آگے لے جانے کی ہماری کوششوں کو استحکام عطا کریں گے۔

❁

زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر ایاز رسول نازکی کا سفر نامہ ایران ''ایران دوست دارم'' بھی شاملِ اشاعت ہے۔ مضمون پُر از معلومات اور دلنشین پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ بالا مضامین اور نگارشات کے ساتھ ساتھ دیگر مشمولات بھی قارئین کی پسندیدگی کا درجہ حاصل کر لیں گی اور ہمیں اِس سلسلے میں اُن کی آراء کا انتظار رہے گا۔

محمد اشرف ٹاک

مضامین

☆............ پروفیسر عتیق اللہ

# جدید نظم، ہئیت اور تجربے (1960 کے بعد)

جدید نظم، ہئیت اور تجربہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، ایک طویل تر بحث کا متقاضی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم جس جدید نظم کے زمان کا تعین 1960 سے کر رہے ہیں۔ اس کا ایک واضح پس منظر ہے اور اس پس منظر کو اگر ذہن میں رکھ کر گفتگو کی جائے تو یہ سلسلہ ماضیِ قریب میں میرا جی، ن۔م۔ راشد اور ان کے بعد مجید امجد اور اختر الایمان سے جا ملتا ہے۔ یعنی 1960 کے بعد جن کی آوازوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا ان میں ایک گروہ تو وہ تھا جو ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج سے لکھتا آ رہا تھا۔ ترقی پسند معمر دستے کے مقابلے پر یہ گروہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جو ترقی پسند انتہا پسندی کے خلاف تھے اور جن کا طرزِ احساس نیا تھا۔ یہ مختلف کی جستجو میں تھے، آزادیٔ ضمیر اور آزادیِ اظہار کے حامی، انفرادیت کے جویا اور ذاتی تجربے کے مؤید۔ دوسرا گروہ اس تازہ کار نسل پر مشتمل تھا جس کا تعلق ترقی پسندی یا ترقی پسند تحریک سے محض اکتسابی تھا۔ پہلے گروہ کے مقابلے پر دوسرے گروہ کو ایک بنی بنائی فضا میسر آئی تھی۔ مگر جدیدیت کی تعبیر و تخصیص میں اس گروہ کا بھی ایک اہم کردار ہے۔

میری نظر میں پہلا گروہ خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، قاضی سلیم، عمیق حنفی، شفیق فاطمہ

شعرائ، وحید اختر، بلراج کومل، محمد علوی، محمود ایاز، شاذ تمکنت، شہاب جعفری اور ساجدہ زیدی جیسے ناموں پر مشتمل ہے۔

دوسرے گروہ میں شہر یار، ندا فاضلی، زبیر رضوی، شمس الرحمٰن فاروقی، کمار پاشی، عادل منصوری، حمید الماس، بمل کرشن اشک ہیں، ان کے بعد صادق، علی ظہیر، صلاح الدین پرویز، رؤف خلش، عبدالاحد ساز اور شاہد کلیم ہیں۔ ان کے بعد بھی چند نام اور ہیں جو ۱۹۸۰ء کے بعد نمایاں ہوئے ہیں مثلاً بلقیس ظفیر الحسن، گلزار، رفیعہ شبنم عابدی، عنبر بہرائچی، ستیہ پال آنند، ش۔ک۔ نظام، جینت پرمار، شریف ارشد، عین تابش وغیرہ۔

یہ فہرست یقیناً نامکمل ہے۔ گروہی تخصیص میں عمر کو پیمانہ نہیں بنایا گیا ہے کیوں کہ ان میں بعض شعرائ نے اپنا تخلیقی محاورہ بعد میں بدلا اور پہچان بھی بعد میں بنائی۔ جس گروہ کے دوران عمل ان کی شناخت قائم ہوئی تھی میں نے اسی گروہ کے ساتھ انہیں شامل کیا ہے۔ باوجود اس کے مذکورہ فہرست اور ترتیب پوری طرح نہ تو مکمل ہے اور نہ تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے قطعی درست۔

اردو میں جدید ادبی تاریخ کا وہ دور جو ۱۹۶۰ء کے بعد تقریباً تیس بتیس برسوں پر محیط ہے ادبی تنازعوں و مناظروں سے معمور ہے۔ نئی نسلوں کو اس پورے تخلیقی اور تنقیدی منظر نامے کا علم ہونا چاہیے کہ نئے شعرأ اور نئے نظریہ سازوں نے ادب و تنقید کی جمالیات جب ترتیب دی تھی ان کے سامنے کون کون سے چیلنج اور خطرات تھے۔ پیش رو ادبی مقتدرہ Establishment کی گمراہیوں کو نشانہ بنانا اور انہیں رفع کرنا بھی ان کا مقصود تھا جو عالمی تناظر میں کسی وقت قطعی تازہ کار و تازہ دم تھیں۔ اگرچہ اس گروہ کی شناخت میں انحراف، اختلاف اور انکار کا پہلو سب سے زیادہ روشن ہے مگر یہ انکار ان عادات و اقدار کا ردعمل ہے جو ادب میں غلط طریقے سے رائج ہو چکے تھے۔ تاریخ و سیاست کے وسیع تر اثر و عمل کی اپنی جگہ اہمیت ہے مگر ادب میں محض انہیں قوتوں کے اثر و تعامل کا جا اور بے جا اطلاق کرنے اور ادب کو انہیں کا حاصل جمع قرار دینے کا رویہ بہت دور اور دیر تک نہ رہنمائی کر سکتا ہے اور نہ قائم رہ سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تاریخ، تہذیب اور سیاست کے اطلاق کو مسئلہ بنا کر جب خالص جمالیاتی بنیادوں پر جدیدیت کی تخصیص قائم کی گئی تو اس گمراہی نے بھی جنم لیا کہ ان قوتوں اور حقائق کا شعور بھی شاید غیر ضروری ہے۔ نتیجتاً پہلی نسل کے شعرائ کے یہاں جو

وسعتِ کلامی، اشیا فہمی اور حیات و کائنات کا ادراک ہے اور ان وجوہ سے ان کے یہاں جو تنوع دکھائی دیتا ہے بعد ازاں اس کی قابلِ لحاظ توسیع نہیں ہو سکی۔ اس عبارتِ معترضہ سے قطع نظر نئے شعرا نے اپنے بڑوں کے پھیلائے ہوئے مغالطوں اور خوش فہمیوں کو دور ہی نہیں کیا بلکہ ادب و شعر کے وسیع تر پس منظر میں جمالیاتی اور بشری قدروں سے متعلق سوالات بھی اٹھائے اور ان کے جواب بھی فراہم کیے۔

ان ذہنوں نے نئی شعری لسانیات کی آگاہیاں فراہم کیں۔ تخلیقی عمل کے علاوہ تخلیقی زبان اور معنی کے اضافی کردار کو موضوعِ بحث بنایا اور جدید تصوراتِ شعر کے پہلو بہ پہلو کلاسیکی نظامِ بلاغت اور نظامِ بدیعیات سے روشنی اخذ کر کے اپنے استدلال کو مستحکم کیا۔ علاوہ اس کے ان نئے فلسفیانہ اور نیم فلسفیانہ افکار و تصورات سے بھی باخبر کیا گیا جس نے نئے انسان کی بصیرتوں کو توانگر کیا تھا اور چیزوں کی فہم کا نیا شعور بخشا تھا۔ اس عمل نے یقیناً، نئی رغبتوں پر مہمیز کی اور نئے ذہنوں میں روایت کو سمجھنے کی ایک نئی کرید بھی پیدا ہوئی۔

اب ان شعراء کی تخلیقی عمر چالیس پینتالیس کو پہنچ رہی ہے۔ ایک بڑے عرصے تک ان کا غلغلہ بلند رہا۔ یہی نام ہماری تنقید کا کل بھی آموختہ تھے اور آج بھی ہیں۔ ان کے تخلیقی سوتے ابھی خشک نہیں ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی پیش رو نسل سے جن بعض بنیادوں پر انحراف یا اختلاف کیا تھا وہ جتنی با معنی کل تھیں اتنی ہی آج بھی ہیں۔ اسی طرح یہ شعرا آج بھی اتنے ہی با معنی ہیں جتنے کل تھے۔ ان کے اسالیب اتنے متنوع، منفرد اور واضح تھے جن کی گونج بعد کی نسلوں میں بہت دور تک سنائی دیتی رہی۔

مغرب میں ہئیت form سے مراد متعین عروضی اور قافیہ اساس مصرعہ جاتی تنظیم کے بھی ہیں جیسے سانیٹ، اوڈ اور بیلڈ وغیرہ، ان کا شمار Genre یعنی صنف میں بھی کیا جاتا ہے اور Type اور Kind جیسے الفاظ بھی صنف کے مترادف کے طور پر مستعمل ہیں۔ ہمارے یہاں قصیدہ، مثنوی اور غزل کا اپنا انفرادی نظامِ ہئیت ہے اور یہ ہی اصناف بھی ہیں۔ بعض اصناف مواد اور ہئیت دونوں کو جامع ہیں جیسے قصیدہ، اور بعض کی تخصیص اپنی تکنیک یعنی اس مخصوص عمل سے قائم ہوتی ہے جو اپنے آخری شمار میں کسی منطقی ہئیت پر منتج ہوتی ہیں اور جس سے کسی تخلیق کی بافت متعین ہوتی ہے جیسے

غزل اور مثنوی اسی کے ذیل میں ترکیب بند، ترجیع بند اور مستزاد وغیرہ کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ بعض اصناف جیسے مرثیہ اپنے مقصد اور مواد سے پہچانا جاتا ہے۔ ہئیت کو محض اظہار یا Expression بھی کہا جاسکتا ہے اور اگر مواد، موضوع یا مضمون اس کی ضد ہے تو خیال ایک ایسا موزوں متبادل لفظ ہے جو ان تمام الفاظ کو حاوی ہے۔ یعنی کیسے کہا گیا ہے اگر اظہار ہے، تو کیا کہا گیا ہے وہ خیال ہے جو سانس کی طرح کسی پیکر تخلیق میں رواں دواں ہے۔ مگر جدید شعریات کی روشنی میں باہمی ضد کی یہ صورت جمالیاتی اور تخلیقی واحدیت اور سالمیت کی نفی کرتی ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر تخلیق اپنی شکل خود بناتی ہے خواہ اس کا کوئی نفسیاتی جواز ہو یا وہ کرشمہ ہو فیضان و وجدان یا داخلی حرکیت کا یا نتیجہ ہو تہذیبی ولسانی غیر ارادی جبر کا۔ تو کیا ہم اپنے تمام کلاسیکی منظوم سرمائے کو مشتبہ قرار دے دیں گے یا جو ہمارے عہد میں شہر آشوب، طویل پابند نظمیں، مرثیے اور مثنویاں لکھی گئی ہیں ان کے بارے میں ہماری رائے کیا ہوگی۔ ظاہر ہے تخلیق کے ساتھ بالیدگی کے تصور کے اطلاق میں ہمیں قدرے احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ آج ہم معرّیٰ، آزاد اور نثری نظم کے دور میں جی رہے ہیں اور ہماری سماعتوں اور بصارتوں کے معیار بھی کافی حد تک بدل چکے ہیں باوجود اس کے کلاسیکی ضابطہ بند ہیئت والی بے شمار نظمیں ہمیں آج بھی پوری قوت کے ساتھ متاثر کرتی ہیں۔ اور ہم انہیں بار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار نئی بصیرتیں اور نئی حیرتیں ہمارے حصے میں آتی ہیں۔ دراصل معروف و متداول ہیئتیں کورے فارمیٹ (Format) ہیں جن کی حدود ہی میں آپ کو اپنی خلاقی کے جوہر دکھانے پڑتے ہیں۔ شاعر کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس کے قدرتِ کلام، تخیّل کی حساسیت اور زبان و بیان کی مشق پر ہے۔ اگر شاعر اپنے جذبوں اور لفظوں پر قادر ہے اور گہری تخلیقی حس رکھتا ہے اور اپنی زبان کو حسی اور تخلیقی تجربہ بنانے کے فن سے بھی واقف ہے تو وہ غیر شاعرانہ حقائق کو بھی شاعرانہ بنا سکتا ہے۔ پابند نظم میں بھی بحر، آہنگ، بندوں کی تشکیل، قافیے اور ردیف کا التزام، یا صنف کی مقررہ ساخت وغیرہ امور جن سے ہئیت کا ظاہری پن مشکل ہوتا ہے نظم کے کل معنی ہی کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم بنی نہیں ہے، واقع ہوئی ہے۔ اور اس کا معنی و موضوع وہی ہے جو ہئیت ہے اور جو ہئیت ہے وہی اس کا معنی و موضوع ہے۔

جدید شعراء کے یہاں ۶۰ء تا حال گویا تقریباً ان پینتیس برسوں میں ہئیت کے کئی قابلِ ذکر تجربے ملتے ہیں۔ ان میں بعض معرّیٰ میں ہیں مگر معرّیٰ اب اتنا پسندیدہ فارم نہیں رہا دوسرے آزاد اور نثری نظم کے تجربے ہیں جو یقیناً عصر رواں میں سب سے مرغوب ہئیتیں ہیں۔ تیسرے کلاسیکی اصناف اور ہئیتوں کی طرف رومانی رغبت ہے اور یہ رومانی رغبت جہاں ایک طرف پرانی ہئیتوں اور تکنیکوں کے احیا کے رجحان کا پتہ دیتی ہے وہاں ماضی کے بہترین تہذیبی ورثے کی بازیافت کی تڑپ بھی اس میں مضمر ہے۔

1960ء تک معرّیٰ نظم لکھنے والوں میں بزرگ جدید شعراً کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کی ابتدائی نظموں پر اختر الایمان اور مجید امجد سے زیادہ یوسف ظفر، قیوم نظر، ضیا جالندھری اور اعجاز بٹالوی کا اثر غالب تھا۔ بعدازاں اس اثر پذیری کا رخ اختر الایمان اور راشد وغیرہ کی طرف مڑ گیا۔

باقر مہدی، عمیق حنفی، قاضی سلیم، خلیل الرحمٰن اعظمی، شفیق فاطمہ شعریٰ، بلراج کومل اور وحید اختر کی بیش تر ابتدائی نظمیں معرّیٰ بھی ہیں۔ یہ حضرات بہت بعد میں باقاعدگی کے ساتھ آزاد نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے وحید اختر اور بلراج کومل کے استثنا کے ساتھ شعوری طور پر غزل کی تلفیظ (ڈکشن)، مقرّس تراکیب اور اسمائے صفات کی تکرار سے اپنی نظم کو بڑی حد تک محفوظ رکھا۔ روزمرہ کے مانوس الفاظ اور قرب وجوار کی اشیاء کو انہوں نے اپنا شعری تجربہ بنایا، فلسفیانے کی کوشش کم سے کم کی گئی۔ بالخصوص دھیما آہنگ اور داخلی گفتار جو کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا صیغہ کلام بن گئی تھی۔ اس کا تسلسل اور اس کی بہترین صورت بعد کے اکثر شعرا میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ خلیل مرحوم کی اکثر نظموں میں جملوں کی سی صاف ستھری نحوی بندش کے ساتھ ساتھ لہجے کا کھردراپن بھی موجود ہے اور یہ کھردراپن اور نثریت، باقر مہدی، عمیق حنفی، قاضی سلیم اور بلراج کومل کی شاعری میں بھی برقرار ہے۔ اس نثریت کا ایک سبب تو یہ ہے کہ کلاسیکی تنظیم و تضبیط Decorum اور روایتی موسیقی آمیز آہنگ میں جو یکساں روی اور ہماری بصری اور سمعی حسوں کو طمانیت بہم پہنچانے کی صفت تھی، شور و غوغا سے بھرے ہوئے نئے تہذیبی تناظرات میں برقرار نہ رہ سکی۔ اب ناہمواری، بدنظمی اور انتشار کا جواز دوسرے بہت سے راست اور ناراست رشتوں کے سیاق پر منتج تھا۔ اس طرح سب سے زیادہ Perfection یعنی تکمیل کے تصوّر پر کاری

ضرب لگی۔ یہی قطعی تبدیل شدہ وسیع وعریض سیاق ان شعرا کی لفظیات کا اصل مخرج بھی ہے۔ ان اسماء والفاظ اور اشیاء کو کبھی ہماری شاعری نے انگیز نہیں کیا تھا۔ اسی لیے ان کی اجنبیت مقدّر ٹھہری۔ خلیل مرحوم نے بھی غزل کی لفظی رعایتوں سے دامن بچایا تھا۔ اختؔر الایمان کی طرح قاضی سلیم بھی غزل سے شاکی تھے۔ یہ شعراء جن میں عمیق حنفی، بلراج کومل اور باقر مہدی بھی شامل ہیں۔ میراجیؔ، ن۔م۔راشدؔ، اختؔر الایمان، مختاؔر صدیقی اور مجید امجدؔ سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ راشدؔ کی طرف بلراج کومؔل ہی نہیں بعد کی نظموں میں ساجدہ زیدیؔ بھی مائل ہیں بلکہ ساجدہ زیدی کے ذہنی رشتے راشدؔ ہی سے جا کر ملتے ہیں۔ اختؔر الایمان کی معرّیٰ نظموں کی تکنیک قاضیؔ سلیم کو بے حد مرغوب تھی مگر قاضیؔ سلیم کی طبعی دردمندی اور طنزیہ گفتار سے عدم رغبت نے اسے پھیلنے نہیں دیا۔ یہ پھیلاؤ ان کی آزاد نظم میں دکھائی دیتا ہے جو اتنی کٹی پھٹی اور اکھڑی ہوتی ہے کہ ہم آسانی کے ساتھ نثر کی طرح اس کی قرأت کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ صورت ان کی نئی پابند نظموں یعنی مثنویوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اس ادا کو قائم رکھنے کے لیے پنگل کا سہارا لیا ہے اسی ترجیح کی بدولت مصرعہ بہ مصرعہ نثر جیسی نحوی ترتیب قایم ہو جاتی ہے جو معاً مجید امجدؔ کی یاد دلاتی ہے۔ اسی بنا پر مجید امجدؔ کی اکثر نظموں پر نثری نظم کا گمان ہوتا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ مجید امجد طویل مصرعوں کے عادی ہیں اور قاضیؔ سلیم ایسی بحر کا انتخاب نہیں کرتے جو طویل مصرعوں کی متقاضی ہو۔ جہاں یہ صورت نکلتی ہے وہاں وہ زحافات سے کام لے لیتے ہیں۔ قاضیؔ سلیم اور بلراج کومؔل کی نظموں میں متوقع اور غیر متوقع کئی شعری وقفے Pauses تواتر کے ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نظم کی ساری کڑیاں درہم برہم ہو گئی ہیں مگر اصلاً اس قسم کے باریک اور خفیف تعطلات اور وقفوں سے معمور نظمیں بہ غور قرأت کا مطالبہ کرتی ہیں۔

خدایا!
ترے پاس کیا کوئی ایسا فرشتہ نہیں
جو مردہ، بے دفن، بے قبر کے جسم کو
آ کے اپنے پروں پر اٹھا لے
اور تجھ کو یہ تیری امانت ابھی سونپ دے

میں نہیں چاہتا
اب کوئی اور آ کر
مجھے آخری غسل دینے کی خاطر
مرے جسم کے سارے کپڑے اتارے
برہنہ مجھے دیکھے............اور چیخ مارے
کہ یہ کون ہے؟......کس سیہ کار کا جسم ہے
اور وہ شخص اس چیخ پر کوئی پتھر دبا کر
بہت منہ بنا کر
بڑی اونچی سی ناک پر اپنا رومال رکھ کر
ادا کر کے سب اپنی رسمیں
مجھے ایک تاریک اور تنگ سی کوٹھری میں چھپا دے (''کتبہ'': خلیل الرحمن اعظمی)

.......................O.......................

بند آنکھ کی بہشت میں
سب دریچے سب کواڑ کھل گئے
اپنی خلق کی ہوئی/حسین کائنات میں
دھند بن کے پھیلتا سمٹتا جا رہا ہوں میں
خدائے لم یزل کی سانس کی طرح
میرے آگے آگے ایک ہجوم ہے
جس کو جو بھی نام دے دیا............وہ ہو گیا
میرے واسطے سے
سب کے سلسلے بندھے ہوئے ہیں
سب کی موت زندگی
میرے واسطے سے ہے (''رستگاری'' قاضی سلیم)

نہ جانے کیا کیا فریب دل کو دیے ہیں اب تک
مگر ابھی نصف شب کٹی ہے
کبھی یہاں ہوں، کبھی وہاں ہوں
اب یہ نغمہ، نہ آنکھ پُرنم
کتاب! آخر کتاب کب تک؟
یہیں پہ سامنے وہ چپ چاپ سو رہی ہے
تمام ماحول ایک سنسان بے دلی، خستگی میں گم ہے
تمہاری تصویر ہنس رہی ہے (''بیوی کے نام'': بلراج کومل)

یہاں میں عمیقؔ حنفی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہوں گا۔ عمیقؔ حنفی بہ یک وقت راشدؔ، میراجیؔ، مختارؔ صدیقی، اخترؔ الایمان، رفیق خاورؔ اور جعفر طاہرؔ سے متاثر تھے۔ ان کے اسالیب اور ہیئتیں کیا ہیں رنگا رنگ تجربات بلکہ تجربوں کا اژدھام ہیں اور ان تجربات کو جو چیز اور زیادہ انوکھا اور منفرد بناتی ہے وہ ان کا لسانی شکست و ریخت کا عمل اور ہر بار نئے لغوی اور تعبیری الفاظ اور شعرات: Allusions کی جستجو ہے۔ وہ ہمارے واحد جدید نظم گو شاعر ہیں جو مختارؔ صدیقی کے بعد مختارؔ صدیقی سے زیادہ آزادیوں کو بروئے کار لائے اور موسیقی ہی کے ''سر اور تال'' ارتعاشات اور حرکات کے سہارے غنا کے بجائے ردّ غنا کے انوکھے تجربے کیے۔ اخترؔ الایمان کے بعد ان کی مثال بیروک یا بیقوارہ Baroque شاعری کی ہے جو اپنے لفظوں سے مصوری کے علاوہ موسیقی سے بھی بخوبی کام لینا جانتا ہے۔ وہی استعجاب انگیز مگر استادانہ فنکاری جو بہ یک وقت کئی حسوں کو بروئے کار لاتی اور Mannarism کا ایک قبائلی تصور عطا کرتی ہے۔ بیقوارہ اسلوب کی بھی پہچان ہے۔ سند باد سے لے کر صلصل الجرس اور بعد کی نظموں تک ان کی ہیئتوں اور ان کے لسانی تجربات میں حیرت انگیز انتشار، الجھاؤ اور تناؤ ہے۔ جو ان کی خلاقانہ صناعی اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت کا بھی مظہر ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جو شفیق فاطمہ شعریٰؔ کے شعری اسلوب کی انفرادیت کا

تعین کرتی ہیں۔

شہر کے آرے چلاتے، بے سُرے، بدرنگ، شوروغل سے دور
پاک رنگوں کا صنم آباد
پاک آوازوں کا اک گندھرولوک
شہروالوں میں ہے جنگل جس کا نام
صبح جس کی ایک ارڑنگ اور البم جس کی شام
وہ لچکتی فصل کے پہلو میں کہنی مار کر کلکاریاں بھرتی ہوا
جھن جھنا اٹھتے ہیں موئے، چم چماتے تار
ٹیپ پر جاتی ہے بل کھاتی ہوئی آواز
چھڑ گئی ہو دور جیسے جل ترنگ
دوڑتی ہے سنسنی ایسی امنگ
جیسے پانی میں ہزاروں مچھلیاں اک ساتھ کودیں اور چادر چیر جائیں
جیسے پکّے کام والی ساڑھیاں لہرائیں، سرسرائیں
کن کنائیں جیسے ہنسوں کے ہجوم
گن گنائیں سرمدی نغمے نجوم ("جنگل": عمیق حنفی)

..........................O..........................

سفینہ در سفینہ درج
مسافتوں کے گیت
انڈیلتے رہے بچشمِ ناصبور
خواب دیکھنے کی تاب
چمن چمن بہ لحن بے ہراس
انکشافِ رازِ عندلیب
اور میں......

ادب مرا سبو......

لحاظ آشنا، سکوتِ کیف

نیاز میری خو......          (''نگاہ آرتی'': شفیق فاطمہ شعریٰ)

..........................O..........................

عمیق حنفی کی مختصر اور طویل نظموں میں ان تجربات کی بھی کمی نہیں ہے جن کے خمیر میں فکر اور فلسفہ رچ بس کر شیر و شکر ہو گیا ہے۔ وحید اختر کی فکر کا کینوس بھی بے حد وسیع اور صلابت آمیز ہے۔ ان کے یہاں راشد اور سردار جعفری کی آزاد اور معریٰ نظم کے اثرات موجِ تہہ نشیں کی طرح گرم کار ہیں۔ وحید اختر کو پابند اور آزاد ہر دو نظم کی تکنیکوں پر مہارت حاصل ہے۔ موجودہ دور میں عمیق حنفی کے بعد غالباً وہی ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں قادر الکلام کہا جا سکتا ہے۔ ان کی پابند نظموں میں بھی ان کا وفورِ علم اور روح کی بے چینی آزادی کی راہ نکال لیتی ہے۔ جس طرح راشد نے جدید انسان کی روحانی تشنہ سری، سراسیمگی اور نارسائیوں کو مسئلہ وجود بنایا تھا اور ان احساسات اور جذبات کو جہاں تہاں ابھرنے سے روکنے کی شعوری کوشش کی تھی جو محض خفیف ترین مہلت زماں کو محیط ہوتے ہیں، وحید اختر کا فکر اور لسان کا شعار بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ وحید اختر جہاں طنزیہ اسالیب کی طرف مائل ہیں وہاں یقیناً ان کی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ اپنی فضا اور سمت کے لحاظ سے یہ شہر آشوب کی شاعری ہے جس میں ''واسوخت'' کا سماں تو ہے مگر گلہ گزاری نہیں، احتجاج تو ہے مفاہمت نہیں اور احتجاج کی یہ لے جو بے حد تیکھی، تحفظ شکن اور کہیں کہیں تلخ کام بھی ہے ان کی عادی فارسی آمیز تلفیظ، جز بہ جز فارسی آمیز کلمہ بندی، اور متواتر اسمائے صفات کے استعمال کے باوجود دیرپا اثر رکھتی ہے۔ احتجاج کی یہی لے جو راشد کے ایران میں اجنبی پر محیط ہے، وحید اختر کی انقلابِ ایران کے سلسلے کی نظموں میں بھی در آئی ہے۔ دونوں کا جائے وقوع ایک ہے دونوں ہی مغرب کی چیرہ دستیوں، منافقتوں، سیاسی بازی گری اور لوٹ کھسوٹ سے نالاں ہیں، سردار جعفری نے پورے ایشیا کو اس چنگل میں پھنسا ہوا دیکھا تھا مگر ان کے طنز میں طعن، تشنیع اور سگ خوئی بھی شامل تھی۔ جب کہ راشد اور وحید اختر کے یہاں فکر کی متانت پوری طرح قائم ہے۔ ماضی اور حال کے سلسلے گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ وہ تاریخ کے گم شدہ اوراق کی بازیافت بھی کرتے ہیں اور اس سارے

خیر وشر کو انسان کی سرشت اور انسان کی ضمیر کے نہاں خانوں سے باہر نکال لاتے ہیں جن سے تاریخ اپنی تشکیل کرتی ہے۔

وحید اختر کے مسائل و موضوعات ہی کچھ ایسے ہیں کہ نظم جہاں سے شروع ہونی چاہیے وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کبھی وہ تمہید باندھتی ہے کبھی فضا خلق کرتی ہے اور کبھی پس منظر مہیا کرتی ہے۔ دیگر شعرأ کی نظموں میں یک لخت شروع ہونے کی صورت بھی کافی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ جو اکثر کہیں سے بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ چیز ہمارے براعِ استہلال یا پیش سایہ افگنی (Foreshadowing) کے تصوّر کے قطعی رد سے عبارت ہے۔

کسی بھی قسم کا وقوعہ جب عین توقع کے مطابق رونما ہوتا ہے تو اس سے قاری کو یقیناً بڑی تشفی اور طمانیت ہوتی ہے مگر قاری اس استعجاب، جادو اور حیرت سے محروم رہ جاتا ہے جو توقع کے رد سے پیدا ہوتی ہے۔ شہریار اور ندا فاضلی کی نظموں میں یہ عمل زیادہ نکھری ہوئی صورت میں واقع ہوا ہے۔ ان شعراء کی نظموں کے اختتام میں بھی نامانوس کاری (Defamiliarity) کی صورت نمایاں ہے۔ انجام بھی چوں کہ تشفی بخش نہیں ہوتے اس لیے قاری یا تو اچانک کسی ذہنی تناؤ کے تجربے سے دوچار ہوتا ہے یا نظم اصلاً اسی آخری نقطے سے شروع ہوتی ہے اور قاری کو اسے اپنے طور پر اپنے ذہن میں مرتب کرنا پڑتا ہے۔ تخلیقی شرکت کی یہ وہ صورت ہے جس سے ہماری قرائتیں اب تک محروم تھیں۔

ہم سب اپنی اپنی لاشیں تو ہم کے کاندھوں پر لادے سست قدم واماندہ
خاک بہ سحر، دامانِ دریدہ، زخمی پیروں سے کانٹوں انگاروں پر چلتے رہتے ہیں
ہم سب ایک بڑے قبرستان کے آوارہ بھوت ہیں
جن کے جسم تو ہاتھ لگانے سے تحلیل خلا میں ہوں
جن کی روحوں کا ظاہر سے ظاہر گوشہ ہاتھ نہ آئے
ہم کو ماضی سے ورثے میں کہنہ قبریں، گرتے ملبے اور آسیب زدہ
کھنڈروں کے ڈھیر ملے ہیں
وہ روشن شب تاب دیے جن سے ماضی کو نور ملا تھا

اس آسیب زدہ ماحول میں یوں جلتے ہیں
جیسے اک پُر ہول بیاباں کے تیرہ سناٹے میں
کچھ بھوتوں نے
رہِ گم کردہ سیّاحوں کو بھٹکانے کی خاطر آگ جلائی ہو
(''کھنڈر، آسیب اور پھول'': وحید اختر)

..............................O..............................

شہریارؔ، محمد علویؔ اور ندؔا فاضلی کا شعری فن ان کی نظم کی داخلی تجرید اور ایجاز میں کھلتا ہے۔ ان شعرا کی نظمیں تلخ وشیریں تاثر پارے ہیں جو زیادہ سے زیادہ کو کم سے کم میں سمیٹ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ تاثر ندؔا فاضلی کی ان نظموں میں بھی قایم ہے جو اپنے موضوع سے پہچانی جاتی ہیں۔ جدید شعرا میں ندؔا فاضلی کی نظم گیت کے کرافٹ سے قریب ہونے کے باوجود ہئیت وتکنیک کا منفرد ترین تجربہ ہیں۔ زبان ان کے یہاں گیلی مٹی کی طرح نرم وملائم بن جاتی ہے حتیٰ کہ ان کی نظموں کی ہئیتیں بھی اسی صفت سے مملو ہیں۔ جس لفظ کو جہاں سے چاہا موڑ دیا، کہیں خفیف اور مہین وقفے چھوڑ دیئے اور کہیں جوں کی توں خالی جگہیں باقی رہنے دیں۔

ندؔا فاضلی انسانی خباثتوں کے نوحہ گر کم، گلہ گزار زیادہ ہیں بلکہ اکثر یہ گلہ گزاری زیرِ لب مگر اثر گیر احتجاج میں بدل گئی ہے۔ جب کہ محمد علوی کی نظمیں ایسے لمحوں میں دبی دبی چیخیں بن جاتی ہیں جو عالمِ سکوت میں سماعتوں کے پردے تک چاک کر دیتی ہیں۔ کبھی ان نظموں کا مخاطب انسان ہوتا ہے کہ وہی حاضر وناظر ہے۔ محمد علوی کو جب انسان سے مایوسی ہوتی ہے تو پھر وہ اس خدا کے حضور پہنچ جاتے ہیں جس پر انہوں نے سوالیہ نشان ثبت کر رکھا ہے۔ علوی نے ان نظموں میں بڑی فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ انسان کی کمینگی، درندگی اور خباثتوں کی مذمت اور ملامت کی ہے جن میں تمثیلی سطح پر حیوانی کرداروں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ ماضیِ قریب میں اس تکنیک کو اخترؔ الایمان نے بھی اپنی بعض طویل نظموں میں برتا ہے جب کہ محمد علوی اختصار کے شاعر ہیں۔ یہ نظمیں اپنے باطن میں فیبل کی طرح اخلاق کے درس پر تو ختم نہیں ہوتیں مگر اخلاق کے بحران سے پیدا ہونے والی اذیت ناک غیر بشری صورتِ حالات کا احساس ضرور دلاتی ہیں۔ علویؔ نے اپنا سفر چھوٹی

چھوٹی قطعہ بند معرّیٰ نظموں سے شروع کیا تھا اور معرّیٰ کا دروبست ان کی ابتدائی مختصر اور مختصر ترین آزاد نظموں میں بھی قائم ہے۔ درمیان میں انہوں نے آزاد نظمیں زیادہ کہیں مگر اب پھر وہ معرّیٰ کی طرف لوٹ آئے ہیں کہ یہی ان کی پرانی روش بھی تھی۔

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
آنسوؤں کی اوس میں نہا کے بھولے بسرے خواب آ گئے
خون کا دباؤ اور کم ہوا
نحیف جسم پر کسی کے ناخنوں کے آڑے ترچھے نقش
جگمگا اٹھے
لبوں پہ لُکنتوں کی برف جم گئی
طویل ہچکیوں کا ایک سلسلہ
فضا میں ہے
لہو کی بو ہوا میں ہے　　　　　　(''اپنی یاد میں'': شہریار)

..................O..................

اَلّھڑ سی لڑکی
شام کی اوڑھنی میں
صبح کے پھول ٹانک رہی ہے
جنگل سے گاؤں کی اور
اُجلی اُجلی
بھیڑیں ہانک رہی ہے　　　　　　(''اَلّھڑ لڑکی'': محمد علوی)

..................O..................

دیواریں
دیواروں جیسی
دروازے دروازوں جیسے

آنگن

کمرے

کھڑکی، چوکھٹ

سب ویسا ہی

کاغذ پر نقشے جیسا ہی

فرق اگر ہے

تو اتنا ہی

دھرتی پر جو گھر بنتا ہے

پتھر مٹی سے بنتا ہے ("فرق اگر ہے تو اتنا ہی": ندا فاضلی)

O

لسانی شکست و ریخت اور نئی لسانی تشکیلات نیز مختلف ترین شعری اور تکنیکی تجربوں کے لحاظ سے عادل منصوری ایک نمایاں دستخط ہیں۔ انہیں مجموعہ اضداد بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ زبان و بیان کی زیادہ سے زیادہ آزادیاں برتتے ہیں اسی لیے ان کی اکثر نظمیں انوکھے لسانی تجربوں سے گزرتی ہیں۔ وہ ایک طرف مذہبی تلمیحات وعقائد سے وابستگی کا دم بھرتے ہیں اور دوسری طرف جنسی علائم، جنسی جذبات اور احساسات کو بھی بلا تامل اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں۔ دراصل لسان اور ہیئت کے تجربوں ہی میں ان کے بہترین تخلیقی شعور کی نمائندگی ہوتی ہے بالخصوص وہ نظمیں جو عمل تجرید کا بڑا عمدہ نمونہ ہیں۔

پلیٹ فارم کی بھیڑ سے

پچھلے جنم کے چہرے والا آدمی

مجھے گھور رہا ہے

گھورتی بھیڑ سے

میرا چہرا ڈھونڈ رہا ہے

یا

پلیٹ فارم کے چہرے میں
پچھلے جنم کی بھیڑ کو
مَیں گھور رہا ہوں

"نظم": عادل منصوری ـــــــــــــــــــــــــــــــ

موجودہ عہد کے معاشرتی انتشار، روحانی بحران اور اضطراب اور ایک مستقل نا آسودگی کے احساس نے ماضی کی طرف مراجعت پر مہمیز کی ہے۔ ماضی کی طرف لوٹنے کی ایک صورت تو وہ ہے جو عقیدے کی بازیافت کی شکل میں عادل منصوری کی نظموں میں ملتی ہے مگر وہ خود اس رجحان کی توسیع نہیں کر سکے۔ دوسری صورت ان متروک اسالیب و آثار کی جستجو سے عبارت ہے جو تقریباً فراموش کردہ ہیں۔ فاروقی کی بعض نظمیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ اس طرح بعض شعرا نے ماضی کے عطیات کو نئے معنی دیئے ہیں۔ یہ روش ایک عظیم اخلاقی بحران سے پیدا ہونے والے خلاء کو پر کرنے سے مماثل ہے۔ کمار پاشی نے جب ہندی اساطیر سے تخلیقی رشتہ قائم کیا تو اس کا اثر ان کے وژن پر بھی پڑا۔ یہ وژن ان کی نسبتاً مختصر نظموں کے علاوہ "ولاس یاترا" جیسی طویل نظم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے مگر اپنی نظموں میں وہ جس قدر رواں اور تخلیقی زبان پر قادر ہیں، ولاس یاترا میں وہ محض بیان پر اتر آئے ہیں۔ زبان میں بھی اُکھڑا اُکھڑا پن ہے۔ فسادات پر لکھی ہوئی نظموں میں کمار پاشی کی شعری تکنیک نہایت سلیس اور بے پیچ ہے۔

آسماں کی وسعتوں میں
میری نظریں
ڈھونڈتی ہیں، اس حسیں ماضی کو، جس کی
یاد کے سائے بھی گھلتے جا رہے ہیں اب ہوا میں
اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو رہے ہیں لمحہ لمحہ
میں پرانا سا کوئی انسان ہوں، محسوس یہ ہوتا ہے مجھ کو
میں نے ہر ساون میں دھویا ہے بدن کو
اور یہ دھرتی مجھے روزِ ازل سے جانتی ہے

یاد ہے وہ دن مجھے اچھی طرح سے
کھولتے، چنگھاڑتے لاوے کے بے پایاں سمندر سے اُچھل کر
ہم اکٹھے ہی گرے تھے
اور صدیوں بعد ہوش آیا، کھلی جب آنکھ میری
مَیں نے دیکھا:
مَیں تو صدیوں پہلے پیدا ہو چکا تھا (''جنم دن'': کمار پاشی)

O

اسطورسازی کی دوسری مثال زبیر رضوی کے یہاں دکھائی دیتی ہے کمار پاشی نے وقت کو تسلسل میں دیکھا ہے۔ زبیر رضوی کے تخلیقی سفر میں ان کی رومانی اور گیت آمیز شاعری پہلے مرحلے پر ہے دوسرے پر مدنی یعنی جدید حسیت آمیز شاعری اور تیسرے مرحلے پر رومانیت کا وہ عنصر نمو پاتا ہے جو ماضی کے اجنبی کروں کا متلاشی ہے۔ دراصل وہ نظمیں جن میں مدنی شعور اور مدنی تجربات کا رنگ گہرا ہے ان میں آزاد و معرّیٰ کی تکنیک نمایاں ہے۔ ان نظموں کی لسانی فضا کی تشکیل بھی ان الفاظ واشیاء سے ہوئی ہے جن کا تعلق شہری زندگی کی تہذیب اور رشتوں کے نئے پیچ وخم سے ہے۔ یہ نظمیں انتہائی مانوس ہیں اور انسانی مخلص جذبوں کو لبِ گفتار عطا کرنے کے باعث ہمارے دلوں کو چھو لیتی ہیں۔ زبیر رضوی کا شعری تجربہ ''علی بن متقی رویا'' کے سلسلے کی نظموں میں چونکانے والا ہے۔ یوں تو زبیر اپنی ہر صورت میں سلیس اور محتاط کلام کے عادی ہیں۔ ان کو بیش از بیش معرّیٰ یا معرّیٰ جیسی آزاد نظم یا صاف ستھری بے عیب آزاد نظم کی تکنیک ہی مرغوب تھی۔ علی بن متقی رویا میں وہ نہ صرف اظہار کی نئی تکنیک کی طرف مائل ہوئے ہیں بلکہ اپنے حافظے سے ان لسانی پیرایوں کو بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لائے ہیں جو وقت کے گرد وغبار کی تہوں میں دب گئے تھے یا کھو گئے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے کی اپنی ہر نظم پرانی بات ہی سے شروع کی ہے اور ہر نظم ایک لازمی انجام تک پہنچتی ہے۔ ہماری قدیم حکایتیں، اکثر لوک کتھائیں اور بیش تر الف لیلوی قصے بھی اسی طرح شروع ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے یا انگریزی میں once upon a time وغیرہ وغیرہ۔ زبیر نے اپنے روایتی محتاط رویے کے مطابق یہاں بھی نظم کو بہت زیادہ پھیلنے

نہیں دیا ہے اور نہ ہی لسانی پینترے بازی یا لسانی زور آزمائی کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ کیوں کہ نظم وہ نہیں ہے جو خارجی ہئیت سے آشکار ہے وہ تو ساری کی ساری اس کے باطن میں پھیلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے بلکہ بیش تر صورتوں میں نظم، نظم کے اختتام سے شروع ہوتی ہے کہ نظم کا لازمی انجام ہی اس کا ابتدائیہ بھی ہے۔

مخمور سعیدی کو اساساً غزل کا شاعر کہا جاتا ہے۔ مخمور کی غزل کی پہچان بھی غزل کا وہ شعور ہے جس کی ترجیح غزل کے روایتی ڈھانچے پر اصولاً کاربند رہنے پر ہوتی ہے لیکن مخمور کو غزل کے عمومی استعاروں اور لفظی خوشوں کی تکرار سے کم سے کم نسبت ہے۔ مخمور کی غزل مخمور کے ذہنی و وجدانی تجربے کا نام ہے اور یہی وہ صفت ہے جو ان کی نظموں کا بھی شعار بنی ہے۔ اتنا ہی نہیں اپنے لفظیات میں مخمور کی غزل اور نظم میں مجھے اس قسم کی دوئی بھی نظر نہیں آتی جو اکثر شعراء کے یہاں دولختی کا موجب بن جاتی ہے۔ مخمور نے اپنے مدنی شعور اور وسیع تر اخلاقی اختلال کے تجربے کو جس زبان میں ادا کیا ہے وہی میرے نزدیک اس عہد کی نظم کی مثالی زبان کا درجہ بھی رکھتی ہے۔

بچھڑ کر تجھ سے\
کس اندھی ڈگر پر چل پڑے ہم\
ہماری گم رہی پر\
ہمارے روز و شب سے\
ستارے، چاند، سورج، سب خفا ہیں\
دھوئیں کے بادلوں نے\
ان آنکھوں کی بصارت چھین لی ہے\
یہ دل، اک گنبدِ بے در کہ جس میں\
کہیں سے روشنی آتی نہیں ہے\
گزرتی صبح، ڈھلتی شام، گہراتی ہوئی شب\
کوئی منظر، نظر کے سامنے لاتی نہیں اب        (''اندھا سفر'': مخمور سعیدی)

1908ء کے بعد نثری نظم کی ہئیت کو وسیع تر قبولیت ملی۔ زبیر رضوی کے علاوہ بلراج کومل

اور شہر یار کی کئی نظمیں اسی تجربے کی حامل ہیں۔ صحیح تو یہ ہے کہ ان شعرأ کے یہاں نثری نظم کی ہئیت شعری تجربہ نہیں بن سکی۔ 80-1970 کے بعد جن شعراء نے اپنی انفرادیت کی طرف توجہ دلائی ان میں صلاح الدین پرویزؔ، علی ظہیرؔ، حمید الماسؔ، عبدالاحد سازؔ، شاہد کلیم، زاہدہ زیدیؔ، شمس الرحمٰن فاروقیؔ اور صادق کے نام نمایاں ہیں۔ صادق نے بہ یک وقت مختصر اور طویل نظمیں کہی ہیں۔ یہ نثری بھی ہیں اور آزاد بھی۔ ان کی رومانی نظموں میں داخلی سوگواری، روحانی بے چینی اور جنسی نا آسودگی جیسے جذبات کے اظہار کی صورت نمایاں ہے اور ان میں ادائیگی کی زبان بھی بڑی حساس اور سکوت آمیز ہے۔ دستخط اور سلسلہ کی نظموں میں ہندی آمیز لفظیات کی فراوانی تھی۔ مگر یہ صورت بھی ان نظموں ہی میں موجود ہے جو برافروختگی، غصہ وری اور احتجاج سے مملو ہیں۔ مجذوب جیسی نظم میں متصوفانہ سریّت موجِ تہہ نشیں کے طور پر کارفرما ہے اسی سلسلے کی بہت سی نظموں میں آہنگ بلند ہوگیا ہے اور لہجے میں خطابت شامل ہوگئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقیؔ، صلاح الدین پرویزؔ، زاہدہ زیدیؔ، بلقیسؔ ظفیر الحسن، ستیہ پال آنندؔ، ش۔ ک۔ نظامؔ، گلزارؔ اور عنبرؔ بہرائچی کا کلام خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ یہ اور ان کے علاوہ بھی چند نام ہیں شریف ارشدؔ، عین تابشؔ، رفیعہ شبنم عابدیؔ، ع۔ رشیدؔ، خلیل مامونؔ، عبدالرحمٰن طارقؔ اور شہنازؔ نبی وغیرہ۔ ان کے کلام میں لسانی، ہیئتی اور تکنیکی سطح پر بڑی تازہ کاری ہے۔ وہ لسانی اور ہیئتی تجربات جو عمیق حنفی کی نظموں کو توانگر اور ذخّار بنا دیتے ہیں۔ عمیق حنفی کے بعد صرف اور صرف صلاح الدین پرویز کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ انہیں موجودہ عہد کا عادل منصوری بھی کہا جا سکتا ہے وہ عادل منصوریؔ جس کا تخلیقی سفر منقطع نہیں ہوا تھا بلکہ جاری ہے۔ ان نظموں کی فضا اسلامی تہذیبی اسالیب، مشعرات، علائم اور نت نئے لسانی مرکبات سے مشکل ہوئی ہے اور جو اپنے وسیع معنی میں رومانی اور سرّی ہیں۔ صلاح الدین پرویزؔ نے معرّیٰ، آزاد، پابند اور گیتوں کی تکنیکوں کے انضمام سے اپنی نظموں کو نئی صورت عطا کی ہے اور اپنی اس صورت میں وہ یقیناً سب سے علاحدہ اور مختلف ہیں۔

میں عہد کرتا ہوں:
میں الحمراء نہیں بناؤں گا

سرخ اینٹوں والا
جہاں حبشی غلاموں کو، آنکھوں میں سلائیاں پھیر کے
رباب بجانے پر مامور کیا جاتا تھا
ان کے نغموں سے تالاب کا رنگ نیلے سے لال ہو جاتا تھا
میں عہد کرتا ہوں:
میں بناؤں گا تیرے لیے ایک گھر
جس کے آنگن میں سیڑھیاں ہوں گی
میں بعدِ نمازِ مغرب، سیڑھیاں چڑھ کے چھت پہ آؤں گا
دیکھنے کے لیے تجھے آسمان پر۔۔۔۔ پکاروں گا زور زور سے
ماہِ اندلس! ماہِ اندلس
آہ میری آنکھوں کو تو تو نظر نہیں آئے گی
لیکن ہواؤں میں اڑتے ہوئے ایک پیس اکورڈ کے چند ٹکڑے
میرے ہاتھوں میں ضرور آجائیں گے

("ماہِ اندلس": محمد صلاح الدین پرویز)

.......................O.......................

چھٹے اور ساتویں دہے میں نظم گو شعرأ کا سیلاب سا اُمڈ پڑا تھا اب اس میں خاصی کمی سی واقع ہوگئی ہے۔ اس تعداد کو خاصی بھی کہا جا سکتا ہے مگر ان میں بڑی تعمیم اور تکرار ہے۔ یہ بھی شاید صحیح ہو کہ نظم میں اپنی انفرادیت قائم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے بیش تر شعرا غزل گوئی کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ اور نظم گو شعرا کے مقابلے میں اکثر غزل گو شعرا اپنی انفرادیت بھی منوا چکے ہیں۔ ان حالات میں ان نظم گو شعرا کا دم غنیمت ہے۔ جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اور جن میں صلاح الدین پرویز اور گلزار تک کئی تجربہ پسند شعرا کے نام آتے ہیں۔

☆☆

☆..........غلام نبی خیالؔ

# گزشتہ صدی کی اردو صحافت اور کشمیریات

سرزمینِ کشمیر کے بارے میں جو تفصیلی اور وضاحتی تصانیف، سفر نامے، سماجی حالات اور دیگر توضیحی کوائف آج ہمارے پاس ضخیم تصانیف اور معتبر جرائد کی شکل میں موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ حصہ مغربی مستشرقین اور برصغیر کے اخبارات ورسائل نے ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں مغلوں کے حوالے سے شہنشاہ اورنگ زیب کے ہم سفر سر فرانکوئس برنیر اور اس کے بعد سینکڑوں مورخ، ماہر آثار قدیمہ، تحقیق وتلاش کے دیوانے کشمیر آ کر یہاں سالہا سال تک قیام پذیر ہوئے اور انھوں نے وقت کا برمحل استعمال کرتے ہوئے اس خطہ فردوسِ بریں کے مختلف پہلوؤں پر خامہ فرسائی کر کے تاریخ اور سفرناموں کے ذریعے اپنے تاثرات وخیالات کے بیش بہا خزینے ہمارے لیے محفوظ کر کے چھوڑ دئے۔ برصغیر کے اخبارات وجرائد میں سفیرِ ہند امرتسر، دکن پنچ حیدر آباد، سرمور گزٹ ناہن، چودھوی صدی راولپنڈی، پنجابی اخبار، الوقت گورکھپور اور کئی اور رسائل قابل ذکر ہیں جن کے نسخے بدقسمتی سے آج موجود نہیں۔

مرحوم ڈاکٹر اکبر حیدری نے ان میں سے چند مجلوں کے عکس حاصل کر کے پاکستان کی انجمن ترقی اردو کو بھیج دئے اور پھر انجمن نے ان میں سے نصف درجن رسالے ''اردو'' نام کے اپنے سہ ماہی جریدے میں شیرازہ بند کیے۔ لیکن ان میں کشمیر کے حوالے سے جو نگارشات اور اطلاعات مندرج ہیں، اگر حیدری صاحب نے اپنے قلم کا استعمال کرتے ہوئے ان کا تفصیلی جائزہ

لیا ہوتا تو اُس دور کی کشمیر کی تصویر نظروں کے سامنے آسکتی تھی۔

انیسوی صدی میں برصغیر میں اگر چہ اردو اخباروں کی تعداد بہت ہی کم تھی لیکن ان میں بھی وقتاً فوقتاً کشمیری عوام کی زبوں حالی اور استبداد کے پنجے تلے دب کر ان کی بے بسی کا حال زیر تذکرہ لایا گیا ہے۔ اگر چہ اس حوالے سے کوئی مدلل اور تفصیلی اداریہ یا شذرہ ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ مدیران نے یا تو مختصر سی خبر بنائی ہے یا اسے کسی حد تک وضاحت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

البتہ یہ اتفاق قابل توجہ ہے کی ان سبھی اخباروں کی اشاعت مہاراجہ پرتاپ سنگھ (1848-1925) کے دور میں ہی ہوئی اور اسی حکمران کے وقتِ شاہی مین کشمیر کے حالات کو بہت شہرت ملی۔ ڈوگرہ حکمرانی کے بانی گلاب سنگھ نے تو اپنے مخالفوں کے ساتھ اس قدر ظالمانہ سلوک روا رکھا کہ وہ حریفوں کو پکڑوا کر برسرِ عام ان کی کھال کھنچواتا تھا اور یہ نظارہ دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔ پرتاپ سنگھ اس حد تک ظالم اور جابر نہیں تھا لیکن اس کی توہم پرستی نے اسے زیادہ تر اپنے ہی محل کا قیدی بنا دیا تھا۔ پرتاپ سنگھ کے دور میں کئی اصلاحی کام بھی ہوئے جن میں کوہالہ سے بارہ مولہ تک کی جہلم ویلی سڑک خاص طور قابل ذکر ہے۔ اس نے کشمیر کا رابطہ گلگت اور لیہہ کے ساتھ قائم کیا اور اسی کے دورِ حکومت میں کشمیر میں زرعی زمین کی شیرازہ بندی عمل میں لائی گئی۔ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں کئی مغربی تاریخ دان اور اصحابِ قلم کشمیر آئے اور اپنے تاثرات کتابوں میں محفوظ کیے۔ ان میں خاص طور پر برصغیر کے مختلف علاقوں سے جن اخباروں اور جرائد میں ذکرِ کشمیر ہوتا رہا ان کی تعداد تو بہت زیادہ ہوگی لیکن ان میں سے چند ایک سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے۔

افغانوں اور سکھوں کے بعض ڈوگرہ حکام نے ریاستی عوام پر ظلم وستم کے جو پہاڑ ڈھائے ان کی تفصیل بہت طولانی ہے۔ 1837ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جموں کے گلاب سنگھ کو یہ کام تفویض کیا کہ وہ یوسف زئی قبیلے کی بغاوت کا سر کچلے۔ اس نے ہر پشتون کے سر کے لیے گلاب سنگھ کو ایک ایک روپے کی پیش کش کی۔ رنجیت سنگھ نے کئی عورتوں کی جان بخشی کی۔ باقی کو گلاب سنگھ کے حرم میں بھیج دیا گیا اور باقی ماندہ لاہور اور جموں میں کنیزوں کی طرح سرِ عام فروخت کی گئیں۔

1863ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ (1830-1885) نے سرحدی علاقوں یاسین اور ہونزہ پر

فوج کشی کی تا کہ باغیوں کو سبق سکھایا جائے۔ تمام مردوں کو قیدی بنایا گیا اور مندوری پہاڑی کے عقب میں یا سینی اور ہونزہ کی خواتین اور ان کے بچوں کو زخمی کیے جانے کے بعد زندہ جلایا گیا اور تقریباً دو ہزار یاسینی دیہاتی تہہ تیغ کیے گئے۔ لگ بھگ چھ ہزار یاسینیوں کو سری نگر بیگار کے لئے لے جایا گیا اور ان کی عورتوں کو ڈوگرہ سپاہیوں کے حرموں میں بھیج دیا گیا۔ اسی رنبیر سنگھ کے دور حکومت کے بارے میں ''پنجابی اخبار'' (1856ء) کی بات کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار بالآخر کشمیر کے مداحوں میں شامل ہو گیا۔ اس سے قبل اس کا ایک شذرہ یوں ہے:

''کوئی کشمیری ایسا نہیں جو گورنمنٹ کو یہ کہے کہ مہاراجہ صاحب سے ملک چھین لیا جائے اور بالفرض اگر گورنمنٹ کو درحالت اشد ضرورت ایسا ہی کرنا قرین مصلحت ہو کہ مہاراجہ صاحب سے ملک لے لیا جائے کہ وہ عدل و انصاف نہیں کر سکتے تو کوئی بدعہدی کا اس پر جرم نہیں ہے۔ گورنمنٹ کو خداوند کریم اور احکم الحاکمین کے سامنے ذمے داری ان لاکھوں روحوں کی ہے جو تعدی اٹھا رہی ہیں۔ حضرت سلامت مہاراج صاحب کا یہ فرض نہیں ہے کہ جو کوئی کوٹ پتلون پہن کر ان کی قلم رو میں جائے، آسمان پر چڑھا دیا جائے جو وہ چاہے سو کرے۔ یہ بات تو آداب سلطنت سے بعید ہے۔ ہاں، اگر ہمارے معزز عہدہ داروں میں سے کوئی جائے تو معمولی اور باضابطہ مہمان داری مضائقہ ندارد، نہ کہ اس طور پر کہ دین و دنیا کی کچھ خبر نہ رہے۔ انگریز کیا آیا، ریاست میں گویا خدا آیا۔ قطع نظر اس کے اگر شامت اعمال سے مہاراجہ صاحب ملک کا روپیہ اسی طور بے جا صرف میں لانا ہی چاہتے ہیں۔ صرف اپنے ذاتی سلوک کے واسطے تو کریں۔ حوالہ بخدا۔ لیکن غریب رعایا نے کیا قصور کیا ہے کہ ان پر ظلم روا رکھا جاتا ہے یعنی کسی کو چابک مارے جاتے ہیں اور کسی کو ڈنڈے یا قلیل مزدوری پر انگریزوں کا کام ان سے لیا جاتا ہے۔ فرمایئے تو سہی، اس کے لیے کوئی انتظام مہاراجہ صاحب نے فرمایا ہے اور یہ امر داخلِ بدانتظامی ہے یا نہیں؟''

''سفیرِ ہند'' امرتسر سے جنوری 1880ء میں ابوسعید مولوی محمد حسین کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس کی 10 جولائی کی اشاعت میں ایک قاری نے کشمیر ہی کے حوالے یہ مراسلہ مدیر کو بھیجا جسے مولوی حسین نے من وعن شائع کیا۔ اس خط کا خلاصہ یہ ہے جو اس دور کے نظامِ کشمیر پر کسی حد تک روشنی ڈالتا ہے:

شہید عادتِ خویشم، ورا نمی بینم
کہ ما تمام فغانیم و یار پنبہ بگوش

پیارے ایڈیٹر (پنجابی اخبار)! اگر مجھے افسوس ہے تو اس امر کا ہے کہ میں نے یہاں کی متعصب کارروائی کی بنا پر آپ کے اخبار کے کالموں کے کالم سیاہ کر ڈالے مگر ریاست کے کانوں پر انصاف پسندی کی جوں تک نہ ہلی۔ بلکہ نتیجہ برعکس ہمارے ظہور میں آیا ہے۔ سچ ہے:

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہر درویش بر جانِ درویش

اس مہاراجہ کے دور میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہر شعبے میں جو امتیازی سلوک روا رکھا گیا اس کی طرف بھی اس مراسلے میں نشان دہی کی گئی ہے:

''یعنی اس ہماری پر درد نالہ وزاری پر ریاست نے آگے سے زیادہ شیر ہو کر ایسے تعصب کے قہقہے اڑائے کہ باید وشاید۔ بلکہ اگر سچ پوچھو تو درّانی سلطنت کا انتقام لیا۔ خیر ہوا سو ہوا۔ مگر ہم کو بھی قسم ہے اپنی سچی شرم اور ہٹ کی جب تک ہماری آہ جگر سوز آسمان شگاف کچھ اثر نہ دکھلائے گی تب تک ہم بھی باز نہ آئیں گے۔ بقولے کہ:

کنگرۂ وصل او گر چہ نہ دارد کمند
نالۂ شب گیر را تار رسیدن دہم

پر ہم کو پورا پورا عمل درآمد ہے اور نالۂ شب گیر و آہ جگر سوز بھی کیسا، جیسا کہ اس بڑھیا کے حق میں کہا گیا ہے:

نیم شبے آہ زند پیرِ زال

دولتِ صد سالہ کند پائمال

مختصراً اگر اس تمہید کو قائم کرنے سے کوئی خوشامدی سنگھ بہادر وہی پرانے سے پرانا جواب نذر کریں گے یعنی اہل اسلام کا فقط قحط میں کام آنا، پنڈتوں کا آرام پانا، معبدوں کے لیے بجبر وتعدی ہزار ہا روپیہ وصول کرنا اور وہ روپے صرف اپنے ہی معبدوں پر خرچ کرنا، شاہی مسجدوں، خانقاہوں کو ذخیرۂ بارود وغلہ بھر بھر کر ویران کرنا، سوداگروں سے فی صد پچاس روپے محصول لینا تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟ خیر! یہ تو پرانا قصہ ہے۔ ایک اور نو ایجاد ستم سنئے کہ حضرات پنڈتوں نے سری مہاراج صاحب بہادر کے دل پر یہ نقش جمایا ہے کہ یہ رعایائے کشمیر حضور کے خیر خواہ نہیں۔

ناظرین کو یہ بھی ملحوظ رہے کہ ملک کشمیر چھتیس پرگنوں پر منقسم ہے۔ چناں چہ کسی کشمیری شاعر کا قول ہے کہ:

سوختیم و سوزشِ ما برکسے ظاہر نہ شد
چوں چراغانِ شبِ مہتاب بے جا سوختیم (:-راقم از سرینگر کشمیر)

''پنجابی اخبار'' کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے بعد میں یا تو پیسے کے لالچ میں یا سرکار کے رعب کے نتیجے میں دشمن پالیسی اختیار کی اور اخبار کو حکومتِ وقت کی تعریف وتوصیف کے لیے وقف کیا گیا۔ اس کے بعد اس کی اشاعت میں بہت کمی واقع ہوئی۔

''دکن پنچ'' 1887ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا اور اس نے بھی وقت وقت پر کشمیر کے حالِ زار پر ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ کشمیر کے تعلق سے اگر چہ اس کے مالک پر کئی بار کشمیر کے دربار سے دھمکیاں بھی جاری کی گئیں مگر اس نے ہار نہ مانی اور اپنے قلم کو حق بیانی کے لیے وقف رکھا۔

17 جولائی 1889ء کی اشاعت میں اس نے ''کشمیر کے بارے میں انکشاف'' کے عنوان سے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے خلاف ایک انگریز اہل کار سر لیپل کا یہ زوردار شذرہ تحریر کیا:

''یہ شخص ہرگز اس لائق نہیں تھا کہ اس کو مسند نشین کیا جائے۔ اس شخص کے والد مجھ سے کہتے تھے کہ مجھ کو امید نہیں کہ میرے بڑے فرزند کا

چال وچلن کبھی درست ہو سکے۔ اس شخص کے دادا نے جموں کی ریاست کو قائم کیا تھا۔ یہ شخص ریاست کو کھو بیٹھے گا۔ یہ شخص بالکل عقل کا پتلا اور اپنے نوکروں کے ہاتھ میں ہے اور بدروش لوگ اس کے گرد جمع ہیں۔ یہ شخص اپنے جذبات کا غلام ہے اور بڑا وہمی اور خیالی آدمی۔ اس شخص نے ایسی بد روشیاں کی ہیں کہ اس سبب سے اس کو در حقیقت مسند سے اتار دیا گیا ہے اور ریزیڈنٹ اس کونسل کا کارفرما ہے۔ میری اس شخص کے والد سے ملاقات تھی۔ انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ میرے والد نے جموں کی ریاست قائم کی تھی، میرا بیٹا اس کو کھو دے گا۔ وہ پیشین گوئی پوری ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ بڑے ظالم تھے مگر انھوں نے اپنا وعدہ ہمارے ساتھ وفا کیا اور عمر بھر ہمارے دوست رہے اور انھوں نے بغاوت کے زمانے میں ہماری مدد کی۔ تیسرے مہاراجہ بڑے عیاش ہیں۔ جو خاندان شاہی کی دغا اور خون ریزی سے قائم رہے۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ خاندان اسی رسوائی کے ساتھ غارت ہو جائے جس طرح کہ اٹلی کا بور جیا والا خاندان غارت ہو گیا''۔

ان اخباروں کے مطالعے سے یہ حیران کن امر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخصی راج کے ظلم و استبداد کے باوجود سچ بات کہنے سے کبھی پیچھے نہیں رہے۔ آج کل اگر چہ کئی ممالک میں آمریت کی جگہ جمہوریت نے لی ہے لیکن ذرائع ابلاغ میں ایسی حق گوئی اور بے باکی شاذ و نادر ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ مندرجہ بالا تحریریں اس کی واضح مثالیں ہیں۔

منشی سراج الدین احمد، علامہ اقبال کے گہرے دوست تھے۔ وہ کئی سال تک سری نگر کشمیر میں ریزیڈنسی میں میر منشی رہے۔ ادب کے ساتھ ان کا گہرا لگاؤ تھا اور وہ ادبی اور اور دیگر موضوعات پر علامہ سے متواتر طور پر خط و کتابت کے ذریعے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

منشی صاحب نے اخبار ''چودھوی صدی'' راولپنڈی سے شائع کیا لیکن یہ کچھ عرصہ بعد ہی بند ہوا اور پھر اسے ایک ماہنامے کی صورت میں منظر عام پر لایا گیا۔ اکبر حیدری لکھتے ہیں:

''اخبار میں اچھی اور معیاری کتابوں اور نئے اخبارات پر تبصرے شائع ہوتے تھے۔ ایڈیٹوریل زیادہ تر کشمیریوں سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ 1885ء میں کشمیر کے حکمران ہوئے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ انتظامیہ کے

لیے ریاستی کونسل تشکیل دی اس میں کسی مسلمان ممبر کو شامل نہیں کیا گیا۔ اکثریت کے باوجود مسلمانوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ ان کے حقوق پامال کیے جاتے تھے اور وہ زیادتیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ''چودھوی صدی'' نے ان کی دبی ہوئی آواز کو بلند اور انتظامیہ، خاص کر سورج مل کے سخت گیر روئے کو تشت از بام کیا۔ اخبار افسر شاہی کے مظالم کی پرزور مذمت کرتا تھا اور اپنے اداریوں میں کشمیریوں کے حقوق کی ترجمانی زور و شور سے کرتا تھا۔ غرض یہ کہ اخبار ''چودھوی صدی'' ادبیات کے علاوہ تاریخِ کشمیر کے ایک گم شدہ باب کے عینی مشاہدے کی دستاویز بھی پیدا کرتا ہے۔

اسی اخبار کی 8 جون 1895ء کی اشاعت میں ''کشمیر کے مسلمانو! تمہارا خدا حافظ'' کے عنوان تلے یہ شذرہ قلم بند ہے:

> ''جو واقعات سال گزشتہ میں ریاست کشمیر میں گذرے ہیں، ان کی کیفیت اگر مفصل بیان کی جائے تو کوئی شخص، سوائے ایسے چند لوگوں کے جن کو ایسا ہی سر اور دماغ قدرت نے عطا کیا جیسا کہ کرنل بار صاحب سابق ریذیڈنٹ کشمیر کو دیا گیا تھا، یقین نہ کرے گا کہ اس انیسوی صدی کے آخر میں، جب کہ انصاف اور نیکی اور تہذیب کے مدعی ہمارے ملک پر حکومت کر رہے ہیں، ایسے واقعات گذر سکتے ہیں۔''

کرنل بار نے کشمیر کا ریزیڈنٹ ہونے کے زمانے میں کوئی بھی ایسا کام یا فیصلہ کیا ہو جس میں وہ غلطی یا غلط کاری سے بچا رہا ہو۔ اس کے زمانے کا امتیاز یہی ہے کہ تمام ناممکن باتیں اس عہد میں ممکن تھیں۔ افسوس ہے کہ کرنل بار میں سوائے اس کے کوئی فضیلت نہیں تھی کہ وہ فاتح قوم میں سے تھا۔ انگلستان کی زمین پر پیدا ہوا تھا اور اس کے چمڑے کا رنگ سفید تھا۔ ایسا شخص ریاست کشمیر میں انگریزی سلطنت کا نائب تھا اور ریاست کشمیر پر حکمران بنایا گیا کیونکہ کونسل ریاست پر حکومت کرتی ہے اور کونسل پر ریذیڈنٹ حکومت کرتا ہے۔ اس کی بے شمار غلط کاریوں نے کشمیر کونسل کے مسلمان ممبر کو آخر کار مجبور کر دیا کہ وہ کونسل کی ممبری سے دست بردار ہو کر اپنے عہدے پر واپس آجائے۔

سر کنم شکوہ اگر تابِ شنیدن داری

سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

اخبار کے اسی شمارے میں مدیر نے 1893ء کے اعداد و شمار کے مطابق مختلف مذاہب ماننے والوں کا کشمیر کی آبادی میں تناسب کا یہ نقشہ پیش کیا ہے:

| علاقہ | ہندو | مسلمان |
|---|---|---|
| صوبہ جموں | 631225 | 797459 |
| صوبہ کشمیر | 68316 | 883099 |
| لداخ | 182 | 2991 |
| اسکردو | 64 | 110022 |
| گلگت | 13 | 139 |
| میزان: | 699800 | 1793710 |

............ ............ ............

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| صوبہ جموں | ہندو | :631225 | مسلمان | : 797459 |
| صوبہ کشمیر | ہندو | : 68316 | مسلمان | : 883099 |
| لداخ | ہندو | : 182 | مسلمان | : 2991 |
| اسکردو | ہندو | : 64 | مسلمان | : 110022 |
| گلگت | ہندو | : 13 | مسلمان | : 139 |
| میزان: | ہندو | : 699800 | مسلمان | : 1793710 |

سرکار کی طرف سے کشمیر اور جموں میں مسلمانوں کی آبادی کی رپورٹ مفید عام پریس، لاہور میں طبع کی گئی۔ یہ اعداد و شمار فراہم کرنے کے بعد اخبار لکھتا ہے کہ صوبہ جموں میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے قریب پونے دو لاکھ سے زیادہ ہے اور کشمیر میں تو نو لاکھ مسلمانوں کی تعداد میں ہندوؤں کی ساٹھ ہزار تعداد آٹے میں نمک ہے۔ ریاستِ کشمیر کے اٹھارہ لاکھ مسلمانوں کو بے پناہ اور ان کے حقوق کو ایک ہندو کونسل کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا ہے۔ ایک مسلمان ممبران کو دینے سے بھی دریغ ہے اور اس تمام زمانے میں نہایت خاموشی سے سینکڑوں مسلمانوں کو ظلم کا شکار

ہوتے دیکھا ہے اور آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ ان پر کیا گذری ہے۔

23 جولائی 1895ء کی اشاعت میں صفحہ اوّل پر یہ عبارت درج ہے:

''ہمارے آج کے اخبار کا بڑا حصہ ریاستِ کشمیر کے مسلمانوں نے لے لیا ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی حالت نہایت قابل رحم اور دردناک ہوگئی ہے اور تمام مسلمانوں کا، جو انگریزی سلطنت کے پر امن سائے میں رہتے ہیں، بہ لحاظ اسلامی اخوت کے فرض ہے کہ اپنے برادرانِ کشمیر کی ہم دردی کریں۔ پس ہمارے دوست ہم کو معاف کریں گے اور کشمیر کے مسلمانوں کے حال کو دلچسپی سے پڑھ کر ان مصیبت زدوں کے حالِ زار پر آٹھ آٹھ آنسو بہا کر خداوند کریم سے ان کی بھلائی اور اس مصیبت سے نجات پانے کے واسطے دعا کریں:

یوں ہی گر روتے رہے ہم سب تو اے اسلامیاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

کشمیر کے ایک نام نہاد پنڈت مورخ گواشہ لال کول کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ اس نے اخبار ٹریبیون میں علامہ محمد اقبالؔ پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف کشمیری مسلمانوں کو جدوجہد پر اکسایا تھا۔ اس شرآمیز خبر کی سارے لاہور کی صحافتی دنیا نے مذمت کی اور گواشہ لال کو ایک مفسد صحافی قرار دیا۔ چودھویں صدی اخبار اپنی مندرجہ صدر اشاعت میں اسی گواشہ لال کی ایک اور خود ساختہ خبر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''ٹائمز میں جو مضمون کشمیر پر چھپا ہے اور جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان پر کس قدر سخت ظلم ہوتے ہیں اس کا بے تکا جواب دیتے ہوئے ٹریبیون لکھتا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ صاحب کے وقت میں جو کشتیوں میں آدمی بھر کر ڈبو دینے کا الزام لگایا گیا تھا وہ کسی مایوس شدہ آوارہ گرد پنجابی مسلمان نے اپنی قوم کی عادت کے مطابق لگایا تھا۔ بلاشبہ پنجابی مسلمان شرافت اور نجابت میں بنگالیوں کو نہیں پہنچ سکتے مگر کشمیر میں جس شخص نے اس واقعے کی مخبری کی تھی وہ ایک کشمیری پنڈت صاحب تھے جو بنگالیوں کا ایک دوسرا نام ہے۔ یہی صاحب اس قصور میں کشمیر سے خارج کیے گئے تھے۔ بعد ازاں ان کو وطن میں آنے کی اجازت دی گئی۔ اب تک زندہ موجود ہے۔ کچہری میں وکالت کرتے ہیں۔ ان کا نام بھی کسی سے چھپا ہوا نہیں۔

اسی شمارے میں ایک طویل اداریہ تحریر ہے جس کا عنوان ہے ''گورنمنٹ کو کیا کرنا چاہئے؟ مسلمانانِ کشمیر کی حق تلفی کا اصلی سبب''

لکھتے رہے جنوں میں حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اس طویل اداریے کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کا ضرور باعث ہوگا:

''کاش ہم کو کوئی فراموشی کی دوائی کھلا دیتا یا نسیان کی بیماری ہو جاتی اور ہم بھول جاتے کہ ریاست جموں کشمیر میں چھ لاکھ ہندوؤں کے مقابلے میں اٹھارہ لاکھ مسلمانوں کا کوئی خبر گیران نہیں، کوئی پرسانِ حال نہیں، کوئی پناہ کی جگہ نہیں اور ان کے سر پر ہندو کونسل کے تعصب، ظلم اور بے رحمی کا آرا چل رہا ہے۔ فریاد کر کر کے تھک گئے ہیں مگر شامت اعمال ہے کہ ان کی کوئی فریاد بھی نہیں سنی جاتی۔ ہاں! اگر ہم یہ سب بھول جاتے تو کشمیر کا نام لینا چھوڑ دیتے اور بھول کر بھی کبھی یاد نہ کرتے یا یہ کہ کونسل خدا کا خوف کرتی اور ان ستم زدہ اور بد بخت مسلمانوں کا تعاقب اور شکار کرنا چھوڑ دیتی۔ تو ہم بھی خاموش رہتے لیکن جب یہ سب کچھ جانیں اور سب کچھ دیکھیں اور سبب کچھ نہیں تو پھر کیونکر صبر ہو سکتا ہے۔ آخر پہلو میں دل رکھتے ہیں۔ جب اس میں درد ہو تو آہ کا نکلنا ضروری ہے۔ اگر اب کونسل معاف کرنے پر آتی تو مسلمانوں کا قصور شائد کچھ بڑا قصور بھی نہ تھا۔ قصور یہی ہے کہ مسلمان ہیں۔ نکالے سے سب نکلتے بھی نہیں۔ کونسل اپنی گزشتہ شش ماہی کی کوششوں سے، جو اس نے مسلمانوں کو ملک بدر کرنے اور کشمیر سے نکالنے کی کی ہیں، حساب کر سکتی ہے کہ اگر اسی نسبت سے ان کا اخراج ہوا تو اٹھار لاکھ مسلمانوں کے نکالنے کے واسطے کتنا لمبا عرصہ درکار ہوگا اور آج یا کل یہ حسرت اور ارمان قبر میں ساتھ لے جانا پڑے گا۔ ہماری صلاح مانیں تو ان گنہگاروں اور شامت زدوں کو معاف کر دیں اور کچھ نہیں تو چین سے بیٹھنے ہی دیں:

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہیں، کافر نہیں ہیں ہم

ان اخباروں میں اگر چہ کشمیر کے تناظر میں یہاں کے سیاسی کوائف اور واقعات کو ہی زیادہ

توجہ کے درخور تصور کیا جاتا تھا لیکن گورکھپور سے 1892ء میں شائع ہونے والے ''الوقت'' نے اپنے 15 مارچ 1893ء کے شمارے میں کشمیر میں ایک جان لیوا جاڑے کا حال یوں بیان کیا ہے:

''کشمیر میں امسال سردی ایسی سخت پڑی کہ بیان کرتے ہیں کہ سمت (1889) کے بعد سے یہ دوسرا موسم سرما کا ایسا کڑا ہوا ہے۔ کوچہ و بازار، در و دیوار برف مجسم ہو رہے ہیں۔ مکانوں کے صحن میں چھ چھ گز برف اونچی جم گئی ہے اور ایسا پاکیزہ برف کا فرش معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس پر سفید کپڑے پہن کر لیٹتے پھرے تو کیا مجال کپڑوں پر کہیں داغ تک پڑ جائے یا میلا ہو جائے۔ دریائے جہلم فروری کو ایک فٹ گہرا جم گیا تھا اور اس کے بعد تمام سطح بلوریں ہو رہی ہے اور بعض حصوں میں گز بھر سے زیادہ جما ہوا ہے۔ لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ پانی پینے کے لیے گلاس ہاتھ میں رکھا اور کھانا کھانے بیٹھے۔ جب پانی کی ضرورت پڑی تو دیکھا کہ گلاس جم کر قلفی ہو گیا ہے۔ حقہ تازہ کیا۔ چلم بھری گئی۔ دو چار ہی دم لگائے تھے۔ دفعتاً آواز بند ہو گئی۔ ہر چند کش لگاتے ہیں مگر آواز نہیں آتی۔ آخر معلوم ہوا کہ جہاں تک پانی ہے وہاں تک جما ہوا ہے۔ جائے ضرورت گئے، گرم پانی ساتھ لیتے گئے لیکن اگر بدقسمتی سے وہاں دیر ہو گئی تو پھر وہیں سے ہوں ہوں کر رہے ہیں کہ اور پانی آئے تو اٹھیں۔ کیونکہ لوٹے کا پانی تو برف کا ڈلا بن گیا تھا۔ غرض کہ عجب شامت اور مصیبت ہے۔ اس تاریخ تک تھرمامیٹر بارہ درجے تک پہنچ گیا اور اگر سردی کی یہی کیفیت رہی تو انشااللہ صفر تک جا پہنچے گی۔ اس موسم کی سختی کی وجہ سے چھ سات واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ لوگ راہ چلتے سردی میں ٹھٹھر کے رہ گئے اور دیکھتے دیکھتے جان گئی''۔

☆☆

☆..........ڈاکٹر حیات عامر حسینی

# تصوف اور خوف کی نفسیات

عام بول چال میں جب ہم خوف کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارے سامنے محض ایک کیفیت یا اس کیفیت کا تصور ہوتا ہے اور اس سے مراد کسی شے کا ڈر ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے اس کے مختلف معانی، وجوہات و اثرات، مدعا و مقصد اور ان کا حاصل یا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کبھی ایسا ہوتا بھی ہے تو اس کی حیثیت محض ایک موہوم اور ہلکے ذہنی یا جذباتی اثر، خیال یا نقش کی سی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارے سامنے اس کے مختلف گہرے معانی، اثرات و کیفیات، تعلقات، وجوہ اور نتائج و مضمرات نہیں ہوتے۔

خوف ایک یک رخی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں اور علوم سے ہے۔ اس کی جڑیں بہت گہری اور اس کے مضمرات بہت وسیع ہیں، جن کا رشتہ مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، مذہبیات، سماجیات، قانون اور سماجی، معاشی اور تعلیمی شعبوں سے ہے۔ اسے محض ایک نفسیاتی مسئلہ، قضیہ اور رویہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی وسیع تر فہم کے لیے ہمیں انسان کی مابعد الطبیعی بنیادوں، اس کے وجودی قضایا، اور اس کی جسمانی و روحانی کشمکش، روحانی و نفسیاتی اتھل پتھل اور ارتقا کی گہرائیوں میں جانا پڑے گا۔ زندگی اور زندگی کے حقائق اور اسرار و رموز جتنے پیچیدہ اور گہرے ہیں اتنا ہی پیچیدہ اور گہرا یہ تصوّر بھی ہے۔ محض یہ کہنے سے کہ خوف (۱) ایک

اتفاقی اور اچانک تباہی کا ڈر ہے (۲) کسی خطرے کا احساس ہے (۳) کسی تکلیف دہ جذبہ جو کسی قریب الوقوع خطرے یا شر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کا نام ہے۔ (۴) ایک دہشت ناک حالت یا دہشت کا احساس ہے (۵) ایک ایسی خوف زدہ کر دینے والی دہشت ہے جس میں خوف ودہشت اور خدا یا کسی قانونی اور اعلیٰ قوت اختیار کی تعظیم وتکریم ملی جلی ہو (۶) ایک شے یا شخص کی حفاظت کے لیے تشویش یا فکر ہے (۷) کسی وقوع الپذیر حادثہ یا واقعہ کا احساس وادراک (۸) یا دہشت، ہیبت، یا الہامی وتخلیقی تکریم کا نام ہے۔ اس کی مختلف جہتوں کی نشاندہی تو ہوتی ہے لیکن اس کی کلی حیثیت کا ادراک نہیں ہوتا۔ خوف تو ایک کلی احساس وعمل کا نام ہے جو انسانی وجود کو جھنجوڑ کے رکھ دیتا ہے اور اسے مختلف نفسیاتی، انسانی، عملی اور روحانی عوامل، اعمال اور کیفیات اور ان کے ممکنہ مضمرات سے جوڑ دیتا ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس بات کا ادراک واحساس ہونا ضروری ہے کہ انسانی برتاؤ کی تہ میں محض بنیادی حیاتیاتی طریق عمل کی اساسی اہمیت نہیں ہے، بلکہ اس سے آگے بھی کچھ ایسے حقائق اور رموز ہیں جنھیں محض یہ کہہ کر کہ یہ انتہائی پراسرار، مشکل ومبہم اور ناقابل ادراک یا دریافت یا ناقابل فہم ہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی فہم کے لیے ہمیں مابعد الطبیعیات، مذہبیات، روحانیات، فنون لطیفہ، ادب اور شاعری اور تہذیب انسانی کے جملہ ارتقائی پہلوؤں کو نظر میں رکھنا پڑے گا۔

انسان کو کہانیاں کہنے اور سننے کا بڑا شوق ہے اور یہ شوق اس کے تخلیقی کرب کا نہیں بلکہ اس کی مابعد الطبیعی بنیادوں کی تلاش کی نشاندہی کرتا ہے۔ میں کہانی اور اسطور کو ایک ہی چیز اور حقیقت نہیں مانتا کیونکہ یہ دو مختلف چیزیں اور حقائق سے متعلق دو مختلف رویوں کے عکاس ہیں۔ کہانی محض ایک تخلیقی عمل ہے، جب کہ اسطور کہانی کے پردے میں شرک اور انسانی وکائناتی تخریب کی سیاہ داستان ہے۔ تخلیقی عمل اور منفی اسطور گری دونوں کے ساتھ خوف کا تصور بھی جڑا ہوا ہے جو مختلف انسانی اور نفسیاتی حقائق کو سامنے لاتا ہے۔

خوف کی سائنسی تحلیل وتشریح کے لیے جدید نفسیات نے دو طریقے اختیار کر لیے ہیں یا یوں کہیے کہ جدید نفسیات میں ان کا استعمال ہوتا ہے:

(الف) اس طور وطریق، برتاؤ یا کردار جس کا اظہار انسان کرتا ہے کی تاریخی بنیادوں اور وجوہ کی تلاش و تحلیل۔

(ب)......اور اس برتاؤ یا کردار کی حقیقی تنظیم کی تحقیق۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں اور انھیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ کون سے حالات یا وجوہ ہیں جو خوف کو پیدا کرتے ہیں اور ان حالات کی وجہ سے، جس سے خوف کی حالت پیدا ہو جاتی ہے وہ کس طرح کے کوائف اور کردار کو سامنے لاتی ہے۔ یہ حالات، کوائف اور کردار، مابعدی، اخلاقی، سماجی، مذہبی، سیاسی اور روحانی ہو سکتے ہیں جن کا ادراک سائنسی منہاج سے ممکن نہیں، کیونکہ سائنس کا عملی دائرہ کار محض مشاہدات ہیں اور اس کے علمیاتی حدود محض حواس، عقل اور لیبارٹری کے تجربات تک محدود ہیں اور ایسے کوائف جو مابعدی، مذہبی، اخلاقی، وجودی یا نظریاتی ہوں کا کسی سائنسی رصد گاہ میں مشاہدہ نہیں ہوسکتا اور نہ سائنس ان کے مشاہدات کی متحمل ہوسکتی ہے۔

اس بات کا تذکرہ میں نے اس لیے کیا کہ میں خوف کو محض ایک رویہ اور حالت نہیں سمجھتا اور نہ میرے لیے خوف کی وجوہات محض مادی، حیاتیاتی، حسی یا اسطوری عوامل ہیں۔ خوف کا ان سے پرے اور ان سے اعلیٰ ایک درجہ ہے، جو تمام خوف کو ختم کر دیتا ہے اور وہ وجود اعلیٰ یا واجب الوجود کا خوف یا اس کی محبت ہے جو ایک حرکی وجودی اخلاقیات اور اقدار کو تعمیر کرتے ہوئے نفسیات کے جملہ عوامل یا ایک انسان کی کلی نفسیات، یا اس کی ذہنی و عملی دنیا کو یکسر بدل دیتی ہے۔ اس انسانی رویے اور حالت کی ایک کلی طور پر بدلی ہوئی اعلیٰ حیثیت کا ادراک تصوف کے مقام اور حال سے کیا جاسکتا ہے جو محض نفسیاتی کیفیات نہیں ہیں، کیونکہ یہ انسان کی کل نفسیات کو متغیر کر دیتے ہیں۔

یہ بات اس لیے بھی اہم ہے کہ ایک رویے کو بنانے میں ماحول کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن جس خوف کا میں نے تذکرہ کیا اس میں ماحول کوئی کردار ادا کرتا ہی نہیں، کیونکہ یہ تو ماحول کو از خود بدل دیتا ہے اور اس کی طرف آنے والی تمام رکاوٹوں یا کیفیتوں کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اس کی سب سے اعلیٰ اور بہترین مثال اسوۂ پیغمبرؐ ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ خوف ایک منفی پہلو لیے ہوئے ہے۔ یا

یوں کہیے کہ خوف ایک منفی قدر ہے یا یوں کہیے کہ خوف ایک ایسا منفی مانع ہے، جو ایک انسان کو حالت مجبوری میں لاکھڑا کر دیتا ہے لیکن جس خوف کی ہم بات کر رہے ہیں وہ تو ایک کلی مثبت تعمیری مانع ہے، جو از خود تمام امتناعات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اسوۂ پیغمبر کو گلے لگاتا ہے۔ اس کی تفصیلی کیفیات کا آگے تصوف کے حوالے سے تذکرہ ہوگا۔

خوف کی شدت اور گہرائی کو کسی میکانیکی طریقے سے نہیں ناپا جا سکتا اور وہ بھی وہ خوف جس کا محرک کوئی مادی وجود نہ ہو بلکہ ایک ایسا وجود یا تصور ہو جو اپنے آپ میں لاحد و لا فانی ہے۔ ہم تھرمامیٹر کا استعمال بخار کی شدت ناپنے کے لیے کر سکتے ہیں، لیکن کیا کوئی ایسا آلہ ہے جو محبت کی شدت کو ناپ سکے یا اس آرام یا تکلیف کی شدت کو ناپ سکے جو انسان کو کسی آرام یا تکلیف کی حالت میں ہوتی ہے۔

بنیادی طور پر ہمارا مفروضہ Hypothesis ہی غلط ہے۔ ہم کسی حیوان، پرند یا درند پر ہوئے تجربات کو ایک کل یا حتمی نتیجہ مان کر چلتے ہیں، جن کے احساسات کی سطح کا انسانی احساسات کی سطح سے کوئی موازنہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی کوئی وجودی، مابعد الطبیعی، اخلاقی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی سطح ہی نہیں اور نہ ان کے پاس حواس کے سوا کوئی دوسرے اعلیٰ علمی ذرائع ہیں اور نہ ان کی طبیعی ساخت ایسی ہے، جیسی کہ انسان کی۔ ایک مشرک یا آواگون اور اسطور کے قائل اس طرح کی لغویات کا شکار تو ہو سکتے ہیں اور ایسا ہونا ان کے لیے ضروری ہے کیونکہ وہ ہر شے میں ایک مخصوص روح کی موجودگی کے قائل ہیں۔ حد تو یہ کہ وہ مختلف جانوروں اور انسانوں میں خدا کی روح کی موجودگی یا 'اوتار' کے قائل ہیں۔ یہ تجسیمیت کا فلسفہ خدا کو جو واجب الوجود اور تمام آلائشوں اور کمزوریوں سے منزہ ہے، ایک مذاق بنا دیتا ہے۔ یہ بات ماننے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ حیوانوں کے کچھ حسی قویٰ تیز ہو سکتے ہیں یا ہوتے ہیں، جیسا، کتے کی حس شامہ، چیتے یا شیر کی حس بصارت، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کی کوئی علمیاتی سطح اور ڈھانچا ہی نہیں ہوتا اور نہ ان کی کوئی شخصیت ہوتی ہے۔ وہ تو محض جاندار معروض ہیں، روحانی معروض نہیں۔ یہ حیثیت یا مذکورہ بالا حیثیتیں ان میں قطعی و حتمی طور پر مفقود ہیں۔ اسی لیے ان کے خوف کا احساس بھی ان کے حواس تک محدود ہے، اس سے آگے انھیں کسی خوف کا کوئی احساس ہی نہیں اور نہ وہ کسی تجربے کے اہل ہیں۔

میں اس مقالے میں خوف کی توجیہ اللہ کے مقدس کلام اور صوفیہ کی تعبیرات سے کرنے کی کوشش کروں گا، تا کہ اس کی بنیادی اور اعلیٰ حیثیتوں کو سمجھا جا سکے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن پاک کی یک رخی یا سطحی فہم و تعبیر کے بجائے اس کی آیات کے مختلف تناظرات اور پہلوؤں کو بغور سمجھنے کی ضرورت ہے، تا کہ تصوف اور اسلام کی نفسیات اور ان کی انسانی نفسیات کو سمجھنے اور بنانے اور اسے بدلنے کے پورے عمل کو سمجھا جا سکے۔

خوف انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے اور تصور بھی۔ انسانی زندگی، انسانی نفسیات اور رویوں اور طریق زندگی سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہ انسان کو زندگی کے مختلف شعبہ جات، صلاحیات، فطری و موروثی ذہنی رویوں سے جوڑتا بھی ہے اور ان سے الگ بھی کرتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ خوف ایک وجودی، نفسیاتی، سماجی، سیاسی، قانونی، مذہبی اور تہذیبی قضیہ ہے۔ یہ انسانی زندگی کے کلی طور پر مختلف حقائق کو نہ صرف توڑنے بلکہ جوڑنے کا بھی کام کرتا ہے۔ ان حقائق یا قضایا کے بغیر نہ صرف زندگی بلکہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور حقائق کا تصور ہی ناممکن ہے جیسے جھوٹ کے بغیر سچ، بدی کے بغیر نیکی، برائی کے بغیر اچھائی، بدصورتی کے بغیر خوبصورتی، خاموشی کے بغیر شور یا آواز، اندھیرے کے بغیر روشنی، ٹھنڈ کے بغیر گرمی کا ادراک ہی ناممکن ہے۔

قلب ماہیت یا اچانک تبدیلی و تغیر، یا ایک شے کا دوسری شے میں تبدیل ہونا، یا ایک ترتیب و کیفیت کا دوسری ترتیب و کیفیت، یا موقف و حیثیت میں تبدیلی خوف کے بغیر ناممکن ہے۔ یوں خوف محض ایک نری حقیقت نہیں رہتا بلکہ تبدیلی کا ایک استعارہ بن جاتا ہے، جس کے مختلف رنگ، روپ اور کوائف ہیں اور یہی انسانی زندگی، نفسیات اور رویوں اور لطائف کا گہرا راز بھی ہے اور قول متناقض Paradox بھی۔ اولین صوفیہ نے اپنے نظریات و فلسفہ کی بنیاد تصورِ خوف پر ہی استوار کی۔ ان حضرات میں حسن بصری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بعد کے صوفیہ اس کی مختلف جہتوں اور تشریحات کو سامنے لائے۔ امام غزالی نے اس تصور کو ایک فلسفیانہ اصول و تصور میں محکم کر دیا۔

اس تصور کو سامنے لانے میں ان کی غایت، مقصد و مدعا اور نیت یہ تھی کہ قلب انسانی میں اس کو اس طرح اتار دیا جائے تا کہ وہ تمام برائیوں سے اجتناب کر کے اعلیٰ حقائق کے ادراک کے

قابل ہو سکے۔ حقیقت اعلیٰ یا حقائق اعلیٰ کا ادراک تصفیہ وتزکیۂ قلب کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کی بنیاد ایک وسیع روحانی واخلاقی نظام ہے۔ یہ روحانی نظام یا روحانیت توحید میں پیوستہ ہے۔ توحید کا عملی اطلاق ایک اخلاقی نظام یا نظام اقدار کو سامنے لاتا ہے۔ یوں توحید جو اسلام کی کلی مابعد الطبعیات کی بنیاد ہے ایک حرکی اور پر زور سماجی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، روحانی اور اقتصادی نظام یا کلی طور پر ایک تہذیب کو پیدا کرتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان کو جانور کی طرح آزادانہ چھوڑ کر اسے بدی کے بھنور میں نہ دھکیلا جائے۔

اپنے مربوط تہذیبی نظام کے قیام، نفاذ اور دوام کی لیے قرآن انسان کے اندر نہ صرف اس کی داخلی یعنی ضمیر یا وجود کی آواز کو حرکی اور تخلیقی طور پر زندہ رکھنے کے اصول فراہم کرتا ہے بلکہ تمام انحرافات سے بچنے کے لیے ایک تادیبی قانونی نظام کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں اللہ قادر مطلق کے سامنے جوابدہی اور اس کے عذاب سے بچنے کے لیے، اس کے خوف کو اس کے دل میں جاگزیں کرتا ہے۔ یوں خوف کا یہ تصور اس کی مذہبیت، فن، فکر وفہم اور زندگی کو کلی طور پر محکم حرکی اصولوں پر چلانے کے لیے اُسے ایک خارجی و داخلی قوت فراہم کرتا ہے۔ یہ محض ایک قوت نہیں بلکہ ایک تخلیقی قوت بھی ہے، کیونکہ اس خوف کی محض کوئی خارجی بنیاد ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک مضبوط داخلی بنیاد بھی ہے جو محبت الٰہی، کہلاتی ہے۔ یہ خوف یک رنگ نہیں متنوع ہے اور اس کا تنوع ان اثرات کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے جو انسانی روح کی تابانی و درخشانی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ روح کی تابانی اسی وقت ممکن ہے، جب اس کا تعلق اللہ سے جڑ جائے جو تمام روحوں کا خالق و مالک ہے۔ اس تعلق کی بنیاد اس کی محبت ہے جس میں اس کا خوف یعنی اس سے علیحدگی اور دوری کا خوف بھی پوشیدہ ہے۔ خوف الٰہی وہ آگ ہے جو قلب کی تمام کثافتوں کو جلا دیتی ہے اور اسے اس نور کے حصول کے قابل بناتا ہے جو محبت الٰہی میں پوشیدہ ہے۔ یہ محبت جتنی گہری ہوتی جائے گی، اللہ کا خوف بھی اتنا ہی گہرا اور متنوع ہوتا جائے گا۔ اس حقیقت کا اظہار حضورؐ کی حیات طیبہ سے ملتا ہے۔ آپؐ کے خوف پر اللہ کی محبت غالب آتی تھی اور محبت پر خوف۔ یوں یہ دونوں چیزیں یکساں و مماثل ہیں۔ حضرت حسن البصری نے جب خوف کا تصور دیا تو انھوں نے دراصل قلب انسانی کی تطہیر کے بیج بوئے، یہ الگ بات ہے کہ اپنے زمانے کے حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں

نے محبت پر زیادہ زور نہیں دیا، اور ایسا کرنا ضروری تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ کام حضرت رابعہ بصری نے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں لالچ یا خوف سے اللہ کی عبادت نہیں کرتی بلکہ اس کی محبت کی وجہ سے اس کی عبادت کرتی ہوں۔

علماء اور صوفیہ کی ان دو تصورات کی توضیح و تشریح میں بعد الطرفین کا فاصلہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی کو سمجھنے اور برتنے میں دونوں طبقوں کی سوچ، فکر، رویوں اور توضیحات و اطلاقات میں کلی فرق ہے۔ ایک الفاظ کے ظاہری معانی پر زور دیتا ہے اور دوسرا ان کے مختلف الجہت معانی اور اعمال پر زور دیتا ہے۔ ظاہر بینی ایک کا شیوہ ہے اور درون بینی دوسرے کا وصف۔

علماء جس خوف کو دلوں میں پیدا کرتے ہیں وہ بنیادی طور پر جسم کو عذاب ملنے کا خوف ہے اور یہ عذاب مختلف اشیاء جیسے جہنم، سانپ، آگ یا کھولتے ہوئے پانی کے ذریعے دیا جائے گا۔ یہ آرام اور عزت کے چھن جانے کا بھی خوف ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اس خوف کا تعلق جسم اور اس کے متعلقات کی تباہی سے ہے یوں یہ خوف ایک پست درجے کا خوف ہے۔

لیکن صوفیہ جس خوف کا ذکر کرتے ہیں اس میں اشیاء (Objects) یا جسم کی تکلیف کوئی مسئلہ ہی نہیں اور نہ اسے کوئی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ اس خوف کا تعلق روح سے ہے، روح کی نا آسودگی اس کا معروض ہے جسم کی تکلیف نہیں۔ یوں یہ خوف معروضی کے بجائے موضوعی ہے۔ یہ خدا سے دوری کا خوف ہے۔ مادی، جسمانی اور فانی لذت سے محرومی یا سزاؤں سے اس خوف کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق اس واحد و یکتا ذات سے ہے جو کمال اور حسن و جمال و جلال کا منبع اور تمام نعمتوں کو عطا کرنے والی ہے۔ خوف اس مہجوری کا نام ہے۔ اس سے بڑا دردناک عذاب کیا ہے کہ ایک روح اس سے دور جا پڑے۔ یہی دوری سب سے بڑی رسوائی ہے۔ جو لوگ اس کی محبت میں ڈوب جاتے ہیں، یا جن کا وجود اس کی محبت کا مرکز بن جاتا ہے ان کے لیے تمام چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔

قرآن حکیم کے یہ الفاظ کہ ان کے لیے کوئی غم اور حزن نہیں، اس حقیقت کو سامنے لاتی ہیں۔ خوف اور حزن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خوف کی عام سطح کسی دنیاوی شے یا دنیاوی لذت کے چھن جانے اور اس کا تعلق کسی طاقتور شخص یا ادارے کے جبر سے ہے۔ اس کا ایک اور پہلو بھی

ہے وہ ہے جنسی اور ذہنی لذت وعیاشیوں کا چھن جانا یا ان کے غیر قانونی وغیر اخلاقی حصول کے نتیجے میں ذلت ورسوائی اور سزا کا ڈر۔

لیکن جس خوف کا ذکر یہ آیت کرتی ہے اس کا تعلق اولیاء سے ہے۔ ایمان اور ولایت کا پہلا زینہ ہی دنیاوی لذت سے دوری ہے۔ اس لیے ان کا چھن جانا ان کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ جب ان چیزوں کے چھن جانے کا کوئی غم ہی نہیں ہے تو لازماً کسی مایوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مایوسی اور غم تو ذہنی وروحانی کیفیات ہیں، ان کا جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ اولیاء تو خدا کی محبت میں ہر شے کی محبت کو تج دیتے ہیں اور ان کا یہ فیصلہ کسی جبر یا خوف کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ ان کا وجودی ومذہبی فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ انھیں ہر غم اور مایوسی سے بلند کر دیتا ہے اور اسی فیصلہ کے نتیجے میں ان کا ہر عمل خدا کے لیے ہوتا ہے، یا بالفاظ دیگر خدا کا عمل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی اس کی مرضی ہوتی ہے اور جس کی مرضی اور جس کا عمل خدا کی مرضی اور عمل ہے اس کے لیے کسی چیز کا کیا ڈر اور کیسی مایوسی۔ خوف اور مسرت دو حالتیں ہیں، قرآن حکیم کسی شے یا عمل کے حالات وکوائف و نتائج کی توجیہ اس کی دو مختلف جہتوں یعنی خیر اور شر یا منفی ومثبت پہلوؤں سے کرتا ہے۔ خوف یا شر کا تعلق محض برے اعمال یا اشیاء سے ہی نہیں، اچھے اعمال اور اچھی اشیاء سے بھی ہے اور ان کی کسوٹی نیت ہے۔ جیسے کسی مسکین یا بھوکے کو کھانا کھلانا اک عملِ خیر ہے جو وجہ مسرت ہے لیکن اگر یہ عمل کوئی اس نیت سے کرے کہ لوگ اسے نیک سمجھیں اور اس کی عزت وتوقیر کریں تو یہ برا اور قبیح عمل ہے اور غم وحزن کا مخزن ہے۔ لیکن اگر یہی عمل خدا کی رضا کے لیے کیا جائے تو یہ ایک نیک عمل ہے۔ اس کا مقصد خدا کی رضا کا حصول ہے جو تمام مسرتوں اور سعادتوں سے بڑھ کر ہے۔ لیکن اس عمل میں خوف کا ایک نازک سا عنصر ہمیشہ موجود رہتا ہے اور وہ اس بات کا خوف ہے کہ نیت یا عمل میں کوئی ایسا عنصر شامل نہ ہو جائے جو خدا کی ناراضگی اور اس سے دوری کی وجہ بن جائے۔

مسرت کا جو عنصر برے کاموں میں موجود ہوتا ہے، وہ محض ایک دھوکہ اور واہمہ ہے۔ وہ عارضی ہے اور ایک بڑے خوف، سزا اور ذلت ورسوائی کی بنیاد ہے۔ جیسے زنا کاری میں جو لذت ہے وہ ایک کریہہ عمل کی عارضی لذت ہے۔ اسی طرح کسی کے مال یا عزت پر ڈاکا زنی سے ایک مسرت یا فتح یابی کا جو احساس ہو جاتا ہے وہ بہت ہی عارضی ہے۔ اس احساس وعمل کو ہمیشہ خوف،

مایوسی، غم اور افسوس گھیرے رہتے ہیں۔

وجودِ انسانی اور اس کے مختلف رویے ایک بہت ہی مربوط مگر پیچیدہ اور مختلف الجہت نظام فکر و عمل ہے کوئی نرا حیاتیاتی یا مشینی نظام نہیں۔ ایک انسان زندگی جیتا ہے، وہ احساسات و اعمال کا مجموعہ ہے، وہ محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے، وہ پسند و ناپسند کرتا ہے، وہ اشیاء و اعمال میں انتخاب کرتا ہے، وہ خوش ہوتا ہے اور رنجیدہ بھی۔ اس کے مختلف اعمال اور رویوں کے پیچھے اس کے فیصلے ہوتے ہیں اور یہی فیصلے اور یہی اعمال اور رویے اس کی امیدوں، آرزوؤں، خوف اور مسرت، نفرت و محبت اور امید و نامیدی اور رنج و غم کو پیدا بھی کرتے ہیں اور ان کی پرورش بھی۔

امید، خوف اور محبت انسانی زندگی کے تین غیر معمولی پہلو ہیں جو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے ایک دوسرے کو سنوارتے ہیں یا زائل کر دیتے ہیں۔ تینوں کی سطح بہت پست بھی ہو سکتی ہے اور بہت شدید اور اعلیٰ بھی اور تینوں کے درمیان کبھی کبھی بعد الطرفین کا فاصلہ بھی ہو جاتا ہے۔

عام یا سطحی خوف کسی شے کے چھن جانے یا کسی معمولی سزا یا تکلیف یا غم کا خوف ہے۔ اسی طرح ایک چھوٹی سی امید کسی معمولی شے کے حصول کے متعلق ہوتی ہے اور ادنی محبت کسی معمولی شے، مسرت یا لذت سے ہوتی ہے۔

محبت کے معنی ہیں وابستگی، وارفتگی اور کشش، دلکشی، گرویدگی، قوت تسخیر و جذب کے بھی، وابستگی اور گرویدگی جتنی گہری ہوگی، وارفتگی بھی اتنی ہی گہری ہوگی۔ جس شے یا تصور یا حقیقت نے انسان کو اپنی طرف کھینچا، اس جیسا ہونے اور اس کے قریب رہنے کے شوق کو بھی محبت کہتے ہیں۔ اس سے دوری یا اس کو پانے میں ناکامی کا نام خوف ہے، یہی احساس محرومی و ناکامی، تکلیف، رنج و غم اور روحانی و جسمانی انتشار اور پراگندگی اور نتیجتاً تباہی کو پیدا کرتی ہے۔

لیکن تصور یا حقیقت اعلیٰ کی محبت ایک ایسی دلکشی، وابستگی اور وارفتگی کو پیدا کرتی ہے کہ جس کی ہر سطح پر اور ہر پہلو میں ایک خوف کا عنصر ہمیشہ قائم رہتا ہے لیکن یہ خوف کا عنصر مثبت وجود کا حامل ہے۔ یہ تباہی و بربادی اور پراگندگی پیدا نہیں کرتا، بلکہ ایک مہمیز کا کام کرتے ہوئے محبوب سے اور زیادہ نزدیک کر دیتا ہے۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ محبت اپنے اندر خوف کو پالتی ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک منہج ہے

اور یہ عنصر اس سے کبھی الگ نہیں ہوسکتا، سوائے مرحلہ دیدار خداوندی کے۔ اس طرح ہم محبت کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے وجود اور اس کی بنیاد میں خوف موجود ہے، جسے ہم 'فطری خوف کہہ سکتے ہیں اور وہ خوف جو محبت کے ساتھ مزید گہرا اور طاقتور ہوتا جاتا ہے اسے ہم فروعی یا دوسرے درجے کا خوف کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ ہمیشہ محبت کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔

فلسفیانہ مکاتب فکر میں وجودیت نے تصورِ خوف پر توجہ کی لیکن وجودی مفکرین کا تصور خوف اس مذکورہ 'فطری خوف' کے مماثل نہیں ہے۔ اسے ہم فروعی خوف کے درجے میں ڈال سکتے ہیں۔ وجودیین کے تصور خوف کی دو جہتیں ہیں۔ (الف) وہ خوف جس کا تعلق اشیا یا دنیا سے محرومی سے ہے۔ اسے وجودیین خوف Fear کہتے ہیں اور (ب) موت کا خوف، یا موت کے نتیجے میں انسانی وجود کے خاتمے کا شدید احساس اور خوف۔ اسے وجودیین بے نام خوف Angst یا Dread کہتے ہیں۔ ہیڈیگر اسی خوف کے حوالے سے اپنے فلسفہ وجود Dasein اور تاریخیت Historicity کی تشریح ... تے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں طرح کے خوف کسی روحانی تابانی و تابندگی کو نہ تو افزوں کر سکتے ہیں اور نہ ان کے ذریعے انسان اپنی روحانی بنیاد یا خدا سے رابطہ قائم کر سکتا ہے، کیوں کہ ان ہر دو میں محرومیِ دنیا اور محرومیِ جان کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ خوف الٰہی کے پیچھے جو بنیادی مقصد اور تصور کارفرما ہے وہ ہے خدا کی طرف سفر، یا خوف الٰہی کے ذریعے خدا سے اپنے آپ کو جوڑنا اور اس کی رضا یا موت کے بعد ایک نئی زندگی میں روحانی ارتفاع و کامیابی اور دیدار خداوندی کا حصول، لیکن وجودیین کے تصور خوف میں ایسی کوئی شے نہیں ملتی۔ عیسائی عقائد ان کے کل فلسفہ کی بنیاد یا ان کا فلسفہ ان عقائد کی نئی تشریح ہے جیسا کہ کیر کے گارڈ، ٹلچ اور دوسرے مفکرین کے فلسفے میں نظر آتا ہے۔ اس فلسفہ و تشریح کی کل اساس انسان کا ازلی گنہگار ہونا ہے۔ یہ نظریہ قرآن پاک کے تصور خلافتِ انسانی اور اس کی عظمت و آزادی سے کلی طور پر ٹکراتا ہے۔ یوں وجودیین کے ہاں اس خوف یا محبت کی کہیں کوئی رمق نظر نہیں آتی جو صوفیہ کے تمام فکر اور اعمال کی جان ہے اور جس کی اصل قرآن پاک کی تعلیمات ہیں۔ رہا مشرکانہ مذاہب اور دیومالا کا معاملہ تو ان کا کل وجود جنس اور جنسی اعمال اور جنسی آوارگی میں پیوستہ ہے۔ اس لیے ان میں پاکیزہ اور لطیف تصورات کا تصور کرنا ہی عبث ہے۔

قرآن پاک کا تصور خوف و محبت اس کے اساسی اصولِ توحید میں پیوستہ ہے۔ ویسے بھی

قرآن پاک کا ہر حکم کسی نہ کسی صورت میں اسی تصور سے وابستہ ہے۔توحید کا اساسی اصول اسلامی مابعد الطبیعیات کو چار بنیادی اصولوں رسالت، معاد، وحدت انسان اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر استوار کرتے ہوئے ایک واضح نظریۂ حیات اور انسانی تہذیب کی پرداخت کرتا ہے، جسے ہم توحیدی یا پیغمبرانہ تہذیب کہتے ہیں۔

قرآن کے 'تصور خوف' کو سمجھنے کے لیے کئی حقائق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

(الف) اللہ تمام کائنات کا خالق و مالک، رزاق، حاکم اور ربّ ہے۔ وہ تمام علم، حکمت، قوت، عزت اور شرف کا مالک ہے۔اس سے زیادہ تمام اشیاء کے حقائق و رموز اور کیفیات سے کون واقف ہوسکتا ہے؟ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے تمام علم کے ذرائع سے نوازا۔ وہ علیم و خبیر ہے اور دل کی انتہائی تہوں میں اٹھنے والے خیالات، جذبات و احساسات سے واقف ہے۔ اس سے زیادہ انسان کی نفسیات سے کون واقف ہوسکتا ہے؟

(ب) تمام اسماء وصفات اسی کو زیب دیتے ہیں۔ وہ رحیم و کریم بھی ہے اور غفور و ودود بھی، علیم و خبیر بھی ہے اور بصیر بھی، تمام جہانوں کا مالک بھی ہے اور پالن ہار بھی۔

(ت) وہ کوئی ظالم و جابر حکمران نہیں۔ اس کی ہر بات میں حکمتوں کا خزانہ موج زن ہے۔ اس کی سزا بھی اس کے لطف و کرم کا ہی حصہ ہے۔ اس لیے یہ اسی کا حق ہے کہ اس سے محبت بھی کی جائے اور اسی سے ڈرا بھی جائے۔ اس کا خوف اس کی محبت اور اس کی محبت اس کی خوف کا لازمہ ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ محبت نہ تو لایعنی باتوں اور حرکتوں کا مجموعہ ہے اور نہ خوف کسی ایسے وجود کا خوف جو محض ایک واہمہ ہے۔

(ث) اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بڑے ہی رحیم و کریم اور شفیق پیغمبر بھیجے اور سب سے عظیم و شفیق پیغمبر ختمی مرتبت حضرت احمد مجتبیٰؐ ہیں جو رحمت للعالمین بھی ہیں اور شفیع المذنبین بھی، قاسم بھی ہیں اور جواد بھی۔ پیغمبرانِ کرام کا یہ سلسلہ بھی اللہ کی رحمت و رحیمیت کا حصہ ہے۔

(ج) کتاب الٰہی کی مختلف آیات میں جہاں انسان کو اللہ سے ڈرنے کی ہدایت کی گئی ہے وہیں اس ہدایت سے پہلے جو بات بڑی ہی حکمت کے ساتھ بیان ہوئی ہے وہ اس کی مختلف صفات جیسے ربوبیت، نور، علم، انصاف و عدل، دانش و حکمت، انعامات، ہدایت اور احسان کا ذکر ہے۔

اور یہ عنصر اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکتا، سوائے مرحلہ دیدار خداوندی کے۔ اس طرح ہم محبت کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے وجود اور اس کی بنیاد میں خوف موجود ہے، جسے ہم 'فطری خوف' کہہ سکتے ہیں اور وہ خوف جو محبت کے ساتھ مزید گہرا اور طاقتور ہوتا جاتا ہے اسے ہم فروعی یا دوسرے درجے کا خوف کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ ہمیشہ محبت کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔

فلسفیانہ مکاتب فکر میں وجودیت نے تصورِ خوف پر توجہ کی لیکن وجودی مفکرین کا تصور خوف اس مذکورہ 'فطری خوف' کے مماثل نہیں ہے۔ اسے ہم فروعی خوف کے درجے میں ڈال سکتے ہیں۔ وجودیین کے تصور خوف کی دو جہتیں ہیں۔ (الف) وہ خوف جس کا تعلق اشیا یا دنیا سے محرومی سے ہے۔ اسے وجودیین خوف Fear کہتے ہیں اور (ب) موت کا خوف، یا موت کے نتیجے میں انسانی وجود کے خاتمے کا شدید احساس اور خوف۔ اسے وجودیین بے نام خوف Angst یا Dread کہتے ہیں۔ ہیڈیگر اسی خوف کے حوالے سے اپنے فلسفہ وجود Dasein اور تاریخیت Historicity کی تشریح کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں طرح کے خوف کسی روحانی تابانی و تابندگی کو نہ تو افزوں کر سکتے ہیں اور نہ ان کے ذریعے انسان اپنی روحانی بنیاد یا خدا سے رابطہ قائم کر سکتا ہے، کیوں کہ ان ہر دو میں محرومیِ دنیا اور محرومیِ جان کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ خوف الٰہی کے پیچھے جو بنیادی مقصد اور تصور کارفرما ہے وہ ہے خدا کی طرف سفر، یا خوف الٰہی کے ذریعے خدا سے اپنے آپ کو جوڑنا اور اس کی رضا یا موت کے بعد ایک نئی زندگی میں روحانی ارتفاع و کامیابی اور دیدار خداوندی کا حصول، لیکن وجودیین کے تصور خوف میں ایسی کوئی شے نہیں ملتی۔ عیسائی عقائد ان کے کل فلسفہ کی بنیاد یا ان کا فلسفہ ان عقائد کی نئی تشریح ہے جیسا کہ کیر کے گارڈ، ٹلچ اور دوسرے مفکرین کے فلسفے میں نظر آتا ہے۔ اس فلسفہ و تشریح کی کل اساس انسان کا ازلی گنہگار ہونا ہے۔ یہ نظریہ قرآن پاک کے تصور خلافتِ انسانی اور اس کی عظمت و آزادی سے کلی طور پر ٹکراتا ہے۔ یوں وجودیین کے ہاں اس خوف یا محبت کی کہیں کوئی رمق نظر نہیں آتی جو صوفیہ کے تمام فکر اور اعمال کی جان ہے اور جس کی اصل قرآن پاک کی تعلیمات ہیں۔ رہا مشرکانہ مذاہب اور دیومالا کا معاملہ تو ان کا کل وجود جنس اور جنسی اعمال اور جنسی آوارگی میں پیوستہ ہے۔ اس لیے ان میں پاکیزہ اور لطیف تصورات کا تصور کرنا ہی عبث ہے۔

قرآن پاک کا تصور خوف و محبت اس کے اساسی اصولِ توحید میں پیوستہ ہے۔ ویسے بھی

قرآن پاک کا ہر حکم کسی نہ کسی صورت میں اسی تصور سے وابستہ ہے۔توحید کا اساسی اصول اسلامی مابعد الطبیعیات کو چار بنیادی اصولوں رسالت، معاد، وحدت انسان اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر استوار کرتے ہوئے ایک واضح نظریۂ حیات اور انسانی تہذیب کی پرداخت کرتا ہے، جسے ہم توحیدی یا پیغمبرانہ تہذیب کہتے ہیں۔

قرآن کے 'تصور خوف' کو سمجھنے کے لیے کئی حقائق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

(الف) اللہ تمام کائنات کا خالق و مالک، رزاق، حاکم اور ربّ ہے۔ وہ تمام علم، حکمت، قوت، عزت اور شرف کا مالک ہے۔اس سے زیادہ تمام اشیاء کے حقائق و رموز اور کیفیات سے کون واقف ہوسکتا ہے؟ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے تمام علم کے ذرائع سے نوازا۔ وہ علیم و خبیر ہے اور دل کی انتہائی تہوں میں اٹھنے والے خیالات، جذبات و احساسات سے واقف ہے۔ اس سے زیادہ انسان کی نفسیات سے کون واقف ہوسکتا ہے؟

(ب) تمام اسماء وصفات اسی کو زیب دیتے ہیں۔ وہ رحیم و کریم بھی ہے اور غفور و ودود بھی، علیم وخبیر بھی ہے اور بصیر بھی، تمام جہانوں کا مالک بھی ہے اور پالن ہار بھی۔

(ت) وہ کوئی ظالم و جابر حکمران نہیں۔ اس کی ہر بات میں حکمتوں کا خزانہ موج زن ہے۔اس کی سزا بھی اس کے لطف و کرم کا ہی حصہ ہے۔ اس لیے یہ اسی کا حق ہے کہ اس سے محبت بھی کی جائے اور اسی سے ڈرا بھی جائے۔ اس کا خوف اس کی محبت اور اس کی محبت اس کی خوف کا لازمہ ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ محبت نہ تو لایعنی باتوں اور حرکتوں کا مجموعہ ہے اور نہ خوف کسی ایسے وجود کا خوف جو محض ایک واہمہ ہے۔

(ث) اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بڑے ہی رحیم وکریم اور شفیق پیغمبر بھیجے اور سب سے عظیم و شفیق پیغمبر ختمی مرتبت حضرت احمد مجتبیٰؐ ہیں جو رحمت للعالمین بھی ہیں اور شفیع المذنبین بھی، قاسم بھی ہیں اور جواد بھی۔ پیغمبرانِ کرام کا یہ سلسلہ بھی اللہ کی رحمت و رحیمیت کا حصہ ہے۔

(ج) کتاب الٰہی کی مختلف آیات میں جہاں انسان کو اللہ سے ڈرنے کی ہدایت کی گئی ہے وہیں اس ہدایت سے پہلے جو بات بڑی ہی حکمت کے ساتھ بیان ہوئی ہے وہ اس کی مختلف صفات جیسے ربوبیت، نور، علم، انصاف و عدل، دانش و حکمت، انعامات، ہدایت اور احسان کا ذکر ہے۔

(ح) اسی لیے دین حق کے اخلاقی نظام کی بنیاد بن دیکھے اللہ کا خوف ہے۔ جو جبار و قہار ہی نہیں رحمٰن و رحیم بھی ہے اور اس کا رحم و کرم تمام کائنات کو گھیرے ہوئے ہے۔ ایمان اور ہدایت ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

''یہ کتاب (الٰہی) اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں! ہدایت ہے (خدا سے)
ڈرنے والوں کے لیے۔'' (۲:۲)

اور ہدایت، مغفرت اور اجر ان لوگوں کو عطا ہوتے ہیں جو بن دیکھے ربّ پر ایمان لاتے ہیں۔

''جو لوگ بن دیکھے اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں۔ یقیناً ان کے لیے
مغفرت ہے اور بڑا اجر۔'' (۶۷:۱۲)

''اور اللہ سے ڈرو! جان لو کہ اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔'' (۲:۲۳۱)

''اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سب کاموں کو جو تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔'' (۲:۲۳۳)

اللہ کے فرمان عالی شان یعنی قرآن پاک کی حقیقت، ماہیت اور فطرت صرف ہدایت ہے۔ یہ نور، رہنما اور حق کو واضح کرنے والی کتاب ہے۔ ایمان کی اصل اور شناخت تقویٰ یعنی خوفِ خدا ہے۔ اسی خوف سے دل کے تالے کھل جاتے ہیں اور اس کی سیاہی دور ہو جاتی ہے۔ اور یہی تقویٰ دل کو کتاب الٰہی کی ہدایت کے حصول کے لیے تیار کرتا ہے۔ دل کی صفائی کے معنی ضمیر اور شعور کا صاف و شفاف ہونا ہے اور تقویٰ کے معنی اس دائمی خوف کے ہیں جو دل کو تزکیہ و تطہیر سے منور کرتا ہے اور انسان کو پاکیزہ زندگی گزارنے پر آمادہ کرتا ہے۔

(خ) متقین کی پہلی علامت شعوری، ایجابی، عملی اور فعلی وحدت ہے۔ ایسی وحدت جو ان کے نفوس میں ایمان بالغیب، فرائض کی ادائیگی، تمام رسولوں پر ایمان اور آخرت پر ایمان کو یکجا کر دیتی ہے۔ متقین محسوسات پرست نہیں ہوتے۔ وہ خدا پر بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور یہی ایمان بالغیب حیوانات اور انسانی ارتقا کے درمیان حد فاصل ہے۔

(د) ایمان کی پہلی شرط یہ ہے کہ تمام شرائط کے بغیر خدا پر ایمان لایا جائے اور اسی کو محبت بھی کہتے ہیں، کیونکہ محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔ شرطیں تو سودا بازی کا خاصہ ہیں ایمان و محبت کا نہیں، یہی تقویٰ بھی ہے، کیونکہ تقویٰ یعنی خوف الٰہی قلب کا ایک شعور اور وجدان کا ایک احساس

ہے۔اسی سے تمام صالح افکار پھوٹتے ہیں۔ باطنی احساسات اور ظاہری اعمال و حرکات کے مابین وحدت رونما ہوتی ہے۔ظاہر و باطن میں اللہ سے انسان کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور روح ہلکی ہو جاتی ہے اور اس پر سے تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ یہ اسے اطمینان عطا کرتا ہے۔جس کی آخری صورت راضیہ المرضیہ ہے۔

(ذ) تقویٰ ہی متقین میں انفاق پیدا کرتا ہے اور اسی سے ان میں بہترین انسانی روابط اور انسانی اخوت اور انسانی ہمدردی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ یوں تقویٰ بہترین انسانی سماج کی تعمیر و ترویج کرتا ہے۔انفاق کی جڑ تقویٰ ہے اور تقویٰ کی بنیاد ایمان۔ یوں یہ تینوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایمان نور ہے، تقویٰ اس کا ارتکاز اور انفاق اس کا اظہار اور پھیلاؤ اور قلب ان کا مقام، مصدر وارتکاز و انتشار۔

> ''ایمان وہ نور ہے جب یہ نور مومن کے دل سے پھوٹتا ہے تو اس سے مومن کا پورا وجود منور ہو جاتا ہے۔اس کی روح منور اور شفاف ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش روشنی بکھیرتی ہے۔ اس نور سے اشیاء، اقدار، پیمانوں اور تصورات کے حقائق منکشف ہوتے ہیں اور مومن کا دل کسی پردے اور اشتباہ کے بغیر انھیں واضح طور پر دیکھتا ہے۔ان میں سے جس حقیقت کا جو مقام ہوتا ہے کسی فرق کے بغیر اسے وہی مقام دیتا ہے اور ان میں سے جن حقائق کو چاہتا ہے سہولت، طمانیت، اعتماد اور سکون وقرار کے ساتھ لیتا ہے اور جنھیں چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ نور کائنات میں جاری قانون کی طرف مومن کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں مومن کی حرکت و اعمال اور اس کے گرد و پیش اور خود اس میں نافذ کائناتی قوانین کے عمل میں پوری مطابقت ہو جاتی ہے۔ وہ راہ خدا پر بہت ہی سہولت اور نرم روی کے ساتھ گامزن ہوتا ہے۔ نہ وہ راہ سے بھٹکتا ہے اور نہ اس کا راہ کی رکاوٹوں سے تصادم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا راستہ اسے معلوم اور اس کے لیے واضح ہے''۔ (فی ظلال القرآن جلد اول، دوم)

(ر) اس نور کے مقابل قوت کفر و شرک ہے جو مجسم تاریکی ہے جو مختلف صورتوں اور

شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس تاریکی کی پہلی صفت خدا سے سرکشی اور بغاوت ہے اور یہی حجاب قلب ہے جو انسان کی فطرت کو مسخ کر کے اُسے حد درجہ سرکش بنا دیتی ہے اور وہ زمین پر فساد پھیلا دیتا ہے۔ اللہ سے بے خوفی اور سرکشی انسان کو ہزاروں خداؤں کا غلام بنا دیتی ہے اور اسے انتہا درجہ بزدل، کم مایہ، دروغ گو، بخیل، حاسد، کینہ پرور، شکست خوردہ اور کمینہ اور ارزل یعنی جملہ سیئات یا شقاوتوں اور برائیوں کا مجموعہ بنا دیتی ہے۔ کفر و شرک کی واضح صفت جھوٹ ہے۔ کیونکہ ان سے بڑا کوئی جھوٹ نہیں۔ اسی جھوٹ کے زعم میں ایک کافر و مشرک ہر شقاوت اور سیاہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ قلب کی سیاہی اسے ہدایت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کے حواس و عقل پر مہر لگ جاتی ہے۔ یعنی وہ حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کی شدبد کھو دیتا ہے۔ اسی لیے وہ حکمت و دانش اور بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے اور ایسا ہونا ضروری ہے کیونکہ حکمت اعلیٰ اخلاق اور دانش مندی، فیاضی، نیک خوئی، نرم روی، فراخ دستی، بردباری، عفو و درگزر، شکر گزاری، صبر، توکل اور انصاف پسندی یعنی جملہ حسنات و اخلاق و اقدار عالیہ تو مومن کا زیور ہے۔

''پس (اے نبی) بشارت دے دو میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی دانش مند ہیں۔'' (۸۱:۹۳)

''سنو جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا ان کے لیے کسی خوف و رنج کا موقع نہیں۔'' (۱۰:۳۶،۲۶)

اللہ کا خوف حکمت، دانش مندی، اعتدال، تدبر و تفکر، بصیرت اور فہم و ادراک اور امورات کی صالح انجام دہی کی بنیاد ہے۔ قرآن حکیم میں حکمت کا لفظ گہری بصیرت و دانائی اور اعلیٰ اخلاق و کردار دونوں کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے اللہ کے پیغمبر کی ایک واضح صفت حکمت ہے۔ اسی لیے اس کا ایک نام حکیم بھی ہے۔ اس لیے جو بھی لوگ آپ کا اتباع کرتے ہیں صاحب حکمت و فراست ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی غفلت میں نہیں پڑتے اور نہ وہ کسی گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ تاریخ اور دنیا کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہیں اسی لیے وہ صاحبِ بصیرت ہیں۔

ان مباحث اور تصوف کے ابتدائی دور علی الخصوص حضرت حسن بصری اور حضرت رابعہ

بصری کے فلسفہ خوف ومحبت کو سمجھنے کے لیے ہمیں امام غزالی کے تصور خوف ورجا کی طرف مراجعت کرنی پڑے گی۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ امام غزالی سے پہلے اور آپ کے بعد بھی کسی مفکر یا صوفی نے ان تصورات کی فلسفیانہ تشکیل و تحلیل نہیں کی۔ امام غزالی کے تصور خوف ورجا کی صحیح فہم کے لیے اس کے تصور علم اور محبت الٰہی کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا اور بندے کے درمیان محبت کا کوئی تعلق یا رشتہ ہوسکتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے کلام پاک کی ان آیات کریمہ کو ذرا سا ذہن میں رکھ کر آگے بڑھیں تو بہت سی گتھیاں خود بخود سلجھتی نظر آئیں گی۔ ارشاد خداوندی ہے:

''یقیناً اللہ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو زیادہ سے زیادہ توبہ کرنے والے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہنے والے ہیں۔'' (۲:۲۲۲)

''اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی۔'' (۱۲:۰۳)

''تمھارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔'' (۵:۵۵)

''اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔'' (۲:۲۲۲)

''اور خاص اپنے پاس سے (حنان) سوز و گداز اور پاکیزگی۔'' (۱۹:۱۵)

کئی مفکرین وعلماء کا یہ خیال کہ محبت کا تعلق ایک جیسی نوع کے افراد کے درمیان ہی ممکن ہے اور یہ کہ خدا کی محبت کے معنی محض اس کی اطاعت کے ہیں، اپنے آپ میں ایک عملی مغالطہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسانوں اور جانوروں کے درمیان کسی قسم کا تعلق ہی ممکن نہ ہوتا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان جانوروں، پرندوں، پھولوں اور ہزاروں قسم کی نباتات اور جمادات کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ کتنے ہی جانور ایسے ہیں جو اپنے پالن ہار کی محبت وحفاظت میں اپنی جان تک دے دیتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک سطحی دلیل ہے۔ معاملہ ایک جیسی نوع کا نہیں تعلق وکشش وانجذاب کا ہے۔ ایک ہی نوع کے افراد ایک دوسرے سے انتہائی حد تک نفرت بھی کرتے ہیں۔ خدا اور بندوں کے درمیان محبت اسی تعلق وکشش وانجذاب کی وجہ سے ہے۔ انسان کے دل میں ان اشیاء کی طرف ایک فطری میلان ہے جو اسے خوشی ومسرت دیتی ہیں۔ یا جو اسے پسند آتی ہیں۔ یا جن کا وہ گرویدہ

ہو جاتا ہے۔ اس لیے نفرت اس فطری میلان کا نام ہے جو چیزوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیتا یا پھینکتا ہے۔ وہ چیزیں جو انسان کو تکلیف پہنچاتی ہیں وہ ان سے فطری طور پر دور بھاگتا ہے لیکن اس فطری تعلق کو سمجھنے کے لیے جیسا کہ ہم نے پہلے ہی ذکر کیا ہے ان اشیاء کے خواص کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ سانپ کی کھال بہت ہی جاذب نظر ہوتی ہے لیکن اس کا زہر قاتل ہوتا ہے۔ اگر انسان کو سانپ کے زہر کا علم نہ ہو تو وہ اس کے زہر کا شکار بن سکتا ہے۔ مخبوط الحواس یا معصوم بچوں کو چونکہ اشیاء اور ان کے خواص کا علم ہی نہیں ہوتا لہٰذا وہ ان سے نہیں ڈرتے اور ان کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح خدا کی محبت خدا کے علم میں پیوستہ ہے۔ اگر کسی شخص کو خدا کا علم یا اس کی صفات کا ادراک ہی نہ ہو تو وہ اس سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن اس علم کے حصول کے لیے تصفیہ قلب بنیادی شرط ہے۔ جس طرح جب تک ایک سلیٹ صاف ستھری نہ ہو اس پر لکھا نہیں جا سکتا، یا اس پر الفاظ واضح ہو کر ابھر نہیں سکتے، ٹھیک اسی طرح جب تک قلب تمام آلائشوں اور شہوات سے پاک نہ ہو اس پر خدا کے علم کا پرتو تک نہیں پڑ سکتا محبت تو بہت دور کی بات ہے، لیکن جس طرح خدا کی محبت کوئی عام محبت نہیں، ٹھیک اسی طرح اس کا علم بھی کوئی عام علم نہیں ہے۔ قلب انسانی جتنا صاف ہوتا جائے گا، علم خداوندی کی شعاعیں اتنی ہی اس پر اثر انداز ہوں گی اور علم خداوندی کی گرفت قلب پر جتنی مضبوط ہوگی، محبت خداوندی بھی اتنی ہی گہری ہوتی جائے گی۔

انسانوں یا حیوانوں اور دیگر چیزوں کے درمیان محبت کی بنیاد حواس کے ادراک یا علم پر منحصر ہے۔ لیکن خدا کا علم ماورائے ادراک حسی ہے۔ اس کا تعلق عام عقل یا منطق سے بھی نہیں۔ اس علم کا حصول علم المکاشفہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ علم المکاشفہ کی بنیاد تصفیہ و تزکیہ قلب کے ساتھ ساتھ صفاتِ خداوندی پر غور فکر بھی ہے۔ اس علم کو ہم وجدان کہتے ہیں۔ اس کی صفت فوری، صریح، قطعی اور بلا واسطہ آگہی و ادراک ہے۔

خدا ہماری محبت کا انتہائی مطلوب ہے کیونکہ وہی ان تمام اشیاء اور ان تمام وجوہ کا خالق ہے جن سے محبت پیدا ہوتی ہے، یا جن سے محبت ہوتی ہے۔ غزالی نے چار علتوں کو محبت کی وجہ بیان کیا ہے (الف) محبت ذات (ب) محبت محسن و مربی (ج) محبت حسن (د) دو روحوں کے درمیان انسیت۔ انسان ہر قیمت پر اپنا تحفظ اور اپنی بقا چاہتا ہے۔

انسان اپنے آپ یا اپنے وجود سے محبت کرتا ہے۔ وہ ہر سطح اور ہر قیمت پر اپنے تحفظ، بقا اور کمال کا خواہاں ہے اسی لیے وہ اس ہر شے سے محبت کرتا ہے جو اس عمل میں اس کی مدد معاون ہے، جیسے اپنے اعضاء اپنی قوت، دولت، اولاد، خاندان، دوست واحباب وغیرہ۔ اسی لیے وہ ہر اس شے سے محبت کرتا ہے جو اسے فائدہ پہنچاتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ بھی ایک طرح کی محبت ذات ہی ہے۔ کیونکہ وہ کسی شے سے اسی لیے محبت کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کو فائدہ اور استحکام مل رہا ہے۔

محبت حسن وفوائد سے مبرا ہے۔ حسن اپنے آپ میں محبت کا مرکز ہے۔ یہ انسانی وجود کو جمالیاتی احساسات کے ذریعے مسرت سے سرشار کر دیتا ہے۔ حسن کے معنی ہیں اجزاء میں حسن ترتیب اور ہم آہنگی۔ یہی ہم آہنگی چیزوں کو کمال سے آراستہ کر دیتی ہے۔ حسن محض اشیاء میں نہیں ہوتا۔ یہ تصورات واحساسات میں بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے جتنے بھی تصوراتی تشکیلات یا اقدار ہیں، جیسے اخلاق وکردار، نیکی، علم وہ بھی حسن ہی ہیں۔ اسی لیے ہم ان صفات کی حامل اشیاء اور شخصیات سے بھی محبت کرتے ہیں جو حسین ہوں۔

ان چار وجوہ کی صحیح معرفت انسان کو معرفت حقیقی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ کیونکہ ان چاروں علل کو خدا نے پیدا کیا۔ وہی سب سے بہترین حفاظت اور زندگی عطا کرنے والا بھی ہے اور سب سے بہترین منعم بھی۔ وہی جمیل وحسین ہے اور تمام جمال اسی کی تخلیق ہے۔ اسی نے تمام ارواح کو پیدا کیا اور ان کے درمیان محبت ڈال دی۔ وہ اپنی ذات میں خالق کل، منعم اور حسن کل ہے۔ تمام کائنات اسی کی پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا اس کی ذات حقیقت میں اس لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ انسان کے لیے صحیح راہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے رنگ میں رنگ جائے، یعنی اس کی صفات کو ایک ممکنہ حد تک اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اللہ نے ارواح کو پیدا کیا۔ انسان کے اندر روح پھونکی اور اسے اپنا خلیفہ بنایا۔ لہٰذا اللہ اور انسان (یعنی بندوں) کے درمیان ایک فطری تعلق ہے، لیکن اس تعلق کو صرف علم المکاشفہ یا وجدان کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

لیکن اللہ اور بندوں کے درمیان محبت کے معنی وہ نہیں جس کا اطلاق بندوں کے درمیان محبت یا بندوں اور کائنات کی دیگر اشیا کے درمیان محبت پر ہے۔ کیونکہ اللہ کامل ذات ہے وہ تمام

ضرورتوں اور مجبوریوں سے بالا و ماوریٰ ہے۔ جب کہ تمام اشیاء محض مخلوق اور محتاج ہیں۔ اللہ کی محبت کی دو جہتیں ہیں (الف) اللہ کی اپنے بندوں سے محبت (ب) بندے کی اللہ سے محبت۔ اللہ کی محبت کے معنی اپنی تخلیق سے محبت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہی ایک واجب الوجود ذات حقیقی ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ فانی اور اس کی مخلوق ہے۔ محبت الٰہی کے معنی انسان کے قلب پر سے تمام سیاہی کے پردوں کو ہٹا کر اسے اللہ کا قرب اس کی معرفت اور رضا و دیدار عطا کرنا ہے۔ اللہ کی محبت اس کی مرضی ہے جو ازلی و ابدی ہے۔ اللہ تمام تغیرات سے معریٰ ہے۔ تغیر کائنات کی صفت ہے خدا کی نہیں۔ تصفیہ قلب سے انسان کے اعمال اور اس کے علم و معرفت کی سطحیں بدل جاتی ہیں اور جتنا اس کا علم کمال کی طرف بڑھتا ہے اتنا ہی اس کی معرفت ذات میں شفافیت آ جاتی ہے۔ اور جتنا اس کا دل جملہ شہوات و خواہشات سے پاک ہوتا ہے، اتنا ہی وہ خدا کی حفاظت و نگرانی میں آ جاتا ہے اور جتنا یہ رشتہ مضبوط ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کی مرضی اور اعمال اللہ کی مرضی کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ اور اس عمل کا انتہائی نقطہ یہ ہے کہ اس کی مرضی اللہ کی مرضی بن جاتی ہے۔ جب وہ اللہ کے جلال و جمال و کمال کا علم المکاشفہ کے ذریعے مشاہدہ کرنے لگتا ہے تو اس کے دل میں اس سے مہجوری کے تصور سے ہی خوف پیدا ہونے لگتا ہے۔ اللہ کی رضا اور اس کے انس اور شوق کی بنیاد اللہ کا علم یا معرفت ہے۔ لوگوں کے درجات اللہ کی معرفت یا اس کے علم اور ان کے تصفیہ قلب اور محبت کی شدت و گہرائی کے مطابق ہیں۔ غزالی نے لوگوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

(الف) اصحاب یمین وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے اسماء و صفات کے متعلق سُنا یا پڑھا۔ انھیں ان کی معرفت نہیں ہوتی۔

(ب) گمراہ لوگ جو راہ مستقیم پر نہیں اور جن کا علم جھوٹا اور گمراہ کن ہے۔

(ج) صادقین، جن کا علم سچا اور جن کی معرفت گہری ہے وہ اللہ کے قریب ہیں۔

امام غزالی سے بہت پہلے ذوالنون مصری نے لوگوں کی درجہ بندی علم کی بنیاد پر کی، لیکن یہ درجہ بندی غزالی سے ذرا مختلف ہے۔ ذوالنون کے خیال میں لوگوں کے تین درجے ہیں جن کا تعلق ان کے درجہ علم اور ایمان سے ہے۔

(الف) عام لوگ جو خدا پر اس لیے ایمان لاتے ہیں کہ انھوں نے خدا کے بارے میں سنا۔ یا وہ اس

ماحول میں پیدا ہوئے جہاں خدا کو مانا جاتا ہے۔

(ب) علما و مفکرین جو منطقی دلائل اور علمی معلومات و استدلال کی بنا پر خدا پر ایمان لاتے ہیں۔

(ج) عرفاء جن کا ایمان معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ایک شخص کے علم اور معرفت میں جتنی گہرائی، شدت اور کمال آتا جائے گا، اتنا ہی اللہ سے اس کا تعلق گہرا ہوتا جائے گا۔ تعلق اور قربت جتنی بڑھتی جائے گی، اللہ کے خوف میں اتنی ہی شدت پیدا ہوگی۔ اللہ کا خوف انسان کے علم کے مطابق ہے۔ معرفت الٰہی انسان کی محبت کو مضبوط کرتی جاتی ہے اور محبت جتنی گہری ہوگی، خوف بھی اتنا ہی شدید ہوگا۔ غزالی کے خیال میں کمال کے لیے، علم خداوندی اولین شرط ہے، کیونکہ اس کے بغیر خدا کی محبت ممکن نہیں۔ لیکن خدا کا علم ہر حال میں خدا کی محبت نہیں ہوتا۔ محبت علم سے زیادہ اعلی و ارفع معیار مطلوب ہے۔ شہاب الدین سہروردی نے کہا ہے کہ محبت خاص اور منفرد ہے۔ یہ انسیت سے بہت ارفع ہے۔ کیونکہ جملہ محبت انسیت ہے لیکن ہر انسیت محبت نہیں ہوتی۔ لیکن انسیت علم سے اعلیٰ ہے کیونکہ کل انسیت علم ہے لیکن سارا علم انسیت نہیں۔ علم کا تعلق جسم یا روح سے موافقت سے ہے۔ جب اس کا تعلق روح سے ہو تو یہ خیر اعلیٰ کہلاتا ہے اور خیر اعلیٰ کی بنیاد علم اور انسیت ہے۔

خوفِ خدا کا تعلق جہالت سے نہیں کیونکہ جہل یا لاعلمی خوف خدا پیدا نہیں کرتی۔ خوف علم سے پیدا ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ علم خوف کی بنیاد ہے۔ علم جتنا وسیع اور گہرا ہوگا خوف کی شدت بھی اتنی ہی ہوگی۔ محبت کا انتہائی مطلوب ذات خداوندی ہے کیونکہ وہ ان تمام علل کا منبع ہے جو محبت کی بنیاد ہیں۔ محبتِ خدا ہی سے تمام اخلاقی و سماجی اقدار پیدا ہوتی ہیں۔ انتہائی خوف کا تعلق عرفانِ ذات الٰہی سے ہے۔ اس لیے یہ اس کی محبت سے جڑا ہوا ہے۔ غزالی نے مسئلہ خوف پر بہت طویل بحث کی ہے۔ اس کے معانی اور حقیقت کا بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ خوف درد دل اور سوز درونی کا نام ہے جو زمان آئندہ کی کسی بری توقع کے سبب ہوتا ہے۔ واسطے کے حوالے سے وہ اسے خدا اور بندے کے درمیان حجاب کہتے ہیں۔ خوف کی حالت اور شدت کا احساس کسی شے کی خاصیت کے علم کے مطابق ہوتا ہے اور جس قدر یہ خاصیتیں اور ان کا علم کم ہو، خوف بھی اتنا ہی کم ہوگا۔ برے اسباب کے علم سے دل میں جو سوزش اور درد پیدا ہوتا ہے، وہ خوف ہے۔ خدا کا خوف اس کی

معرفت اوراس کی صفات کے علم سے پیدا ہوتا ہے۔احساس گناہ سے بھی خوف پیدا ہوتا ہے۔

کائنات کی ہر شے اپنے خواص اور قوت میں یکساں نہیں۔ ہر شے اپنے آپ میں اپنے خواص اور قوت میں محدود ہے۔اس لیے ان کا خوف بھی مطلق نہیں ہوتا۔ مطلق خوف کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذات جس کی وجہ سے یہ خوف پیدا ہو جائے مطلق قوت کی حامل اور کامل ہو۔لیکن ایسی کوئی شے ہے ہی نہیں، صرف اللہ کی ذات ہے جو اپنے آپ میں مطلق اور کامل ہے۔لہٰذا اس کا خوف بھی انتہائی شدید ہوگا اور یہ خوف صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک شخص کو اپنے نفس اور خدائے تعالیٰ کی کامل صفات کا علم ہو۔عرفانِ نفس اور خدا کی ذات وصفات کا علم، انسان کو گناہوں سے روکتا ہے اور یہی خوف اسے نیک اعمال کی طرف لے جاتا ہے۔انسان کے نیک اعمال، مراقبہ، محاسبہ اور مجاہدہ اسی قدر قوی ہوں گے جتنا قوی اور شدید خوف ہوگا۔اسی علم اور خوف کی وجہ سے انسان نہ صرف گناہوں سے رکتا ہے، بلکہ ان تمام اعمال سے بھی رک جاتا ہے جس میں حرمت کا امکان پیدا ہو جائے۔اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ورع حرام چیزوں سے باز رہنے کو کہتے ہیں۔شبہات کے خوف سے حلال چیزوں کو چھوڑ دینے کا نام صدق فی التقویٰ ہے اور دنیا سے التفات نہ کرنے اور اس سے علیحدہ ہونے کو صدق کہا جاتا ہے۔ یہ روحانی مراتب ہیں، جو خوف کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔غزالی نے خوف کی جو تطبیق اور درجہ بندی کی ہے اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے۔

(الف) ایسی شے کا علم جو بذاتہ خوف زدہ کرنے والی ہو جیسے درندوں کی صفات وقوت کا علم۔

(ب) اپنے اعمال اور گناہوں کا شعور یا معرفت اور نتیجتاً خدا کی ناراضی کا خوف۔

(ت) خدا سے مہجوری کا خوف۔

غزالی کے خیال میں تیسرا درجہ یعنی خدا سے مہجوری کا خوف صرف صادقین کو ہوتا ہے۔ انسان کے دل میں خدا کے خوف کی شدت و گہرائی اس کے علم و آگہی کے مرتبے کے مطابق ہوتی ہے۔خوف اس وقت مذموم اور ناپسندیدہ کیفیت اور عمل بن جاتا ہے جب اس کی شدت انسان کو اعمال صالحہ سے روک دے۔خوف کی اعلیٰ اور پسندیدہ قسم وہ ہے جس سے کمال معرفت پیدا ہو جائے۔غزالی کے خیال میں وہ خوف سب سے اعلیٰ ہے جس کا مصداق خدائے کریم ہے۔گناہ سے ڈرنا صالحین کا خوف ہے، لیکن خدا سے ڈرنا موحدین اور صدیقین کا خوف ہے اور یہ خوف

معرفت ذات الٰہی اور معرفت صفات الٰہی سے پیدا ہوتا ہے۔خوف کے مختلف احوال اور اس کی مختلف کیفیات اور درجے ہیں، لیکن سب سے اعلیٰ درجہ عارفین کا ہے جن کو خوف فراق یعنی خداتعالیٰ سے محجوب رہنے کا خوف ہو۔انسان کا منتہائے مطلوب سعادت یعنی رضا و دیدار خداوندی ہے۔ ہر شے کی فضیلت اس کے منتہائے مطلوب سے قربت سے ہے۔جو چیز اس کے حصول میں جتنی مددگار رہو وہ اتنی ہی افضل ہے۔خوف چونکہ شہوات کو جلاتا، گناہوں سے بچاتا اور اطاعت کی ترغیب دیتا ہے۔اس لیے یہ افضل بھی ہے اور مطلوب بھی۔اسی کی وجہ سے عفت، ورع، تقویٰ اور مجاہدہ حاصل ہوتے ہیں جو منتہائے مطلوب کے حصول میں مدد کرتے ہیں۔اہل جنت کے چار مقام ہیں، ہدایت، رحمت، علم اور رضا۔یہ چاروں مقام خائفین کے ہیں جس کا خوف الٰہی جتنا شدید ہوگا، اتنا ہی وہ اپنے ربّ کے قریب ہوگا۔اسی لیے ان کو علماء یعنی علم والے بھی کہا جاتا ہے۔کسی بھی مومن کا دل خوف سے خالی نہیں ہوتا۔خوف کی شدت، ایمان و معرفت کی شدت کو ظاہر کرتی ہے اور خوف کی کمی ایمان اور معرفت کی کمی کو ثابت کرتی ہے۔امن اور بے خوفی صرف ان کو حاصل ہوتی ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس کا دل نرم، محبت پختہ اور عقل درست ہو جاتی ہے۔خوف خدا کے ساتھ رجا کا ہونا لازمی ہے، کیونکہ رجا وہ حالت نفسی ہے جو انسان کو رحمت خداوندی کے قریب کر دیتی ہے۔رجا کا منبع خدا کی رحمت ہے جو محبت خداوندی کو پیدا کرتی اور جلا بخشتی ہے۔نہ تو مطلق رجا اچھی شے ہے اور نہ مطلق خوف۔دونوں کے درمیان تطبیق لازمی ہے۔خوف نیک اعمال کی ترغیب دیتا ہے اور رجا ان کے نتیجے میں خدائے قدوس کی رضا و دیدار کی اُمید ہے۔قرآن کی آیات کریمہ کے مطابق خدا کی رحمت سے نااُمیدی کافروں کا شیوہ ہے، اُمید دل کو تقویت دیتی ہے اور اللہ کی محبت کو دل میں راسخ کرتی ہے۔یوں خوف، رجا اور محبت ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔معرفت الٰہی کی بنیاد محبت الٰہی اور دنیا سے دوری ہے۔ان تینوں سے مختلف روحانی مراتب کا حصول ہوتا ہے۔مقام صبر خوف و رجا سے حاصل ہوتا ہے۔اس سے مقام مجاہدہ، ذکر الٰہی اور فکر دائمی کا حصول ہوتا ہے۔دوام ذکر سے انس اور دوام فکر سے کمال معرفت ملتی ہے اور کمال معرفت وانس سے محبت کا مقام ملتا ہے اور یہی سالک کو مقام رضا و توکل پر لے جاتے ہیں۔اس کے بعد کوئی مقام نہیں کیونکہ محبت کے لیے ضروری ہے

کہ محبوب کے فعل پر راضی رہے اور اس کی عنایت پر اعتماد رکھے۔ جبھی تو اس کا ہر عمل خدا کی مرضی کے مطابق اور اسی کا عمل بن جاتا ہے۔ خوف و رجا قلب انسانی سے تمام کثافتوں کو دور کرتے ہیں اور اسے معرفت ذات کے لیے تیار کرتے ہیں۔ رجا کا مرتبہ خوف سے بلند ہے، کیونکہ اس کا منبع خدا کی رحمت ہے۔ جبکہ خوف کا منبع خدا کی صفت غضب ہے۔ لہٰذا مرتبہ اس کا بلند ہے جو خدا کی محبت میں نہ کہ اس کے خوف سے اعمال صالحہ انجام دیتا ہے۔ رجا یا امید انسان کی محبت کو گہری اور مضبوط کرتی ہے اور اسے اس قابل بناتی ہے کہ اسے معرفت خداوندی حاصل ہو۔ اس لیے محبت سب سے بلند ہے، لیکن محبت محبوب کے خوف کو اپنے اندر پالتی ہے۔ کیونکہ عاشق کے لیے سب سے بڑا عذاب اس کے محبوب سے دوری کا خوف ہے۔ یوں خوف وہ مہمیز ہے جو اس کی محبت کو جلا بخشتی ہے اور اسے اس کے اور قریب کرتی ہے۔ تخلیق کائنات کو اللہ نے ایک با مقصد عمل بتایا ہے۔ کوئی کھیل یا لیلا نہیں۔ اس کائنات میں اللہ نے انسان کو سب سے معزز تخلیق بنایا۔ اللہ نے ان دونوں کے مقصد تخلیق کا بیان قرآن پاک میں کئی جگہ پر فرمایا۔ ان تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) یہ ساری تخلیق ایک مقصد کے تحت بنائی گئی، یہ کوئی کھیل نہیں۔

(۲) انسان کو اللہ نے سب سے اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ اسے عزت و شرف سے نوازا۔ اسے اپنا خلیفہ بنایا اور اسے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

(۳) ساری کائنات اس کا میدان عمل ہے۔ اس کی تسخیر اور اس کی حقیقت اور اسرار اور رموز کو سمجھنے کے لیے اسے علم عطا کیا۔

(۴) اسے حواس خمسہ، عقل، وجدان اور وحی کی قوتیں عطا کیں۔

(۵) ان ہی قوتوں کے جائز اور تخلیقی عمل اور استعمال کے ذریعے وہ اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

(۶) اللہ کے قرب کے معنی اس کی عبادت کے ذریعے اس کی رضا کا حصول ہے۔

(۷) اور عبادت کے معنی محض فرائض کی ادائیگی نہیں بلکہ اللہ، کائنات اور انسان کے حقوق کی فہم اور ان کی ادائیگی ہے۔

(۸) اور اس کے معنی ایک ایسے تہذیبی و انسانی نظام کی پرداخت اور اس کا نفاذ ہے، جسے اللہ نے اپنے پیغامبروں کے ذریعے بھیجا۔

(۹) یہ تعلیمات اقدار اعلیٰ کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کو تمام مخلوق میں احسن بناتی ہیں اور اسے اللہ کی صفات کی فہم عطا کرتی ہیں۔

(۱۰) ان تمام اعلیٰ اقدار کا سب سے اعلیٰ نمونہ اللہ کے آخری رسولؐ حضرت محمدؐ ہیں جنھیں رہتی دنیا تک انسان کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا۔

(۱۱) انسان کو آزادی کی قوت دی گئی تا کہ وہ اپنے اعمال انجام دے سکے۔

(۱۲) اسی آزادی اور اعمال کی بنیاد پر اسے قیامت کے دن اللہ کے سامنے حساب دینا ہوگا۔

(۱۳) اس کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار، رسول کی غیر مشروط اطاعت اور محبت پر ہے۔

(۱۴) اللہ کی رضا اسے دائمی کامیابی یعنی سعادت یا دیدار و قرب خداوندی اور ناکامی یعنی شقاوت یا خدا سے دوری یعنی عذاب خداوندی سے ہم کنار کردے گی۔

جنت وہ مقام ہے جہاں پہ اسے دیدار خداوندی ہوگا اور جہنم وہ جگہ ہے جہاں وہ ہمیشہ خدا کی ناراضگی اور اس سے مہجوری اور دوری کی آگ میں جلتا رہے گا اور اسے کبھی دیدار خداوندی نصیب نہیں ہوگا۔ صوفیہ کرام کی تمام تعلیمات کا نچوڑ اور مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے۔

تصوف کے ایک مکتبہ عملی وفکری کی حیثیت سے اس کی نشو ونما پر بحث ہمارے دائرہ کار سے خارج ہے۔ ہم صرف اس نقطے پر بحث کریں گے کہ ابتدائی صوفیہ علی الخصوص حضرت حسن بصری نے خوف کے تصور کو بنیادی فکری و عملی اصول کے طور پر آگے کیوں بڑھایا۔ اور اسے حجت الاسلام امام غزالی نے کیوں اسلام کے فلسفۂ اخلاق و تصوف کا ایک کلیدی اصول مان کر اس کی فلسفیانہ وفکری جہتوں کی تدوین و ترویج وتشریح کی اور اسے ایک کلی قضیہ کے طور پر پیش کیا۔

صوفیۂ کاملین نے ملت اسلامیہ کی صورت حال پر غور کیا اور امت مرحومہ کو خرابیِ حالات، ظالم و جابر بادشاہوں، فوجی قوتوں اور معاشی و سماجی استحصال کرنے والی قوتوں اور دین و مذہب کے جھوٹے ٹھیکیداروں اور علمائے سوء سے نجات دلانے کے لیے انھوں نے ''خوفِ خدا'' کا تصور و فلسفہ پیش کیا اور اسے اپنی تعلیمات و تبلیغ کے ذریعے دلوں میں بہت گہرا اتارنے کی کوششیں کیں کیونکہ خوف خدا کے سوا اب اور کوئی مزاحم قوت تھی ہی نہیں جو انسانیت کو ظالموں اور جابروں سے بچا سکتی۔ اس فلسفہ و تصور کو پیش کرنے والے پہلے صوفی حضرت حسن بصری تھے، جن کی مذہب، فقہ، تفسیر، سیاست، حدیث اور امت کے تمام حالات پر گہری نظر تھی۔ ان کی بے باک آواز جبر کے

فلسفہ کے رد میں اٹھی اور ان کے دردمند دل نے انسانیت کو بچانے اور اسے خدا کے نزدیک لانے اور اس سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے لیے 'خوف' کا تصور پیش کیا۔ یوں اسلامی تصوف اور روحانیت جبر کے خلاف ایک منظم آواز تھی اور اس کا مقصد انسانوں کو تمام استحصالی قوتوں سے آزاد کر کے خدا سے اس کا تعلق قائم کرنا تھا۔ جبر جملہ، اخلاقی، روحانی، سماجی، سیاسی بگاڑ، تشدد اور مطلق العنان حکمرانی اور استحصال کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک غیر اخلاقی، غیر جمہوری، غیر اسلامی اور ظالمانہ رویہ ہے جو زندگی کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور انسان سے اس کی اخلاقیت، عظمت و وقار و شرف اور آزادی کو چھین کر اسے بہت ہی غلیظ و ادنی سطح پر گرا دیتا ہے۔ جبر کی ہر شکل میں فساد و مفاد کی ترجمان ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خوفِ خدا کے سوا اب کوئی اور چیز بچی ہی نہ تھی جو انسانی قلوب اور نفسیات کو بدل سکتی۔ خوف کے اس تصور اور فلسفے کی بنیاد قرآن پاک کی آیات بینات ہی تھیں۔ قرآن پاک نے بار بار انسانی نفسیاتی کو تبدیل کرنے کے لیے 'خوف' کا تصور پیش کیا۔ اس خوف کی انتہا خدا کی ناراضگی اور اس سے دوری و مہجوری ہے۔ انسان کی عارضی زندگی، جس کے بعد اسے سوائے ذلت و رسوائی کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں، اگر وہ برائیوں سے نہ بچا اور ان سے توبہ نہ کی۔ دائمی رسوائی و عذاب کا خوف بجائے خود ایک ایسی مزاحم قوت ہے جو بڑے بڑے جابروں کے دلوں کو بدل دیتی ہے، سوائے ان کے جن کے قلوب پر اللہ نے سیاہی و بد نصیبی کی مہر کر دی۔

حضرت حسن بصری نے 'خوف' کی تبلیغ کر کے انسانی دلوں کو جھنجھوڑ دیا، انھیں اس عارضی دنیا اور یہاں کی عیاشیوں اور مظالم کی حقیقت سمجھا دی اور انھیں یہ بتا دیا کہ اگر وہ اس سے نہ ہٹے تو دائمی تباہی و ذلت ان کا انتظار کر رہی ہے۔

خوف انسانی سماج کے تانے بانے کو قائم رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ حکومت کا خوف، قانون کا خوف، سزا کا خوف، ماں باپ کا خوف وغیرہ، اگر خوف کی یہ مزاحم قوت یا تصور نہ ہو تو شاید انسانی سماج اور وجود بکھر کے رہ جائے۔ یہ تمام خوف تو عارضی اور کم پایہ ہیں اور یہ کسی شخص کو دائمی زندگی کی رسوائی سے نہیں ڈرا سکتے اور نہ کسی ایسے ظالم و جابر کا ہاتھ روک سکتے ہیں، جو خود ایک جھوٹا اور خود ساختہ قانون ہوتا ہے اور جس کی ہر بات حتمی ہوتی ہے۔ اس لیے ایک ایسے ''خوف'' کی ضرورت ہے جو ان تمام قوتوں سے بڑھ کر ہو اور یہ خوف ایک ایسی ذات ہی کا ہو سکتا ہے جو تمام

کائنات کی خالق و مالک وحکمران ہے، جسے ذرے ذرے کی دھڑکنوں کا علم ہے اور جس کی گرفت سے کوئی نہ بچ سکے۔ یہی خدا کا خوف ہے۔ لیکن خدا کے خوف میں ایک بہت قیمتی موتی پوشیدہ ہے وہ ہے خدا کی ربوبیت ورحیمیت کا احساس، جسے محبت کہہ سکتے ہیں۔ انسان خدا کی محبت میں ہر شے سے خوف کھاتا ہے تا کہ خدا اس سے ناراض نہ ہو جائے اور وہ اس سے دور نہ جا پڑے اور یوں ایک دائمی مہجوری وذلت کا شکار نہ بن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن بصری اپنے زمانے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ''محبت'' کے تصور کو سامنے نہیں لائے۔ ورنہ وہ تو ہر عظیم صوفی کی طرح اس سے واقف بھی تھے اور سرشار بھی۔ یہ کام اس عظیم صوفیہ نے کیا، جس کے مرتبہ کی دوسری ولیہ عالم اسلام آج تک پیدا نہ کرسکا۔ یہ تھیں جناب رابعہ بصری، جس نے خوف ولالچ سے مبرا ومنزہ ''محبت خداوندی'' کے تصور کو پیش کیا، آپ نے فرمایا کہ خدا ہی محبت کے لائق ہے اور میں اس کی عبادت اس کی محبت میں کرتی ہوں نہ کہ جنت کی لالچ یا جہنم کے خوف سے۔ یہ تو پاکیزگی قلب اور محبت کی انتہا ہے لیکن عام انسانیت کی نفسیات بدلنے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اس کے دل میں خوف ومحبت کو بسا دیا جائے اور کبھی خوف کے تصور کو آگے بڑھا دیا جائے اور کبھی محبت کے تصور کو۔ ورنہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جاہل صوفیہ کی طرح وہ محبت کا کوئی ایسا کھیل رچائے جو اُسے خدا اور اس کی محبت سے ہی دور کر دے۔ انسانی نفسیات اور اعمال کو بدلنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو اس پر خوف مسلط کر دیا جائے اور اسے طاقت کے ذریعے دبا دیا جائے یا غلط اعمال وحرکات سے رکنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ یا اس کے دل میں اچھے کاموں، اصولوں اور شخصیات کی محبت پیدا کی جائے، تا کہ وہ برے اعمال سے دور رہے۔

یہی کام صوفیۂ کرام نے کیا۔ انھوں نے خوف کا تصور پیش کیا، اس کی تبلیغ کی اور قلوب و اذہان میں خوف ڈال دیا اور یوں انھیں برائیوں سے اجتناب کرنے پر مجبور کیا اور جب ان کی عادتیں بدل گئیں اور ان کی نفسیات میں ایک مضبوط تبدیلی آگئی تو اس میں محبت کے بیج بو دیے تا کہ وہ محض خوف سے دبے نہ رہیں، بلکہ اس ذات عظیم وکریم کی محبت میں اس کا قرب بھی حاصل کریں اور تمام برائیوں سے اجتناب بھی کریں۔

انسانی نفسیات کا ایک لازمی پہلو یہ ہے کہ جب انسان کسی سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کی مرضی کے خلاف جانے کی سوچ بھی نہیں پاتا، چہ جائے کہ اس سے دوری ومہجوری کو

برداشت کرلے۔صوفیہ کے فلسفہ وتعلیمات میں یہ دونوں تصورات پہلو بہ پہلو چلتے رہے لیکن ان کی مربوط ومضبوط فکری بنیاد، تحلیل اور توضیح وتشریح، امام غزالی نے اپنی عظیم کتاب احیاء علوم الدین میں پیش کی۔آپ نے ان دونوں اصولوں کو صرف مزاحم قوتوں کے طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ انھیں مابعدالطبیعیاتی، مذہبی، سماجی، اخلاقی، روحانی اور علمی اصولوں کی حیثیت سے وسیع فلسفیانہ تناظرات میں پیش کیا۔آپ کے بعد تمام آنے والے صوفیہ وحکماء کی تعلیمات میں غزالی کا تتبع واضح نظر آتا ہے اور اس حقیقت سے کسی صوفی نے انکار بھی نہیں کیا۔غزالی کی عظمت اور جملہ فلاسفہ پر اس کی فوقیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اس نے جملہ نظریات وتصورات کو پیش کرنے، ان کی صحیح تصویر کشی اور ان کی توضیح وتشریح کے لیے واضح علمی بنیادیں یا علمیاتی طریقہ کار اور ڈھانچا فراہم کیا۔ہر تصور کو علمیات کے چوکھٹے میں ڈالا اور اس کی علمیاتی بنیادیں تشکیل دیں اور حدود واضح کیے۔

یوں اس کی مابعدالطبیعیات، سماجیات اور اخلاقیات اور روحانیت کی بنیادیں علمیات میں پیوستہ ہیں :راس سے ہٹ کر ان کی تشریح وتوضیح ایک منطقی وفلسفیانہ مغالطہ سازی ہوگی۔

غزالی نے خوف ورجا کو ایک عنوان کے تحت لا کر ان کے تعلق اور کوائف کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ خوف کی حقیقت، حدود اور نتائج پر بھرپور بحث کی ہے۔یہ ساری بحث فلسفیانہ سے زیادہ نفسیاتی اور علمیاتی ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا فلسفہ خوف وجودیین کے فلسفہ خوف سے زیادہ مربوط، منظّم، واضح اور بصیرت افروز ہے اور اس حیثیت سے کہ اس نے خوف کو مستقبل سے جوڑ دیا ہے اور اس کی مابعدالطبیعیاتی بنیادوں اور تعلقات کو واضح کیا ہے۔وہ بہت ہی ارفع فلسفیانہ طرازی سے وجودیین سے سبقت لے گئے ہیں۔خوف کی اس علمیات کی بنیاد قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور حدیث مبارکہ ہیں، جن کا حوالہ بار بار غزالی نے خوف پر بحث میں دیا ہے۔غزالی نے رجا کے ساتھ خوف کو مربوط کر دیا اور اس کی بنیاد بھی قرآن پاک کی آیات ہیں، جن میں اللہ کی رحمت سے ناامیدی سے منع کیا گیا ہے۔کسی بھی شے یا کیفیت کا ادراک وحصول علم کے بغیر ناممکن ہے خوف ورجا کے وجود یا ان کے کوائف کا ادراک بھی علم کے بغیر ناممکن ہے۔

خوف کسی شے کی مختلف کیفیات، حالات اور قوتوں اور ان کے مطلوبہ نتائج کے علم سے پیدا ہوتا ہے۔جیسے ایک شخص جانتا ہے کہ آگ جلاتی ہے، زہر مارتا ہے، زلزلہ زمین کو ہلا دیتا ہے،

پانی ڈبو دیتا ہے وغیرہ وغیرہ، اسی لیے وہ ان سے خوف کھاتا ہے۔ کسی مخبوط الحواس شخص یا بہت ہی چھوٹے بچے کو کسی شے کا خوف ہی نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اشیاء کے خواص سے واقف نہیں ہوتے۔ خوف کی پہلی شرط حواس و عقل کا قائم ہونا اور دوسری شرط اشیاء کے خواص کا علم ہے۔ ہم جس ان دیکھے اور مختلف الجہت خوف کو کبھی کبھی محسوس کرتے ہیں، وہ بھی ہمارے حواس اور عقل و فہم کے مختلف ادراکات کی کارفرمائی کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارا ذہن مختلف حالات اور صورتوں کو ملا کر ایک نئی کیفیت یا کیفیات کی شکلیں ترتیب دیتا ہے یا ان کا تصور کرتا ہے لیکن محض تصور ہی کسی خوف کی وجہ نہیں بنتا، بلکہ اس کے پیچھے مختلف حالات و کیفیات اور عوامل و عوالم خوف کی وجہ بن جاتے ہیں۔

تصوف کی نظریاتی تشکیل میں حضرت رابعہ بصری کو ایک کلیدی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ ان نظریات اور عقائد سے ہوسکتا ہے جن کے حوالے ابو طالب مکی، القشیری اور امام غزالی ایسے صوفیہ و مفکرین نے اپنی تحریروں میں دیے ہیں۔

تصوف تطہیر قلب و نفس اور زہد ہے۔ اس راہ میں مختلف مقامات آتے ہیں۔ تمام خواہشات اور گناہوں کو مٹانے کے بعد سالک مختلف مقامات و احوال سے گزرتا ہے۔ یہ روحانی ارتقا کی ایک طویل اور مشکل داستان ہے جس کی انتہا معرفت الٰہی ہے۔ ان مقامات و احوال پر ابو طالب مکی نے رسالہ قشیریہ اور امام غزالی نے احیاء میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ توبہ اس کی ابتدا اور رضا اس کی انتہا ہے۔ صبر، شکر، فقر، زہد، توحید، توکل، محبت اور رضا اس کے مختلف مقامات ہیں۔ کچھ صوفیہ بشمول غزالی نے فکر، ذکر، مراقبہ اور احتساب نفس کو بھی ان مقامات میں شامل کیا ہے۔ محبت الٰہی ان مقامات کی انتہا اور مغز ہے۔ محبت میں سالک خدا کے سوا ہر شے اور ہر حال و مقام کو بھلا دیتا ہے اور یوں خدا ہی اس کے ہر عمل کی ابتدا اور انتہا بن جاتا ہے۔ توبہ کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہر شے سے منہ موڑ کر خدا سے لو لگائی جائے۔ حسن بصری اور رابعہ بصری کو گناہوں کے نتائج کا شدید احساس تھا اسی لیے ان کی تعلیمات میں توبہ کو ایک بنیادی مقام حاصل ہے۔ رابعہ کے بارے میں عطاء کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ مغموم اور گریہ کی حالت میں ہوتی تھی اور جب اس سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو اس نے جواب دیا کہ میں اس چیز سے ڈرتی ہوں کہ میں اس سے الگ اور دور نہ جا پڑوں جس سے میں بندھی ہوئی ہوں اور وقت مرگ کہیں یہ آواز نہ آئے کہ میں کسی لائق نہیں۔

محبت کا یہی تصور توبہ، توجہ اور خوف سے مربوط ہے، گناہ ہر وہ عمل ہے جو بندے کو خدا سے الگ کر دے، جو روح اور اس کے محبوب (یعنی خدا) میں تفریق ڈال دے۔ رابعہ اسی لیے گناہ سے نفرت کرتی تھی کہ یہ اسے خدا سے دور کرتا ہے، نہ کہ اس لیے کہ اس پر سزا دی جائے گی۔ ایک سالک یا معشوق کے لیے اس سے بڑی سزا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا عاشق اس سے نظریں پھیر لے اور اسے اپنے سے الگ اور دور کر دے۔ توبہ اس کے خیال میں عنایت خدا یا اس کا تحفہ ہے، نہ کہ کوئی ایسی شے جو انسان اپنی محنت سے حاصل کر سکے، ہر انعام اور ہر کمال اسی کی عطا ہے۔ یہی معاملہ شکر کا بھی ہے۔ رابعہ کی زبان پر ہر وقت اللہ کا شکر ہوتا تھا اور شکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہر حال میں اس کا شکر ادا کیا جائے۔ خوف اور مصائب و آلام سے شکر کی کیفیت اور زیادہ مستحکم ہونی چاہیے کیونکہ یہ بھی اسی کے عطا کردہ ہیں۔ خوف اور رجا ایمان کی دو بنیادیں اور ایمان کی عمارت کے ستون ہیں۔ ہجویری کے خیال میں سالک جو خدا سے ڈرتا ہے وہ محض اس وجہ سے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ خدا سے دور نہ جا پڑے رجو اس کی عبادت کرتے ہیں اور امید لگائے رہتے ہیں ان کی آرزو اس سے اتحاد ہے۔ ابو علی رودباری کا خیال ہے کہ خوف اور رضا ایک پرندے (سالک) کے دو پر ہیں۔ اگر ان میں ایک ٹوٹ جائے تو پرندہ گر جاتا ہے اور اڑنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور اگر دونوں ٹوٹ جائیں تو وہ مر جاتا ہے۔ خوف کے معنی یہ ہیں کہ خوفِ خدا سالک کے نفس کو ہر شے اور ہر خوف سے آزاد کر دے۔ ایک صوفی کا قول ہے کہ خدا سے ڈرنے والا مجسم خوف بن جاتا ہے۔ ہر شے اسے ڈراتی ہے، لیکن یہ خوف اسے برباد نہیں کرتا بلکہ یہ اس کے قلب کا تزکیہ کر کے اسے اس کے خالق و مالک و محبوب کی رضا و قرب عطا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جسے کوئی آگ جلا نہیں سکتی۔ خوف حکمت کی روح ہے اور حکیم وہ ہے جو حکیم میں مل جائے نہ کہ اس سے دور جا پڑے۔ امام غزالی نے بھی خوف کو مہمیز قرار دیا جو سالک کو جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ خوف خدا کا ایک عطیہ ہے جس کا ارشاد ہے کہ سالک اس سے ڈریں۔ یہ روح کو جلا بخشتا ہے کیونکہ یہ خدا کی صفت عدل پر فکر کا نتیجہ ہے۔

خوف، امید اور محبت ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ محبت خوف کے بغیر خالص اور مکمل نہیں اور نہ خوف امید کے بغیر اور نہ امید خوف کے بغیر۔ خوف اور امید صوفیہ کی معادی تعلیمات اور تصور جنت و جہنم سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں جہنم ایک دار العذاب کے بجائے

خدا سے دوری اور جدائی ہے اور جنت جائے مسرت کے بجائے دیدار خداوندی اور اس کے ساتھ اتصال کا نام ہے۔

رابعہ بصری کی تعلیمات میں خوف کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے چالیس سال عظمت خدا کے احترام میں آسمان کی طرف آنکھیں نہیں اٹھائیں۔ اکثر یہ فرمایا کرتیں کہ جب میں اذان کی آواز سنتی ہوں مجھے روز محشر کی آواز یاد آتی ہے اور جب برف دیکھتی ہوں تو مجھے نامۂ اعمال کے اوراق سرسراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔خوف اور محبت کے متعلق اس کی تعلیمات کا نچوڑ ہے کہ جہنم کے خوف سے یا جنت کی امید میں خدا کی عبادت اولیاء کے لیے بے معنی عمل ہے۔اس کے خیال میں صرف خدا کی مکرم اور تقدیس مآب ذات اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔تمام امیدوں کا مرکز بھی اسی کی ذات اقدس ہے۔اس کے خیال میں جنت حسی مسرتوں کے حصول کی جگہ نہیں بلکہ یہ خدا کے دیدار کی حالت ہے۔جب اس سے جنت کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے کہا پہلے ہمسایہ، یعنی حدا اس کے بعد رہنے کی جگہ۔امام غزالی کے مطابق اس کے دل میں محبت خدا کے سوا کسی چیز کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔اس کی تعلیمات کا نچوڑ خدا کی بے لوث محبت ہے اور بے لوث محبت کے معنی ہیں مکمل خود سپردگی۔ کیونکہ خود سپردگی نہ ہو تو محبت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔جو شخص محبت کرتا ہے وہ اپنے محبوب سے محبت کے لیے شرائط طے نہیں کرتا، بلکہ اس کے رنگ میں رنگ جانا چاہتا ہے۔اس کی کسی بات یا حکم سے انحراف کرنے کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آسکتا،اس کے لیے اس کے محبوب کے سوا سب کچھ بے کار و بے معنی ہے۔

یہی حقیقت ''زہد'' سے بھی سامنے آتی ہے۔زہد انسان کو اللہ کے قریب لے جاتا ہے۔ پاکیزگی انسان کو زہد کی طرف لے جاتی ہے اور زہد محبت خدا کی طرف۔القشیری نے زہد کے معنی ہر اس شے کو جو روح کو خدا سے الگ کر دے، بیان کیے ہیں۔حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ زہد دنیا اور اس کی ہر شے سے نفرت ہے۔امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ زہد کی تین قسمیں ہیں

(الف) حرام کو چھوڑ دینا (ب) حلال کو چھوڑ دینا (ج) اور ہر اس شے کو خدا کے لیے چھوڑ دینا جو روح کو خدا سے دور کر دے۔ترکِ دنیا توحید کی متقاضی ہے۔ کیونکہ خدا کے بغیر کسی بھی شے کو حقیقی ماننا یا اسے دل میں جگہ دینا ہی شرک ہے جو سب سے بڑا گناہ ہے۔توحید کے

معنی محض خدا کو ایک ماننے کے نہیں ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک توحید کے معنی اپنی ذات اور مرضی کو خدا کی مرضی میں گم کر دینا ہے۔ یہی محبت بھی ہے، کیونکہ ہر عاشق اپنی مرضی کو معشوق کی مرضی میں ڈھال دیتا ہے اور اس کا ہر عمل وہی ہوتا ہے جو محبوب چاہتا ہے اور یہی توبہ کی روح ہے کیونکہ سالک اس کے ذریعے اپنے قلب سے ہر شے کو مٹا دیتا ہے۔ طہارت کے معنی بھی یہی ہیں کہ انسان اپنے جسم اور روح سے ہر گندگی کو دور کر دے۔ اور وہ لوگ جن کے جسم اور دل نجاست سے آلودہ ہیں، وہ توحید، زہد، توبہ اور خوف و محبت خدا سے محروم ہیں۔ اسی لیے اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔

یہی حقیقت توکل ہے۔ اسی لیے صوفی توکل کو توحید کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ یہی حضرت رابعہ بصری کی زندگی اور تعلیمات کی اصل ہے۔ اس نے دنیا کو مکمل طور پر تج دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ انتہائی حقیر ہے۔ سفیان نے جب اس سے پوچھا کہ خدا سے قربت کے لیے کیا عمل کیا جائے۔ اس نے فرمایا کہ دونوں جہانوں سے کنارہ کش ہو کر خدا کے ہو جاؤ۔ اس نے فرمایا کہ اگر ساری دنیا کی دولت ایک انسان کو دی جائے جب بھی وہ دولت مند نہیں، کیونکہ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ خدا کی محبت میں وہ اس بات سے بھی خائف تھی کہ اس کا شہرہ بزرگ یا ولیہ کی حیثیت سے ہو جائے، کیونکہ اس سے اس کے دل میں خدا کے سوا یہ دوسری شے بھی سما جائے گی۔ وہ فرماتی تھیں کہ اپنی نیکیوں کو برائیوں کی طرح چھپا دو ورنہ یہ تمھارے دل کو آلودہ کر دیں گی۔ یہی حقیقی محبت ہے اور اس کی انتہا خدا کی ذات سے اتصال ہے۔ اسی لیے صوفیہ کے نزدیک محبت سب مقامات میں سے انتہا درجے کی غایت اور سب میں بلند مرتبے کی حامل ہے۔ باقی سب مقامات اس کے مقدمات ہیں۔ محبت ہی شرط ایمان ہے اور محبت ہی انتہائے ایمان۔ اسی لیے ہرم بن حیان نے فرمایا کہ صاحب ایمان جب اپنے ربّ کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے اور جب محبت کرتا ہے تو اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جب اس توجہ کا مزہ پاتا ہے تو دنیا کی طرف خواہش کی نظر سے نہیں دیکھتا نہ آخرت کی طرف کاہلی کی نظر سے۔ اپنے جسم سے تو دنیا میں رہتا ہے اور روح سے آخرت میں۔ اسی لیے حضرت رابعہ بصری نے ایمان کو خدا کی بے لوث محبت سے مشروط کر دیا۔ جب آپ سے جنت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا الجار ثم الدار، یعنی اول صاحب خانہ پھر خانہ۔ یعنی میری محبت مالکِ جنت سے ہے جنت سے نہیں اور مالکِ جنت سے

محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے سوا ہر شے دل سے معدوم ہو جائے۔ یہ خوف کی وہ باریک شکل ہے جو محبت کی روح ہے۔

تصوف کے نظری ارتقا پہ بہت ہی سنجیدگی، متانت، غیر جانبداری اور گہرائی سے غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اسلام کی روحانی تعلیمات کے تحفظ، انسانیت کے بقا اور جبر کے خلاف ایک مربوط آواز تھی اور تمام حقیقی صوفیہ کی انسانی تاریخ اور نفسیات پر بہت ہی گہری نظر تھی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صوفی نفسیات کی جڑیں قرآن اور سنت نبوی میں بہت گہرے طور پر جڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے انسانی نفسیات کو سمجھنے اور برتنے اور اسے صحیح نہج پر ڈالنے کے لیے جو بھی رویہ اختیار کیا وہ قرآنی تعلیمات اور سنت نبوی سے مربوط ہے۔

حضرت حسن بصری نے خوف کی نفسیات اور حضرت رابعہ بصری نے محبت کی نفسیات کو پیش کیا اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ خوف کی بنیاد ہمیشہ محبت میں پیوستہ ہوتی ہے اور محبت ہمیشہ خوف کو پیدا کرتی ہے اور اسے بڑھاوا دیتی ہے۔

اس زمانے کی اسلامی دنیا کے سیاسی وسماجی حالات، تہذیبی رفتار اور اس کی تنظیم واقدار جو اسلام کی روح اور اساسی اصولوں سے بہت دور جا پڑے تھے میں ایک مثبت اور حرکی تبدیلی کے لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اسلامی فلسفۂ حیات، اس کی اقدار اور تصورات کی ازسرنو ایک زندہ فلسفیانہ اور نفسیاتی توجیہ وتشریح کی جائے، تاکہ اسلامی تہذیب کو اس تباہی سے بچایا جا سکے جو مسلمان حکمرانوں اور امت کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھی اور جرائم ومظالم کی اس لمبی اور تاریک داستان پر قدغن لگائی جا سکے، جو عذاب الٰہی کو دعوت دے رہی تھی۔

اس عظیم کام کا سہرا حسن بصری کے سر ہے، جنھوں نے اسلامی دنیا کے حکمرانوں اور ان کے کارندوں کو جو اپنے حقیر سیاسی ومعاشی مفادات کے حصول کے لیے انسانیت اور اسلامی اقدار کو روندرہے تھے اور فلسفۂ جبر جس کی تبلیغ کے ذریعے وہ اپنے جرائم کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، کو روکنے کے لیے، اللہ کے خوف کا تصور پیش کیا تا کہ اس کے ذریعے ان کی روح کو جھنجھوڑا جا سکے اور انھیں ان کی بداعمالیوں سے بچایا جا سکے۔

حضرت رابعہ بصری کا کردار اس حیثیت سے بڑا اہم ہے کہ انھوں نے محبت کے تصور کو

پیش کر کے، خوف کی نفسیات کو نئی زندگی، گہرائی اور جہتیں عطا کیں۔ کیونکہ یہ محبت ہی ہے جو ابراہیمؑ کو آگ میں کودنے، محمدؐ کو بدر میں جانے اور حسینؓ کو اپنے اہل بیت کے ساتھ کربلا میں اتار دیتی ہے۔ محض خوف انسان کو حتمی اقدامات اٹھانے پر مجبور نہیں کرتا لیکن جس خوف کی جڑیں محبت الٰہی میں پیوستہ ہوتی ہیں وہ محبت کی ایک نئی، قوی اور مثبت شکل ہوتی ہے۔ بقول اقبال:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

صوفیہ کی انسانی نفسیات پر بڑی ہی گہری نظر تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ انسانوں کے قلوب کی تسخیر نہ کرتے۔ کیونکہ ایک انسان کو بڑے مقصد کے حصول کے لیے جد و جہد کے لیے تیار کرنا، اسے تمام برائیوں سے روکنا اور نیکیوں کی طرف راغب کرنا کسی ایسے شخص کے لیے ممکن ہی نہیں جس کی انسانی نفسیات اور زمانے کے حالات پر گہری نظر نہ ہو اور جو انھیں اپنے نظریات کے مطابق ڈھال نہ سکے۔

تصوف کے بنیادی تصورات میں خوف اور محبت کو ایک کلیدی اور اساسی اہمیت حاصل ہے۔ یہ تصورات حضرت حسن بصری اور حضرت رابعہ بصری جیسی عبقری شخصیات نے پیش کیے۔ ان کو یوں ہی نہیں لیا جا سکتا جیسا کہ اب تک کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تصورات کی اپنی دینیاتی، الٰہیاتی، مابعد الطبیعی، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی اہمیت ہے۔ ان کا تعلق انسان کی بنیادی نفسیات سے بھی ہے اور نفسیاتی کوائف و عوالم سے بھی۔ ان تصورات کو سطحی طور پر دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام غزالی کی محبت اور خوف سے متعلق فلسفیانہ آراء پر اب تک گہرائی سے غور ہی نہیں ہوا۔

ان دونوں تصورات کی جڑیں کلام الٰہی اور حدیث نبوی میں پیوستہ ہیں۔ کلام پاک کا سارا ابتدائی یا مکی حصہ خوف اور مدنی دور کا محبت اور خوف کے تصور کو نہ صرف ایمان اور دین کی بنیاد بنا کر پیش کر رہا ہے، بلکہ انھیں انسان کی دونوں جہانوں میں کامیابی کی شرائط کے طور پر سامنے لا رہا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ تصورات محض فرد یا انفرادی زندگی کی تطہیر و تزئین نہیں کرتے بلکہ اس کی پوری مدنی زندگی کو آراستہ اور ایک فلاحی اور تخلیقی تہذیب کی صورت گری کرتے ہیں اور اس طرح اس کے خدا کا حقیقی خلیفہ بننے کی راہ استوار و متعین کر دیتے ہیں۔ ☆☆

☆ ............ڈاکٹر نذیر احمد علائی

# کشمیری زبان میں قرآنی الفاظ کا استعمال

قرآنِ حکیم کی زبان ایک مبارک زبان ہے جس مہینے میں نازل ہوئی وہ بھی بابرکت ہے، جس رات میں نازل ہوئی وہ بھی بابرکت ہے اور جس نبی ﷺ کو اس زبان و کلام سے نوازا گیا وہ بھی بابرکت ہے۔ یہ خوش قسمتی ہے، کہ اس زبان و کلام کا بیان یعنی اس کی توضیح بھی ربِّ کائنات نے اپنے ذمہ لے لی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۔ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۔ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (قیامہ:۱۶تا۱۹)

(اے نبی ﷺ اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اس کو یاد کرادینا اور پڑھوادینا ہمارے ذمّہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمّہ ہے۔)

## زبانوں میں مستعار الفاظ کی حقیقت:

زبانوں کی باہمی اتصال و تعلق، آپسی ربط و اتصال کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں۔

ا۔ نوآبادیات کا قیام جیسے دولتِ مشترکہ کے تمام ممالک کی زبانیں انگریزی زبان سے

متاثر ہوئی ہیں۔

۲۔ دو الگ الگ بولنے والے قوموں کا ایک دوسرے کے پڑوس میں ہونا، جس کی مثال فارسی کا عربی زبان سے متاثر ہونا۔

۳۔ دو قوموں کے مابین طویل جنگ، جیسے نارمن (Norman) فتوحات کے دوران فرانسیسی اور انگریزی کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا۔

۴۔ دو قوموں کے درمیان تہذیبی اور تجارتی تعلقات، مثلاً عربی اور دوسرے مختلف ہندوستانی زبانوں کے درمیان تاثرات کا تبادلہ۔

معلوم ہوتا ہے، کہ زبانوں کا یہ تبادلہ الفاظ، محاوروں، سوابق، لواحق یعنی (Prefix,Suffix) اصوات، ان کے اسالیب، نحوی وصرفی قواعد کے درمیان ہوسکتا ہے، مگر یہ عموماً الفاظ ومفردات کے لین دین تک ہی محدود رہتا ہے، دوسرے لسانی مظاہر کا تبادلہ شاذ ونادر ہی ہوتا ہے، جیسا کہ مشہور عربی لسانیات ڈاکٹر عبدالواحد وافی لکھتے ہیں کہ:

> ''زبانوں کے درمیان اُخذ وعطا بنیادی طور پر مفردات ہی میں ہوتا ہے..... رہے قواعد، اسالیب، اصوات، تو یہ عام طور پر ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل نہیں ہوتے ہیں۔ ایسا صرف اس حالت میں ممکن ہے کہ جب دو زبانوں کے مابین ایک زمانے تک کشمکش جاری رہے۔ مگر اس صورت میں، ان مظاہر کا ایک زبان سے دوسری زبان کی طرف انتقال، منقول الیہ زبان کے قُربِ زوال کی علامت ہوتا ہے۔''[۱]

کیونکہ کسی بھی زبان میں موجود مستعار الفاظ اور انہیں پیش آنے والے تغیّرات کا مطالعہ بڑی تاریخی اور علمی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ زبان سماج کا ایسا آئینہ ہوتی ہے، جس میں تمام سماجی تغیّرات منعکس ہوتے ہیں، کیونکہ زبانیں اپنی پیدائش وارتقاء میں ایک ثابت شدہ نظام کی تابع ہوتی ہیں، جس کا سماج اور اس کے تغیّرات سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے، بقولِ میکس مولر

> ''ہم انسانی زبانوں کی تاریخ میں جو تغیّرات دیکھتے ہیں وہ محض اتفاقات پر مبنی نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ان کے پس پشت کچھ مستحکم قوانین اور

مخصوص اصول کارفرما ہوتے ہیں۔''[۲]

اس طرح زندگی کے کسی بھی مظہر کی طرح زبان بھی ہمہ وقت تغیّر پزیر ہوتی ہے، یعنی زمان ومکان، جغرافیائی اور معاشی احوال، طرزِ حیات اور بودوباش کے معمولی اختلافات زبان کو متاثر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی زبان کچھ عرصے میں مختلف لہجوں اور بولیوں میں بدل جاتی ہے، عربی زبان وادب کے معروف قدیم عالم اِصمعی کی روایت ہے کہ:

دو شخص لفظِ ''صقر'' (باز) میں اختلاف کر بیٹھے، ایک کی رائے تھی کہ یہ لفظ ''س'' سے ہے جب کہ دوسرے کا اصرار تھا کہ یہ ''ص'' سے ہے کافی دیر تک جب دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے، تو یہ طے کیا کہ جو بھی پہلا آدمی یہاں آئے گا اسے ثالث بنالیا جائے گا، دونوں اس پر راضی ہو گیے، تھوڑی دیر بعد ادھر سے ایک آدمی کا گزر ہوا، تو انھوں نے اس کے سامنے اپنا قضیہ رکھا۔ ثالث کہنے لگا کہ آپ دونوں کی بات غلط ہے، یہ لفظ اصل میں ''زقر'' ہے۔[۳]

اس طرح تغیّر اور بدلاؤ کا یہ عمل اس وقت تیز تر ہو جاتا ہے، جب کوئی لفظ ایک زبان سے نکل کر دوسری زبان میں داخل ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت تغیر کے کچھ مزید وجوہات کارفرما ہو جاتے ہیں، جن میں سے سرفہرست اور اہم ترین دونوں زبانوں کے بولنے والوں کے اِعضاءِ نطق وکلام کا اختلاف ہے، یعنی ان مستعار الفاظ میں، ان میں ہونے والے لفظی اور معنوی تغیرات کے ذریعے متعدد علمی، لسانی، اَدبی، تاریخی اور سماجی حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے:

۱۔ دوزبانوں کے مابین الفاظ کا یہ تبادلہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے بولنے والوں کے درمیان تاریخ کے کسی نہ کسی مرحلے میں تعلقات رہے ہیں۔

۲۔ ان سے ہمیں تعلقات کی نوعیت کا بھی پتہ چلتا ہے یعنی کہ یہ تعلقات دینی تھے، یا معاشی، علمی تھے یا سیاسی وغیرہ۔

۳۔ ان مستعار الفاظ کے ذریعے انسانی تہذیبوں کے پھیلاؤ اور ان کی تقسیم در تقسیم کا پتہ چلتا ہے ۔ ر ماضی بعید میں انسانی نسلوں اور قوموں کے درمیان جغرافیائی اور تمدنی روابط کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔

۴۔ ان الفاظ سے دوقوموں کے مابین لسانی تأثیر وتأثر کی حقیقت وماہیت کے ساتھ اس کی نوعیت و

کیفیت کو بھی معلوم کیا جاسکتا ہے، علاوہ ازیں اس تأثیر کی جہات اور اس کے میدانوں کو بھی متعین کیا جاسکتا ہے، جس سے یہ پتہ چل سکتا ہے، کہ فلاں قوم فلاں علمی یا فنی میدان میں فوقیت و مہارت رکھتی تھی۔

۵۔ان الفاظ سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بہت سی تحقیقی و علمی اور فنی ایجادات کب اور کیسے ہوئیں اور ان کا سہرا کس قوم کے سر جاتا ہے۔[۲۱]

## قرآنی ادب کا مختصر تعارف:

قرآن کریم عربی زبان و ادب کی کسوٹی کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام زبانوں اور ادب کی بھی کسوٹی ہے۔ قرآنِ کریم اور اس کے اندازِ بیان کا کسی زبان، لغت پر اس کا اثر پڑنا کئی اسباب میں سے ایک اہم و بنیادی سبب مذہبی بھی ہے۔ قرآنی ادب نے عربی زبان و ادب میں ایک خاص قسم کا انفرادی تقدس پیدا کردیا۔ جس کی مثال کسی دوسری زبان میں مشکل سے ملے گی۔ وہ یہ کہ اس نے نہ صرف نئے الفاظ وضع کیے اور ان کے معنیٰ متعین کیے، بلکہ بعض پُرانے الفاظ کے معانی و مطالب کو وسعت و گہرائی بھی دی اور بعض کے معنیٰ بدل کر نئے معنیٰ پہنائے، جیسے اسلام، ایمان، کفر اور شرک..... کہ ان الفاظ کو مخصوص معنوں میں استعمال کرنے کا سہرا قرآن مجید ہی کے سر ہے اور اسی طرح یہ الفاظ جو پہلے سے عربی میں موجود تھے، لیکن نئے اور مخصوص معنوں میں عربی زبان میں بالکل نئے الفاظ کی طرح شامل ہوئے اور ان کے معنی پہلے سے رائج اور مستعمل معنوں سے بالکل مختلف ہوگئے۔ جیسے ''صلوٰۃ'' عربی میں اس کے معنی صرف دعا کے ہیں، لیکن قرآن نے اسے مسلمانوں کے مخصوص طریقہ عبادت کے لیے متعین کردیا۔ اب لفظ ''صلوٰۃ'' کسی دوسرے مذہب کی عبادت کو نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ہی ''صوم و زکوٰۃ'' کی مخصوصیت مسلمانوں کی عبادت کے لیے متعین ہوگئی۔ اسی طرح مومن، کافر، فاسق وغیرہ کے الفاظ ہیں جن کے معنی قرآن نے متعین کر کے ان کے معنی میں وسعت و گہرائی کے بیش بہا شیڈس پیدا کردیئے۔ قرآنِ کریم کی بدولت عربی زبان میں بہت سے نئے علوم کا وجود ہوا۔ جیسے اس کی تشریح و توضیح کے لیے علم تفسیر اور اصولِ تفسیر معرضِ وجود میں آئے۔

قرآنِ حکیم کی بکثرت تلاوت کرنے، پانچوں نمازوں میں قرآنی آیات کا پڑھنا، ان سے مسئلے، مسائل اور احکام و اسرار نکالنے کی غرض سے ان پر غور و خوض (تدبّر) کرنے اور ان کے

معانی و مفاہیم کو سمجھنے کی وجہ سے اس کا اسلوبِ بیان، اس کے تشبیہ و استعارے، اس کا اندازِ تخاطب، علماء متکلمین اور اُدباء وشعراء کی زبانوں پر چڑھ گیا، حتیٰ کہ یہ طرزِ اسلوب عام لوگوں کی زبانوں پر بھی کسی حد تک اثر انداز نظر آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بعد ازاں ان کی انشا و ادب کا جز بن گیا۔ اس لیے اصحابِ علم وفن اس کی تقلید کر کے اس کی آیات کو بطور استدلال پیش کر کے اپنی تحریر و تقریر اور شعر و شاعری کو ادب کا مرقع (تصویر) اور فن کا شہ پارہ بتانے لگے۔ اور آج تک قرآن عزیز کی یہ امتیازی شان بدستور باقی ہے۔ زبان وادب پر قرآنِ کریم کے ان اثرات کے علاوہ اس کی ذریعہ قدیم تاریخ کی بعض گھتیاں سلجھانے میں بڑی مدد ملی۔ جیسے کہ علماء آثارِ قدیمہ نے تاریخ کے اہم ابواب کی تلاش میں زمین کے سینے سے حقائق نکالنے کی سعی شروع کی، تو قرآنی آیات کا سہارا لیے بغیر کام بن نہیں پایا۔ جیسے قرآن میں قدیم قوموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ غرض قرآن ہر اعتبار سے حجت اور (seal) یعنی مہر کی حیثیت رکھتا ہے۔

**لغت میں فہمِ قرآن:** قرآنِ پاک کو لغت سے سمجھنے کا طریقہ دورِ رسالت ﷺ ہی سے نظر آتا ہے، جیسا کہ عہد عباسی کے بدلے ہوئے حالات میں علمائے لغت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں قرآنِ مجید کے الفاظ کے معنٰی و مفہوم اور اس کی اصل مراد و مطلب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو اور لوگ عجمی خیالات وافکار سے متاثر ہو کر اس کی روح سے نا آشنا نہ ہو جائیں۔ لہٰذا لازمی ہے کہ اس کے تمام الفاظ و کلمات کی توضیح اس روشنی میں کی جائے، جو حضرت محمد ﷺ سے انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ دوسرا خوف یہ تھا کہ علماء لغت اس وقت حیات ہیں، ان کی موت کے بعد ان کا لغوی سرمایہ ضائع نہ ہو جائے اور لوگوں کے پاس کوئی سند باقی نہیں رہے۔ ان لوگوں کا یہ بھی احساس تھا کہ قرآنِ مجید کا صحیح فہم اس کی لغوی تفسیر ہی پر موقوف ہے۔

**قرآنی ادب کی توسیع:**

قرآنی ادب جہاں عربی زبان وادب پر اثر انداز ہوا، وہی دوسرے دیگر زبانوں پر بھی اپنے اثرات ڈالے بغیر آگے نہیں بڑا تھا۔ جیسے فارسی، اُردو.....وغیرہ پر۔

ایسے ہی علاقائی زبانوں میں کشمیری زبان ادب پر بھی قرآنی ادب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مقالہ ہذا میں دو لفظ مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک کشمیری زبان اور دوسرا قرآنِ حمید۔

مقالے کے عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ موضوع بیک وقت لسانی، ادبی، دینی، تہذیبی اور ثقافتی ہے۔ آج اس کو جامع اصطلاح میں عمرانیات کہا جاتا ہے۔ مقالے کے یہ مختلف پہلو آپس میں اس طرح مخلوط ہیں، کہ ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنا ناممکن ہے، کیونکہ یہ تمام ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اثر پذیر بھی ہوتے ہیں۔ اس کے شواہد ہمیں تاریخی لسانیات، توضیحی لسانیات اور تقابلی لسانیات کے باب میں مختلف زبانوں کے مطالعے سے بخوبی مل سکتے ہیں یعنی دین، دینی کُتب اور دینی ادب کسی زبان کا ہیولیٰ، خاکہ (Structure) تیار کرنے میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے، جس کی تصدیق کسی بھی زبان کے تاریخی مطالعے سے کی جاسکتی ہے۔ ہم اس سے ایک درجہ نیچے اتر کر بھی، کم سے کم اس قدر تو ضرور ہی کہہ سکتے ہیں، کہ کسی زبان پر اس کے بولنے والوں کے دینی افکار و تصورات اور متعلقہ الفاظ کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ مگر اس بحث سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے، کہ زبان کی تشکیل میں دوسرے محرکات کارفرما نہ ہو۔ کیونکہ زبان انسانی زندگی کی عکاس ہوتی ہے اور اس کا ادب زندگی کا ترجمان۔

## ماخوذ الفاظ کا دائرہ کار اور زبان کی وسعت:

موضوع کے لحاظ سے اگر چہ میرا دائرہ کشمیری زبان میں قرآنی الفاظ کے استعمال کا صرف جائزہ لینا ہے۔ مگر اس کے لیے فقط اتنا کافی نہیں کہ کشمیری زبان اور قرآنِ کریم کے ایسے مشترک الفاظ کی ایک فہرست پیش کردی جائے، جو قرآن میں آئے ہیں اور کشمیری زبان کی تحریر و تقریر میں بھی مستعمل ہیں۔ ہمیں یہ بھی زیرِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس کے اسباب و علل کیا ہیں۔ اور تاریخی اعتبار سے تاثیر و تاثر کے اس عمل کی نوعیت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کشمیری زبان یا دنیا کی کسی بھی زبان میں قرآنِ مجید کے چند خاص یا عام الفاظ پائے جاتے ہیں، تو یہ محض ایک امر اتفاقی نہیں اور نہ ہی ہم اسے تُوارد کہہ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی انقلابی تحریک کے بہت سے وجوہ میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے معانی و مطالب ہی کے نہیں، بلکہ الفاظ و اسالیب کے جواہر پارے بھی دنیا کو عطا کیے۔ کسی زبان میں الفاظ کی لین و دین درآمد و برآمد کا عمل اس کے بولنے والوں کی معاشرت اور طرزِ بود و باش، رہن وسہن کے ارتقاء اور تغیّر و تبدل پر موقوف ہے۔ اس قاعدہ کلیہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں ماضی سے

مثالیں تلاش کرنے کی حاجت نہیں۔ہم اپنے حالاتِ حاضرہ سے، اپنے جائے مساکن سے اس کے شواہد حاصل کر سکتے ہیں۔روئے زمین کے جس حصّے، جہاں پر قرآن مجید کی انقلابی تحریک کی عملداری قائم ہوئی، وہاں اس کی زبان کے اثرات کا پہنچنا ضروری ولابدی تھا۔جس کی تصویر و تصدیق میں مقالہ ھذا میں کی چند مثالیں فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

## قرآن ہر چیز کی کسوٹی:

یعنی اگرچہ عربی زبان کو لغت القرآن کہتے ہیں کہ قرآن کا نزول اسی زبان میں ہوا، لیکن قرآنِ کریم نے عربی کو من وعن قبول کرنے کے بجائے اپنے تحریکی تقاضوں کے مطابق اس کے طریقِ اظہار اور اسلوبِ بیان میں ہی نہیں، ذخیرہ الفاظ میں بھی بہت سے تصرفات کیے۔ یہ فرق نزولِ قرآن سے قبل کی عربی اور اس کے بعد کی عربی کے تقابلی مطالعہ سے بالکل نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے۔اس کی وجہ وہ افکار وعقائد اور زندگی کی قدریں ہیں جنھیں قرآنِ عظیم نے روشناس کرایا۔اور جو اس کی انقلابی تحریک کے اجزائے ترکیبی اور لازمی حصّہ تھے۔ چونکہ کشمیری زبان وادب میں قرآنی الفاظ کا ورود جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، اسے عربی کی طرح لغتِ قرآن کا شرف حاصل نہیں۔

## الفاظ کی حقیقت قرآنی ادب کے تناظر میں:

کشمیری زبان میں قرآنی الفاظ کے تناسب کا عالم یہ ہے کہ ہم ہزار صفحات کی اس کتاب میں سے کہیں سے بھی ایک چھوٹی سورت، ایک آیت کا ٹکڑا لے لیں۔اس سے اندازہ لگالیں کہ کتنے الفاظ بعینہٖ کشمیری زبان میں موجود ہیں اور کتنے قدرے تغیّر کے ساتھ محفوظ ہیں اور کتنے وہ الفاظ ہیں جو اس زبان میں نہیں ملتے ہیں۔اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ مثال کافی ہے، کہ سورہ فاتحہ کو پیشِ نظر رکھ لیا جائے۔جیسے: ''الحمد للہ'' مرکب شکل میں ہم بولتے اور لکھتے ہیں۔حمد اور اللہ الگ الگ بھی بولتے ہیں، ربّ، عالم، رحمٰن، رحیم، بعینہٖ کشمیری زبان میں استعمال شدہ الفاظ ہیں۔ نعبد کی اصل عبد، عبادت اور نستعین کے دوسرے مشتقاتی الفاظ، تعاون، معاونت اعانت وغیرہ کی شکل میں جو کشمیری زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔''اِھدنا'' مادّہ (Root) ھدیٰ، ہدایت سے، اہلِ کشمیر ناآشنا نہیں ہیں۔صراطِ مستقیم، سب جانتے ہی ہے۔انعمت کی دوسری شکلیں انعام، نعمت

وغیرہ کشمیری زبان میں استعمال شدہ ہیں۔غیر، مغضوب اور لا، ضالین بھی ہمارے ہاں اجنبی نہیں ہیں۔گویا کہ یہ قرآنی الفاظ ہیں جو کشمیری زبان وادب کے ذخیرہ الفاظ کا ایک اہم حصّہ ہیں۔

اس طرح قرآنِ مجید کے وہ الفاظ جو کشمیری زبان میں بولے جاتے ہیں۔ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ کسی مقالہ میں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہیں۔اور بات حوالوں، مثالوں کے ساتھ کی جائے تو نمونے کے کچھ الفاظ پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔ان الفاظ کی مختلف جہات سے تقسیم اور درجہ بندی بھی کی جاسکتی ہے، مگراس کے لیے مقالہ کے بجائے کتاب کی وسعت درکار ہوگی۔تقریر اور تحریر کی زبان میں بالجملہ جو فرق ہوتا ہے اس کا اثر قرآن کے ان الفاظ میں بھی نظر آئے گا، یعنی کچھ الفاظ صرف بول چال میں استعمال ہوتے ہیں کچھ صرف لکھنے و پڑھنے (کتابت وقرأت) کی زبان میں ملتے ہیں۔کچھ تحریر وتقریر دونوں میں جلوہ افروز ہیں کچھ صرف دینی بحثوں میں جگہ پاتے ہیں کچھ فقط علمی و ادبی گفتگو میں بار پاتے ہیں۔صوری (ظاہری) اعتبار سے ان الفاظ میں کسی تغیر کی نشان دہی مشکل ہے۔ہاں البتہ معنوی لحاظ سے انھیں چند خانوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ایک قسم ان الفاظ کی وہ ہے، جو بالکل انہی معنوں میں کشمیری زبان میں بھی استعمال شدہ ہیں کہ جن معنوں میں انھیں قرآن نے استعمال کیا ہے۔دوسری قسم میں وہ الفاظ آتے ہیں، جو کشمیری زبان میں قرآن کے معنیٰ سے ہٹ کر مختلف معنیٰ میں مستعمل ہیں اور کچھ الفاظ ایسے ہیں کہ قرآن میں ان کے معنیٰ میں وسعت اور تنوع ہے، جب کہ کشمیری زبان میں نہیں ہے۔اسی طرح اس کے برعکس صورت بھی ہو سکتی ہے، لیکن یہ بحثیں طویل ہیں اس میں پڑنا باعث طوالت ہے۔لہٰذا ان سے صرفِ نظر ہی بہتر ہے۔چونکہ کشمیری زبان میں استعمال شدہ قرآنی الفاظ کی فہرست یا ان کی تعداد پیش کرنے کا یہ محل، موقع نہیں، مدعا کی توضیح کے لیے میں صرف نمونۃً حروفِ تہجی کی ترتیب سے چند ایسے الفاظ درج کرتا ہوں، جو قرآن کے الفاظ ہیں اور اہل کشمیر انھیں بولتے ہیں، لیکن نمونہ الفاظ پیش کرنے سے پہلے میں قارئین کی خدمت میں چند اصول وقواعد کا پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

## قرآن کا تقدّس:

ہمارے لیے یہ کیسے جائز ہوگا، کہ ہم کسی زبان (کشمیری زبان) کے الفاظ کو قرآن کی طرف منسوب کریں۔جب کہ وہ الفاظ ویسے ہی ہو بہ ہو شکل کے، قرآن میں موجود نہ ہو۔

درج ذیل اصول کے تحت ہم کشمیری زبان کے الفاظ کو قرآن کا لفظ ( کہی ظاہری کہی معنوی لحاظ سے ) قرار دے سکتے ہیں۔

**لسانی تغیرات: مادّے میں یکسانیت، لفظ میں حذف واضافہ:-**

پہلا اصول:- دونوں زبانوں میں مستعمل لفظ، مادہ میں یکساں ہو۔ جیسے لفظ ''قصص'' اور قصّہ دونوں کا مادہ ایک ہی یعنی قصّ ہے، قص کے مادہ سے مشتق ہونے والے بہت سے کلمات قرآنِ کریم میں وارد ہوتے ہیں۔اس بارے میں کوئی حرج نہیں کہ قصص پر لفظ قصّہ کا اطلاق کیا جائے۔اس لیے کہ دونوں الفاظ کی معنوں دلالت اس سلسلہ میں ہماری معاون ہے۔القصص یعنی قصے اس سلسلے میں صاحب لسان العرب رقمطراز ہیں ''فعل القاص إذا قص القصص'' (قصہ بیان کرنے والے کا وہ فعل جب وہ قصہ بیان کیے ) ارشادِ الٰہی ہے:

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ أَحۡسَنَ الۡقَصَصِ (یوسف:۳)

(ہم تمہارے لیے احسن اندازِ بیان میں بیان کرتے ہیں)

قصہ خبر کو کہتے ہیں یہی قصص کا مفہوم ہے کہ قصص اس خبر کو کہتے ہیں جو بیان کی جائے یعنی القصص ھوالخبر المقصوص، قصص فتحہ کے ساتھ مصدر کی جگہ پر وضع کیا گیا ہے، یہی غالب ہوگیا، قاف کسرہ کے ساتھ قصّہ کی جمع ہے، یعنی جس کو لکھا جائے۔[۵]

**لفظ میں حذف:**

دوسرا اصول:-(Procope) عنی کسی لفظ کی پہلی آواز، شروع کا ہمزہ وصلیہ ساکت ہو جانے، گر جانے کو (Procope) کہتے ہیں ارشاد الٰہی ہے: وَمَا أَلَتۡنَاهُم مِّنۡ عَمَلِهِم مِّن شَيۡءٍ (طور:۲۱) اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا اُن کو نہ دیں گے۔ہوسکتا ہے، کہ قرآنی لفظ ''الت'' ہی کو اہلِ کشمیر ''لت'' پڑھتے، یعنی لفظِ الت کی پہلی آواز، ہمزہ وصلیہ کو حذف کرتے ہیں کشمیری زبان میں لُت بمعنی ہلکہ۔علیٰ ہذا القیاس ہوسکتا ہے کہ قرآنی لفظ ''الفافاً'' (نباء:۱۶) گھنے کو کشمیری زبان میں لفافہ کر دیا ہو یعنی جس سے کسی چیز کو لپیٹ لیا جائے۔

تیسرا اصول:-(Syncope) یعنی درمیانی مصوتے کا حذف جیسے معاف کو کشمیری زبان میں ماف بولتے، معاذ اللہ کو ماذ اللہ بولتے، نعوذ باللہ کو نوذ باللہ اور فار کو فر بولتے ہے۔

چوتھا اصول:-(Apocope) مطلب کسی لفظ کی آواز یعنی لفظ کا آخری حرف ساکت ہو جانے کو(Apocope) کا نام دیا جاتا ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ (دخان:۲۹) پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین ۔ممکن ہے، کہ قرآنی لفظ ''بکی'' کو کشمیری زبان میں ''باکھ'' پڑھنا شروع کردیا ہو جس کا معنی آنسوں بہانے کے آتا ہے۔

علی ھٰذاالقیاس کشمیری زبان میں لفظ نمل جمع انامل (آل عمران/۱۱۹) انگلیاں جس کے آخری مصوتے کو حذف کر کے نم (ناخن) کردیا ہو۔ ویسے بھی اکثر کشمیری حروفِ حلقی (ء۔ھ۔ع۔ح۔غ۔خ) عربی تجوید کے تحت ادا نہیں کرپاتے ہیں۔

## لفظ میں اضافہ:

(۱) لفظ کی ابتداء میں مصوتے کا اضافہ جیسے غافل سے وغافل ہوگیا۔

(۲) لفظ کے وسط میں مصوتے کے اضافہ کو(Amaplyxis) کہا جاتا ہیں مثلاً عربی میں ''علم'' کا اصل تلفظ ilm جبکہ اہل کشمیر اس کی آواز دبا کر alim پڑھتے ہیں۔ایسے ہی تنور کو تندور اور خصم کو خصتم بولتے ہیں۔

(۳) لفظ کے آخر میں مصوتے کے اضافہ کو(Excescent) بولا جاتا ہیں مثلاً دریا سے دریاوٗ (فارسی میں دریاب ہے) نیند سے نیندر۔

## امالہ کا اصول:

یعنی زبر اور زیر کے درمیانی آواز کے ساتھ پڑھنے کو امالہ کہا جاتا ہے۔جیسے ارشادالٰہی ہے:وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (ضحیٰ/۱۱) اوراپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔یہاں نعمۃ میں نہ پوری زیر پڑھی جاتی، نہ پوری زبر۔ایسے ہی لفظِ ''ھزل'' (طارق:۱۴) میں بھی یہ اصول کارفرما ہوسکتا ہے یعنی کشمیری زبان میں اس کو ہزل پڑھتے ہے، رہا سوال ''ۃ'' کے ساتھ پڑھنا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری زبان کی حروفِ تہجی میں ''ھا'' نہیں ہے۔اسی طرح ہماری زبان میں لفظ طارق (طارق:۱،۲) جب کسی شخص کا نام ہو، تو راء کو زیر کے ساتھ پڑھتے، جب ستاروں کے لیے استعمال کرتے، واحد کی صورت میں راء پر پیش یعنی طارُق، اور جمع کی صورت میں راء پر زبر یعنی طارَق بولتے ہیں۔ایسے ہی درج ذیل قرآنی الفاظ جو کشمیری زبان میں عربی قاعدہ واصول کے تحت

یعنی اصولِ تجوید کے ادا ہوتے ہیں مثلاً قرآنی الفاظ: ذائقة (انبیاء:۳۵) فتنة (بقرہ:۱۰۲) ھدیّة (نمل:۳۵) وسیلة (مائدہ:۳۵) خفیة (انعام:۶۳) ذرّة (زلزال:۷) وغیرہ الفاظ پر جب وقفہ ہوتا، تو لفظ کے آخر کا ''تاء'' بشکل ''ۃ'' جو ''ہ'' میں تبدیل ہو جاتا ہے، جیسے کشمیری زبان میں وصل کی صورت میں ذائقۃ الموت بولتے ہیں بشکل ''ۃ'' اور فصل کے وقت ذائقہ بولتے ہیں بشکل ''ہ''۔

## صوت میں تبدیلی:

ایسے ہی مندرجہ ذیل قرآنی الفاظ کشمیری زبان میں ''تغیر فی اللحن'' یعنی حروفِ علت کی آواز میں تبدیلی کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہو۔

| قرآنی الفاظ | مادّہ | کشمیری | اردو |
|---|---|---|---|
| ثابت (ابراھیم:۲۴) | ث ب ت | ثأبت | مستحکم |
| جاھل (بقرہ:۲۷۳) | ج ھ ل | جأہل | ناداں |
| حیران (انعام:۷۱) | ح ی ر | حأران | حیران |
| خالص (زمر:۳) | خ ل ص | خألص | خالص |
| خالق (انعام:۱۰۲) | خ ل ق | خألق | پیدا کرنے والا |
| ساحل (طہ:۳۹) | س ح ل | سأحل | دریا کا کنارہ |
| صابر (کہف:۶۹) | ص ب ر | صأبر | صبر کرنے والا |
| ظالم (نساء:۷۵) | ظ ل م | ظألم | ظلم کرنے والا، ستم گر |
| ظاھر (انعام:۱۲۰) | ظ ھ ر | ظأہر | آشکارا |
| عالم (حشر:۲۲) | ع ل م | عألم | جاننے والا |
| کاتب (بقرہ:۲۸۲) | ک ت ب | کأتب | لکھنے والا |
| کافر (بقرہ:۴۱) | ک ف ر | کأفر | انکار کرنے والا |
| مُھَاجِرٌ (عنکبوت:۲۶) | ھ ج ر | مہأجر | وطن چھوڑنے والا |
| والد (لقمان:۳۳) | و ل د | وألد | باپ |
| واحد (کہف:۱۱۰) | و ح د | وأحد | واحد |

## چند الفاظ حروفِ تہجی کی ترتیب میں:

کشمیری زبان میں استعمال شدہ قرآنی الفاظ کی فہرست حروفِ تہجی کی ترتیب سے چند ایسے الفاظ جو قرآن کے ہیں اور اہل کشمیر انھیں بعینہٖ، ہو بہ ہو بولتے ہیں۔

| قرآنی الفاظ | مادّہ | کشمیری | اُردو |
|---|---|---|---|
| اَجل (بقرہ:۲۸۲) | ء ج ل | اَجل | مہلت، مقررہ وقت |
| آثار (مؤمن:۲۱) | ء ث ر | آثار | نشانیاں |
| بدل (کہف:۵۰) | ب د ل | بدل | عوض، بدلہ |
| تقدیر (انعام:۹۶) | ق د ر | تقدیر | اندازہ |
| فَتَهَجَّدْ (اسراء:۷۹) | ج ھ د | تُہجد | جاگتا رہ |
| ثواب (آل عمران:۱۴۵، ۱۴۸) | ث و ب | ثواب | جزا، بدلہ |
| [illegible]اب (اعراف:۸۲) | ج و ب | جواب | جواب |
| حرام (بقرہ:۱۴۴) | ح ر م | حرام | ممنوع |
| خوف (قریش:۴) | خ و ف | خوف | اندیشہ |
| خراب (حشر:۲) | خ ر ب | خراب | خراب |
| دنیا (بقرہ:۸۵) | د ن و | دنیا | دنیا |
| ذکر (انشراح:۴) | ذ ک ر | ذکر | چرچا، مذکور |
| ذِلّة (اعراف:۱۵۲) | ذ ل ل | ذلت | ذلت |
| رِزق (بقرہ:۶۰) | رز ق | رزق | روزی |
| رحمت (اعراف:۵۶) | ر ح م | رحمت | رحمت |
| زُمر (زُمر:۷۱، ۷۳) | ز م ر | زُمر | گروہ |
| سُرور (دھر:۱۱) | س ر ر | سُرور | سرور |
| شریک (انعام:۱۶۳) | ش ر ک | شریک | شریک |
| صُبح (تکویر:۱۸) | ص ب ح | صُبح | صبح |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ضرر (نساء:۹۵) | ض رر | ضرر | نقصان |
| طوفان (اعراف:۱۳۳) | ط وف | طوفان | طوفان |
| ظُلم (انعام:۱۳۱) | ظ ل م | ظُلم | ناانصافی |
| عذاب (بقرہ:۷) | ع ذ ب | عذاب | عذاب |
| عظیم (بقرہ:۷) | ع ظ م | عظیم | بڑا |
| غرق (یونس:۹۰) | غ رق | غرق | ڈوبنا |
| فان (رحمٰن:۲۶) | ف ن ی | فان | فنا ہونے والا |
| قریب (بقرہ:۱۸۶) | ق رب | قریب | نزدیک |
| کشف (دخان:۱۲) | ک ش ف | کشف | کھولنا |
| کُرسِیّہٖ (ص:۳۴) | ک رس | کرسی | اس کا تخت |
| لباس (بقرہ:۱۸۷) | ل ب س | لِباس | پوشاک |
| مبارک (انعام:۱۵۵) | ب رک | مبارک | برکت والا |
| مال (بقرہ:۱۷۷) | م ول | مال | دولت |
| مسرور (انشقاق:۹) | س رر | مسرور | خوش |
| نار (بقرہ:۲۴) | ن ور | نار | آگ |
| نذر (بقرہ:۲۷۰) | ن ذ ر | نذرونیاز | منت |
| نظر (محمد:۲۰) | ن ظ ر | نظر | دیکھنا، تکنا |
| وعدہٗ (آل عمران:۱۵۲) | وع د | وعد | اپنا وعدہ |
| نصیب (انعام:۱۳۶) | ن ص ب | نصیب | حصّہ |
| یقین (تکاثر:۵) | ی ق ن | یقین | بھروسہ |

## قرآنی لفظ کا مادّہ (Root) کشمیری زبان میں اس کا استعمال:

چند ایسے استعمال شدہ الفاظ، جو قرآنِ کریم اور کشمیری زبان میں، مادّہ (Root) کے لحاظ سے یکساں نظر آتے ہیں یعنی قرآنی لفظ کا جو مادّہ (Root) ہے، کشمیری زبان میں بھی ویسا ہی

لفظ استعمال ہوتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

| قرآن کریم میں | مادّہ | اُردو معنی | کشمیری |
|---|---|---|---|
| أَشْكُو (یوسف:۸۶) | ش ک و | میں شکوہ کرتا ہوں | شکوہ، شکایت، Complain |
| فَأَقْبَرَهُ (عبس:۲۱) | ق ب ر | اس نے اسے قبر میں رکھا | قبر |
| أُقِّتَت (مرسلات:۱۱) | و ق ت | وقت مقرر کیا گیا | وقت |
| اقْتَرَبَ (اعراف:۱۸۵) | ق ر ب | نزدیک آ پہنچا | قرب |
| الأَسْبَاب (اعراف:۱۸۵) | س ب ب | اسباب | سبب |
| أَضَاعُوا (مریم:۵۹) | ض ی ع | انہوں نے ضائع کیا | ضیع، ضایع |
| وَاضْمُمْ (طہٰ:۲۰) | ض م م | ملا لے | ضمّ کیا |
| اعْتَزَلْتُمُوهُمْ (کہف:۱۶) | ع ز ل | تم ان سے الگ ہو گیے | عزل، معزول |
| أَقْرَضْتُمُ (مائدہ:۱۲) | ق ر ض | تم نے قرض دیا | قرض |
| أُقْسِمُ (واقعہ:۷۵) | ق س م | میں قسم کھاتا ہوں | قسم |
| فاغْسِلُوا (مائدہ:۶) | غ س ل | تم دھوؤ | غُسل |
| وَامْسَحُوا (مائدہ:۶) | م س ح | تم مسح کرو | مسح |
| أَكْرَمَكُمْ (حجرات:۱۳) | ک ر م | تم میں سب سے بڑا عزت والا۔ | کرم |
| بِالأَلْقَابِ (حجرات:۱۱) | ل ق ب | صفاتی نام | لقب |
| أَنسَاب (مؤمنون:۱۰۱) | ن س ب | رشتے دار | نسب |
| فَانكِحُوا (نساء:۳) | ن ک ح | تم نکاح کرو | نکح |
| الأَنْهَار (بقرہ:۲۵) | ن ھ ر | ندیاں | نہر |
| الأَقْدَام (انفال:۱۱) | ق د م | اقدام | قدم |
| أَوْلِيَاء (آل عمران:۲۸) | و ل ی | محافظ، مددگار، دوست | ولی |
| فَلا تَقْهَر (ضحیٰ:۹) | ق ھ ر | اس کو مت دبا مت ڈانٹ | قہر |
| أَلْسِنَتِكُمْ (روم:۲۲) | ل س ن | تمہاری زبانیں | لسن |

فَیَدْمَغُهٗ (انبیاء:۱۸) دم غ وہ اس کا سر پھوڑ ڈالتا ہے دماغ

## قرآن سے مستعار الفاظ و آیات:

جس میں برائے راست، من وعن قرآنی لفظ یا آیت کو مستعار لیا جاتا ہے، اور حصولی زبان یعنی کشمیری زبان میں بعینہٖ بولا جاتا ہے، جیسا کہ

| قرآنی آیات | اُردو ترجمہ | کشمیری |
|---|---|---|
| إِن شَاء اللّٰهُ (یوسف:۹۹) | اللہ نے چاہا۔ | إِن شَاء اللّٰه |
| سَكْرَةُ الْمَوْتِ (ق:۱۹) | بیہوشی موت کی۔ | سَكْرَةُ الْمَوْت |
| مَلَكُ الْمَوْتِ (سجدہ:۱۱) | موت کا فرشتہ۔ | مَلَكُ الْمَوْت |
| مَا شَاء اللّٰهُ (کہف:۳۹) | جو اللہ چاہے وہی ہوگا۔ | مَا شَاء اللّٰه |
| كَلَامَ اللّٰهِ (بقرہ:۷۵) | اللہ کا کلام | كَلَامَ اللّٰه |
| أَعُوذُ بِاللّٰهِ (بقرہ:۶۷) | اللہ کی پناہ | أَعُوذُ بِالله |
| سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى (نجم:۱۴) | سدرۃ المنتہیٰ | سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى |
| سُبْحَانَ اللّٰهِ (صٰفٰت:۱۵۹) | اللہ پاک ہے۔ | سُبْحَانَ اللّٰه |
| يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ (قمر:۱۷) | ہم نے قرآن آسان کر دیا۔ | يَسَّرْنَا الْقُرْآن |
| تَاللّٰهِ (یوسف:۹۱) | قسم اللہ کی | تَاللّٰه |
| واللهِ (انعام:۲۳) | قسم اللہ کی | والله |
| جِبْرِيلَ وَمِيكَالَ (بقرہ:۹۸) | میکائیل، جبرائیلؑ۔ | میکائیل، جبرئیلؑ |
| اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (کہف:۱) | تعریف اللہ کے لیے ہے۔ | اَلْحَمْدُ لِلّٰه |
| بِسْمِ اللّٰهِ (نمل:۳۰) | (شروع) اللہ کے نام سے | بِسْمِ اللّٰه |
| إِلَّا مَا شَاء اللّٰهُ (اعلیٰ:۷) | سوائے اُس کے جو اللہ چاہے۔ | إِلَّا مَا شَاء اللّٰهُ |
| مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ (فتح:۱۹) | محمد رسولؐ اللہ کا | مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ |
| بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ (نمل:۳۰) | | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ |

كِرَاماً كَاتِبِينَ (انفطار:١١) عزت والے عمل لکھنے والے ۔ كِرَاماً كَاتِبِين

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعون (بقره:١٥٦) إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعون

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (انبیاء:٣٥) كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ (یٰسین:١٧) وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيم (واقعہ:٧٧) قرآنِ کریم

الْقُرْآنِ الْمَجِيْد (ق:١) قرآن بڑی شان والا قرآنِ مجید

## قرآن سے مستعار ترجمہ:

اس میں قرآنی آیت کا مفہوم مستعار لیا جاتا ہے اور حصولی زبان یعنی کشمیری زبان کے کسی موجود یا نوساختہ لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بترتیب قرآنِ کریم کی آیت اُردو میں اس کا ترجمہ اور آخر میں کشمیری زبان میں اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

ارشادِ الٰہی ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَان (رحمان:٢٦)

(اُردو ترجمہ) جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے۔

(کأشُر ترجمہٕ) یم جن تہٕ انسان اتھ رُوِ زمینس پٹھ چھہ موجود تم ساری چھہ گلہ وین تہٕ فانی سپدہ وُن۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد (ق:١٦)

(اُردو ترجمہ) اللہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔

(کأشُر ترجمہٕ) بلکہ چھہ أسی زیادہ قریب اُمس انسانس گردنہٕ ہنزہ شہ رگہٕ خوتہٕ یمہٕ رگہٕ ہندہ ژٹنہ سیت انسان ختم چھہ سپدان۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِيْن (بقرہ:٢٤٩)

(اُردو ترجمہ) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(کأشُر ترجمہٕ) اللہ تعالیٰ چھُو صبر کرونین سیت سیت۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (زمر:٥٣)

(اُردو ترجمہ) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔

(کأشُر ترجمہٕ) نا اُمید مہٕ سَپد واللہ تعالیٰ سندِ رحمتہٕ نشہٕ۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَأَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ (زمر/۱۰)

(اُردو ترجمہ) اور خدا کی زمین وسیع ہے۔

(کأشُر ترجمہٕ) خدایہ سُند زمین چُھ کھول تہ وسیع۔ (یعنی کھول تہٕ وأسعی)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ذَٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ (حدید:۲۱)

(اُردو ترجمہ) یہ اللہ کا فضل ہے۔

(کأشُر ترجمہٕ) یہ مغفرت تہ رضائے خدا چھو خدایہ سند فضل۔

**مستعار الفاظ میں تبدیلی حقیقت کی نشاندہی:**

مستعار الفاظ میں ہونے والے لفظی ومعنوی تغیرات بعض ایسے تاریخی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کہ کسی اور ذریعہ سے ان تک رسائی مشکل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مستعار لفظ کا استعمال بعض اہم تفسیری اور نفسیاتی پہلوؤں کا پتہ بھی دیتا ہے۔ یعنی بعض وقت یہ مستعار الفاظ لوگوں کی فکری وذہنی سطح کی یوں دلالت کرتے ہے۔ جیسے بعض دفعہ زبان کے فرق سے معنی بدل جاتا ہے۔ یعنی ایک لفظ جب دوسری زبان میں چلا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی بدل بھی سکتا ہے۔ یعنی لفظ ایک ہے مگر زبان کی فرق سے معنی تبدیل ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ لفظِ ذلیل عربی اور کشمیری دونوں زبانوں استعمال شدہ ہے۔ کشمیری زبان میں اس کا معنی رسوائی کے ہے۔ جب کہ عربی (قرآنی عربی) میں اس کا معنی ضعیف اور کمزور کے ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ (آل عمران/۱۲۳) واقعی اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی، اس حال میں کہ تم کمزور تھے۔ اگر یہاں کوئی ''اذلۃ'' سے مراد رسوائی لے گا۔ تو دین اسلام سے دور ہوجائے گا اس لیے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کے لیے ایسا لفظ استعمال کرنا کفر ہے۔ تو یہاں قرآن کے حوالے سے ''اذلۃ'' کا معنی کمزور ہوگا۔ ایسے ہی لفظ ''دلّہ'' عربی اور کشمیری دونوں زبانوں استعمال ہوتا ہے۔ کشمیری زبان میں اس کا معنی گالی کے ہے۔ لیکن عربی زبان میں یہ مثبت معنی میں آتا ہے جیسے سعود عرب میں کسی کمپنی نام ''دلّہ'' رکھا گیا۔ ایسے ہی درج ذیل قرآنی الفاظ جو کشمیری زبان میں قرآنی معنیٰ سے الگ مختلف معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

| قرآنی الفاظ | مادّہ | کشمیری | اُردو معنی |
| --- | --- | --- | --- |

تدارک (قلم/۴۹) درک تدارک کرنا، مسئلہ کا حل تلاش کرنا

غَلِیظٌ (ابراہم:۱۷) غ ل ظ غلیظ سخت

خَردَل (انبیاء:۴۷) خردل بمعنی گالی رائی

حَرْدٍ (قلم:۲۵) ح رد حرد، فصل کٹائی کا مہینہ لپکتے ہوئے

مَّشِیدُ (حج:۴۵) ش ی د مشید یعنی مسجد گچکاری کے

مخمصۃ (مائدہ/۳) (توبہ/۱۲۰) خ م ص مخمصہ، گہری فکر میں گم ہونا بھوک

محسوس ہوتا ہے کہ اس تغیر کی ایک خاص معنوی دلیل ہے، اور اس کا سبب ایک خاص سماجی پس منظر ہے۔ مستعار الفاظ کی یہ تغیرات بسا اوقات ہمیں خانگی اور سماجی روابط کے بعض بڑے دلچسپ پہلوؤں سے آگاہ کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالی ہے: عقدۃ النکاح....(بقرہ/۲۳۵۔۲۳۷) (فلق/۴) معنی عقدِ نکاح باندھنا معلوم ہوا کہ اصل وضع کے اعتبار سے لفظِ عقد کا معنی گانٹھ اور باندھنا کے ہیں۔ مگر ہماری زبان میں اس کا استعمال اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی جب ایک عورت اپنے شوہر سے جدا ہو یعنی نکاح فسق ہو، طلاق کی شکل میں، شوہر کی وفات یا لاپتہ ہونے کے وقت عقدہ بولا جاتا۔ یہ معنوی تغیر اس بات کی دلیل ہے کہ ازدواجی تعلقات ہمیشہ خوشگوار ہونے چاہیے۔ اردو زبان میں بھی یہ لفظ اسی طرح استعمال ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا: ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے مشورے سے یہ عقدہ حل ہوا ہے۔ دوسری عبارت یہ ہے کہ قرآنی تعلیم اور نبوی ﷺ تعلیم نے اس عقدہ کو حل کیا ہے۔

ایسے ہی ''لحد'' لفظ کشمیری زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے عمرو بن معدی کرب کا ایک شعر ہے:

کم من اَخٍ لی صالح بوّاته بیدیّ لحداً۔

یعنی کتنے ہی میرے نیک خو بھائی، جن کو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں دفن کیا ہے۔ مذکورہ عبارت میں لحد کا ترجمہ قبر کیا گیا۔ کشمیری زبان میں ''لحد'' قبر کے اندر کے ایک ٹیڑھے حصہ کو کہا جاتا ہے۔ قرآن میں الحاد (حج/۲۵) لفظ آیا، جس کا معنی ٹیڑھی راہ کے ہے۔

## فہم قرآن میں عربی لہجات واصوات کا علم:

عربی لہجات واصوات کا علم حاصل کرنا تمام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ چونکہ فہم

قرآن میں عربی لہجات واصوات کی غرض وغایت اوراہمیت کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے، کہ اس کے لیے عہد رسالت ﷺ و دور صحابہؓ میں قرآن پاک، جو جمع وتدوین کے تین ادوار سے گذرا۔ ان میں آخری عثمانیؓ دور میں ان ہی عربی لہجات و اصوات کا جمع وتدوین ہوا۔ اس طرح عربیت اوراس سے متعلقہ علوم وفنون کے ساتھ فہم قرآن کے لیے یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ان جملہ لہجات واصوات سے واقفیت پیدا کی جائے، جو نزولِ قرآن کے وقت عرب میں رائج تھے۔ پھر اس بات پر غور کیا جائے، کہ قرآنِ کریم ان میں سے کس کس لہجہ اور آواز پر اُترا ہے۔ بغیر اس علم کے فہم قرآن کی سعی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ جیسے حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں آیا ہے: اَو لَا اَذبحنّہ (نمل ۲۱) (یا ذبح کردوں گا) دوسری جگہ منافقوں کے بارے میں آیا ہے: وَ لَا اَوضَعوا خِلٰلکم یبغونکم الفتنۃ (توبہ ۴۷) (وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لیے دَوڑ دُھوپ کرتے) بہر کیف جو شخص قرائے عرب کی قراءتوں اوران کی خصوصیتوں سے واقفیت نہیں رکھتا ہو، وہ ان آیات کا ترجمہ نفی کے ساتھ کرے گا۔ لیکن جو شخص عربی لہجات واصوات سے باخبر ہو، وہ فوراً سمجھ لے گا کہ دراصل یہ ''لا'' لائے نافیہ نہیں ہے۔ بلکہ ''لام'' کے زبر کو ذرا کھینچ دینے کی وجہ سے آواز (صوت) ''لا'' کی ہوگئی ہے۔ اسی لہجہ کے مطابق ان الفاظ کی قرآنِ مجید میں کتابت بھی ہوئی ہے۔

## اصطلاحات اور ناموں کا ترجمہ:

اصطلاحات اور ناموں کا ترجمہ کرنا اوراسی کو آگے بڑھانا غلطی سے خالی نہیں ہوگا۔ چونکہ یہودیوں کے کتابوں میں نبی ﷺ کا نام ''احمد'' تھا۔ جس کا ترجمہ انہوں نے (تعریف کیا گیا) کیا ہے۔ اس ترجمہ سے کون مراد ہے اس کا پتہ کہاں سے چلے گا؟ یہ خودساختہ مسائل وحل طلب مشکلات یہودیوں کے مختلف فیہ رہے تھے اور ہیں۔ اس طرح یہود نے پیغمبروں کے ناموں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے دین کو مختلف فیہ بنادیا۔ جیسے: یشوع (یسوع) جیسیوس۔ جیزس۔ مسیح اور عیسیٰ۔ کیا یہ ایک ہی شخصیت کے الگ الگ نام ہیں یا یہ الگ الگ مختلف شخصیات ہیں جبکہ مسیح کے استاذ کا نام عبرانی میں یحنّا۔ لاطینی میں جان اور عربی میں یحییٰ ہے۔ کیا یہ یوحنا۔ جان۔ یحییٰ الگ الگ تین شخص ہیں یا ایک ہے۔ ایسے ہی حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے نام کے بارے میں عیسائیوں نے خلط ملط کیا ہے۔ اس طرح تمام عبرانی پیغمبروں کے ناموں کا مختلف زبانوں میں یہی حال رہا ہے۔

**خلاصہ کلام:**

حقیقت میں زبانوں کا اختلاف اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
وَمِنُ آيَاتِهِ خَلُقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرُضِ وَاخُتِلَافُ أَلُسِنَتِكُمُ وَأَلُوَانِكُمُ إِنَّ فِيُ ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلُعَالِمِيُنَ (روم:۲۲)۔

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔
آیت یعنی نشانی کی توضیح میں علامہ عبدالحمیدؒ فرماتے ہیں کہ یہ مکمل دلیل نہیں ہوتی ہے، بلکہ دلیل کی جانب لے جاتی ہے۔اس کا ایک ظاہری پہلو ہوتا ہے، جو آدمی کو باطن پر غور کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے، جیسے کہ آیات اللہ سے لاپرواہی برتنے والوں کے بارے میں حکمِ الٰہی ہے:وَكَأَيِّن مِّن آيَةٍ فِيُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرُضِ يَمُرُّونَ عَلَيُهَا وَهُمُ عَنُهَا مُعُرِضُونَ (یوسف:۱۰۵) زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔[۶]
گویا معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ زبانیں بولنے والے لوگ اور ان کی زبانیں آپسی افہام وتفہیم کا متقاضی ہے، کیونکہ یہ نئی نئی بولیاں ابتدائے عالم سے ہی چلی آئی ہیں نیز جب یہ مختلف بول ورنگ اللہ کی نشانی ہے، تو انسان کو نہ تو اپنی شکل وصورت پر فخر کرنا چاہیے۔اور نہ اپنی زبان کو حقیر وکمتر سمجھنا چاہیے۔کیونکہ رنگوں کا اصلی مالک اور زبانوں کا حقیقی معلّم اللہ ہی ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
الرَّحُمَنُ ()عَلَّمَ الْقُرُآنَ ()خَلَقَ الْإِنسَانَ ()عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (رحمٰن:۱تا۴)

نہایت مہربان (اللہ) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے اُسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے، کہ قرآنی ادب کا اثر اس شخص پر اور اس کی زبان وادب پر ضرور پڑا ہوگا اور پڑتا ہے۔جس نے اس کلام کو سنا ہو، پڑھا ہو اور اس پر عمل کیا ہو، مگر اس تاثیر کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔یعنی لسانی، ادبی، معاشرتی وغیرہ۔

اس لحاظ سے قرآنی انقلاب نے دنیا کو نہ صرف معانی ومفاہیم عطا کیے، بلکہ الفاظ واسالیب سے بھی مالا مال کیا ہے، البتہ اگرچہ یہ امر حقیقی ہے کہ تمام زبانیں اللہ کی جانب سے منسوب ہوئیں۔
جیسا کہ ابن شیبہ نے ضحاکؒ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا: قرآن مجید میں جملہ زبانیں ہیں۔[۷]

مگر یہ بات بھی ہے، کہ قرآنِ شریف کا وہ لفظ جسے اہل کشمیر نے مستعار لیا ہو، اسے اپنی تحریر، تقریر اور روزمرہ میں استعمال کیا ہو، اور کرتے ہیں حتّی کہ وہ لفظ کشمیری لغات کا حصہ بھی بن گیا ہو، مگر وہ قرآنی لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے قرآن کریم ہی ہے۔ استعمال اور معنوی لحاظ سے کشمیری زبان کا لفظ ہوتا ہے۔

☆☆

## حوالہ جات


۱۔ اللغۃ والمجتمع، عبدالواحد وافی، دارالکتب العربیہ، مصر ۱۹۴۵ء، ص/۲۵، ۲۶۔

۲۔ Max Muller, lectures on the science of language, 16th edition; longmans Green and co 1871, 2 ; 328.

۳۔ الخصائص، ابن جنی، دارالکتب العربیہ، قاہرہ، ۱۹۵۲ء، جلد: ۱۔ ص/۳۷۴۔

۴۔ قرآنِ کریم میں معرّب الفاظ، ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی، دارالعلوم جائس، رائے بریلی، یو۔ پی۔ ہند، ۲۰۰۶، ص/۴۲، ۴۳۔

۵۔ لسان العرب، جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور، مادہ ''قص''۔

۶۔ القائد الی عیون العقائد، عبدالحمید فراہیؒ، دائرۃ حمیدیہ، سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۹۷۵ء، ص: ۱۶۱، ۱۷۶)۔

۷۔ الاعلام، خیرالدین زرکلی، ۳/۲۱۵۔

قرآنی آیات والفاظ کا ترجمہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے ترجمہ قرآن سے لیا گیا۔

قرآنی آیات کا کشمیری ترجمہ، قرآن مجید تہ تمیک کأشُر تفسیر، ترجمہ وتفسیر، میر واعظ محمد یوسف شاہؒ، مطبع شاہ فہد برائے طباعت قرآن مدینہ منورہ مملکت سعودی عرب سے لیا گیا۔


☆☆

☆............ڈاکٹر محمود شیخ

# امیجری کا زوال

تمام علوم وفنون کتابی ہوتے ہیں، جنہیں سیکھنے کے لئے کتابوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے، مگر جذبۂ اخلاق خصوصاً فطری اخلاقی صداقت کا مطالعہ اور مشاہدہ انسانی کردار میں کیا جاتا ہے۔ اخلاقیات ایک ایسا علم ہے جسے فلسفیانہ دلائل کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کا عمل ہی کردار کی پہچان ہوتا ہے۔ کتابوں میں لکھی اصلاحی باتیں کتابوں کے مطالعہ تک محدود ہوتی ہیں جب تک انہیں کردار میں نہ اتارا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ بار بار صلۂ رحمی کی گفتگو سے ذہنِ انسانی متخربِ اخلاق باتوں کی جانب منعطف ہونے سے روکا جاسکتا ہے۔ قصۂ، کہانی اور حکایت نے اخلاقی موضوعات کے فروغ میں نہایت موثر کردار ادا کیا ہے۔ ملا وجہی کی ''سب رس''، خلیل جبران کی ''The Prophet'' رابندر ناتھ ٹیگور کی ''گیتا نجلی'' اس ضمن میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ صوفیائے کرام کی تعلیمات اور ''عوارف المعارف'' جیسی کتابوں کے ذریعہ تالیف قلبی کی بہترین کوشش بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ علمائے دین کے ملفوظات اور نظریات نے کتابوں کی شکل میں ایک دنیا کو متاثر کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی اور شیخ سعدیؒ کی حکایتوں کو کیوں کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ ان سب کے علاوہ سامی مذہب کے عظیم الشان ڈکشن اور پیغمبرانہ تعلیمات کی اخلاقی رفعت و پرواز سے معیارِ زندگی کا توازن واعتدال اور نظم وضبط اپنی مثال آپ ہے۔ یونان

ہی نہیں یورپ کے تمام ترقی یافتہ ممالک کا دامنِ ادب اخلاقیات اورآفاقیت سے تہی دست ہے۔ بے یقینی ،تشکیک ، وسوسہ اور انتشار ہی مغربی فن وفلسفہ اورادب کا ماحصل ہے۔بعض مشرقی دانشور، سائنس وٹکنالوجی کی ترقی کوفن وادب کی کامیابی سمجھتے ہیں۔مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ سائنس ادب کا حصہ ہوسکتی ہے لیکن ادب وفن سائنس نہیں ہوسکتے۔جیسے دریا پر پانی کا ڈیم تعمیر کیا جاسکتا ہے مگر ڈیم سے دریا نہیں بہائے جاسکتے۔دریا کی فطرت ڈیم کی فطرت نہیں ہوسکتی۔سائنس اگرفن ہے تو اسے زبان وادب کی اخلاقی پابندیوں کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ورنہ ایک دن تمام دنیا پیرابیگنی کرنوں، ایٹمی کچرے، دریائی اور ہوائی آلودگی کا شکار ہوجائے گی۔آج کی تعمیر کوکل کی تباہی کا سبب نہیں ہونا چاہیئے۔زبان وادب کا ذائقہ محبت ہے اور محبت کبھی سائنٹفک شعور کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

اخلاق کی سب سے معتبر سچائی ''محبت'' ہے جس کی تاویل میں صدیوں سے کیا کچھ نہیں لکھا گیا۔لیکن بیان ہے کہ تمام ہوتا ہی نہیں۔انسان اپنے والدین ، بیوی ، بچے ، بھائی بہن کے علاوہ رشتہ دار اور دوست واحباب سے محبت کرتا ہے۔مجبور ومعذور انسانوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔خوبصورت نظاروں، جانوروں اور پرندوں سے اُسے دلچسپی ہوتی ہے۔

آواز کی دلکشی، چہرے کی نازکی اور معصومیت کردار کی سادگی اور سچائی، اشیاء کی صناعی اور کاریگری سب کی پہچان اور دلفریبی سے انسان فطری طور پر متاثر ہوتا ہے اور اسی خوبصورتی کے درمیان پرسکون زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔انسان کی یہی چاہت علم وفن کی جانب اس کی رہنمائی کرتی ہے۔گیت ،غزل ،قصہ ،کہانی سب انسان کی فطری امیجری کا کمال ہے۔جنہیں سیکھنے کے لئے اسے کسی استاد اور مدرسہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔قدرت اسے خود تربیت دیتی ہے۔انسان کا مزاج و کردار اس کے اسلوب وبیان میں نہاں ہوکر اظہار کی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔اگر فنکار کے داخلی کردار میں خلوص اور جذبہ کی صداقت کا جوش شاملِ بیان نہ ہوتو اس کی تحریر میں متاثر کرنے کا وصف بھی نہ ہوگا۔امیجری کا تعلق خاندان، معاشرہ، ذات اورنسل سے نہیں ہے۔یہ نعمت کسی کو وراثت میں بھی نہیں ملتی۔لیکن کوئی شخص اس سے محروم بھی نہیں ہوتا۔کم وبیش تمام انسان اپنی ایک مخصوص امیجری رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی فنی لطافت سے محظوظ ہونے کی صلاحیت بھی ان میں ہوتی ہے۔

جذبوں کی تہذیب وترتیب فنی امیجری کا کرشمہ ہی تو ہے۔مردوزن کے درمیان جنسی تعلق

کی استواری ایک فطری امر ہے۔لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا جاتا ہے وہی تہذیب ہے۔نکاح، ولیمہ اور دوسری رسمیاتِ شادی فروعی عمل ضروری ہیں مگر تہذیب کا لازمی حصہ بھی ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے انسان کو روٹی، کپڑا اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔انہیں حاصل کرنے کے لئے کون کون سے مدارج طے کئے جائیں گے اس کا تعلق انسان کے تہذیبی شعور سے وابستہ ہے۔ بچوں کی تربیت اور آپسی تعلقات کی استواری میں لفظوں کا انتخاب واستعمال کرنا بھی ایک فن ہے اور فن کی ترجمانی میں جذبوں کی صداقت وصراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقل کو یہاں جذبوں کی معاون قوت کے بطور کام کرنا ہوتا ہے۔تہذیب وثقافت کی تعمیر میں نہ جذبہ عقل کا غلام ہوتا ہے اور نہ عقل جذبوں کی محکوم۔مرد وزن کی طرح عقل ودل دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ان کے عمل میں تفریق بالکل نہیں ہوتی۔لیکن انسان جب دولت وشہرت کی ہوس میں گرفتار ہوتا ہے اور اقتدار واختیار کو اپنے تسکینِ نفس کا ذریعہ بنالیتا ہے تو خاندان اور معاشرہ میں ظلم وجبر کی راہ ہموار ہوتی ہے اور تمام اخلاقی قدریں معطل ہو جاتی ہیں۔تاویلاتِ عقلی کے ذریعے انسان اپنی بے راہ وری کے لئے جواز پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔توازن واعتدال کے ختم ہوتے ہی خاندان اور معاشرتی نظم وضبط بھی منتشر ہو جاتا ہے اور عدل وانصاف کے فطری تصوّراتِ زندگی پر زوال آتا ہے۔

آزادی اور مساوات کے سیاسی تصوّرات نے انسان کے فطری اور اخلاقی نظم شعور پر شدید ضرب لگائی ہے۔تمام دنیا کا نظمِ اخلاق صارفیت زدہ ذہنیت کا شکار ہو گیا ہے۔کوئی بھی نیک کام لوگ بغیر مطلب کے نہیں کرتے۔رشتہ داریاں اور دوستی یاری کے انتخاب میں بھی دولت، شہرت اور سیاست کا رول اہم ہو گیا ہے۔سائنس کی ترقی نے انسان کے سامنے معاش ومعیشت کے نت نئے راستے ہموار کر دیئے ہیں۔سماجی اور معاشی حالات پہلے سے بہتر ہوئے ہیں۔خون ریز جنگوں کا دائرہ کسی حد تک ضرور کم ہوا ہے۔بقولِ لارڈ برائس

> ''اگر ہم آج کی دنیا میں پیچھے مُڑ کر سولہویں صدی کی دنیا کی جانب دیکھتے ہیں تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ عوامی حکومت کے دوران تمام انسانوں کے مساوی حقوق قبول کئے جاتے ہیں۔انسانوں کو تکلیف پہنچانے والے بہت سے ذرائع کم ہو گئے ہیں اگر جمہوریت کے زیرِ سایہ وہ تمام

آسائش حاصل نہ ہو سکیں جس کی ہم اُمید کرتے تھے تو بھی اتنا تو قبول کرنا
ہوگا کہ بہت سی ظالمانہ حرکتیں، دہشت گردی، ناانصافی اور ظلم وستم کو جس نے
انسانی روحوں کو کئی پیڑھیوں سے زخمی کر رکھا ہے۔ کچھ ملکوں میں ختم کر دی گئی
ہیں اور کچھ ممالک میں بہت حد تک قابو کر لیا گیا ہے۔''

﴿Lord Bryce: Modern democracies vol.II Chapter LXXIII, Page 585﴾

مذکورہ اعترافات کو قبول کرنے کے باوجود دنیا سے غربت وافلاس، ظلم وناانصافی کا خاتمہ نہیں ہوسکا۔ لوگ آج بھی سرمایہ داری کے زیرِ دست زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان حقائق سے قطع نظر سیاسی آزادی اور مساوات کے تصور نے اخلاقی زندگی میں اک عجیب سی ہلچل پیدا کر دی ہے۔ خصوصاً عورت کی سیاسی، سماجی اور معاشی آزادی کے تصوّرات نے روایتی اخلاق کی مثبت قدروں پر ایسے سوالات کھڑے کر دئے ہیں جن کی کوئی اخلاقی حیثیت نہیں ہے۔ مثلاً Male dominate Socity کا مفروضہ اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ سیاسی معاشرہ پر مردوں کی اجارہ داری قائم ہے۔ نیز عورت کو دوئم درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ فطری معاشرہ کی تکمیل میں عورت مرد کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی تو معاشرہ کا وجود بھی نہ ہوتا۔ قانونِ قدرت کے مطابق عورت کی ذمہ داریاں مرد سے کہیں زیادہ اور مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن صارفیت زدہ زندگی کا حصہ بنا کر اسے کسی معروض کی طرح پیش کرنا بھی درست نہیں ہے۔ فلسفی، دانشور، فنکار، سائنسداں، تاجر، افسر اور سیاسی رہنما عورت کچھ بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن ماں، بیوی، بہن اور دیگر رشتوں کے بغیر نہ صرف عورت بلکہ مرد کا وجود بھی قابلِ اعتبار نہیں ہوسکتا۔ جذباتی اور اخلاقی رشتوں کو قبول کئے بغیر عالمِ انسانیت کے تمام سیاسی، معاشی اور تجارتی رشتے کبھی پائیدار نہیں ہوسکتے۔ حکومت وسیاست کے زور پر رشتوں کی آبیاری نہیں کی جاسکتی۔ اخلاقی رواداری کا فروغ مفاداتِ نفسی کو قبول کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ قوموں کے درمیان جذباتی رفاقت کا بحران روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ انسان حیات ومعاشرت سے برگشتہ ہو گیا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال (Solo Living) کا تصوّر رہے۔ تمام جذباتی قدریں نفسیاتی شعور کی زد میں آ کر قدرِ انسانیت کی تکریم وتحریم سے محروم ہو گئی ہیں۔

سیکولرازم (Secularism) کے مطابق سماجی جدلیت اور غیر عقلیت کے بعد ماضی پرستی (Traditionalism) فاشزم کا بنیادی عنصر ہے۔ اس کے برعکس ہیگل (Hegal) کا خیال ہے کہ کوئی ملک صرف اسی صورت میں ترقی کر سکتا ہے جب کہ وہ ماضی کی عظیم روایتوں سے واقف ہو اور اُن پر اپنے مستقبل کی بنیاد رکھی ہو۔ ایک درخت صرف اسی وقت شاداب ہو سکتا ہے۔ جب کہ اس کی جڑیں مٹی میں پیوست ہوں۔ آدمی کوئی علیٰحدہ اکائی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا وجود سماج میں ہے۔ اس کی روحانی اور اخلاقی قوتیں معاشرتی روایات سے پروان چڑھتی ہیں اور عالمی صداقتیں اسے مہمیز کرتی ہیں۔ ہیگل کے مطابق معاشرہ صرف موجودہ تہذیب کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ اس کی تعمیر میں گزشتہ پیڑھیوں کے تجربات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح ہیگل نے ثابت کیا کہ ریاست ایک روحانی اور جذباتی حقیقت ہے۔ موجود کو ماضی نے جوڑتی ہے اور مستقبل کی تعمیر میں بھی اس کا حصہ ہوتا ہے۔

مذکورہ خیالات کے مطابق سیکولرازم کا نظریہ اور ہیگل کا بیان دونوں ہی درست نظر آتے ہیں۔ سیکولرازم ایک سیاسی اصطلاح ہے اور سیاست ایک فلسفہ ہے اور فلسفہ کی نہ تو جذباتی حقیقت ہوتی ہے اور نہ اخلاقی۔ وہ صرف تاویلاتِ عقلی کے ذریعہ نمودگی حاصل کرتا ہے۔ اس کا فطرتِ انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ صرف ظاہری تناظر کی حقیقت پر یقین رکھتا ہے۔ اختلافات کے ذریعہ دلیل قائم کرنا اور دلائل کے ذریعہ نظری حقیقت کو سمجھنا ہی اس کا نفسیاتی وصف ہے۔ سیاسی فلسفہ میں بھی یہی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا جب کوئی خیال یا فطری اخلاقی نظریہ سیاسی فلسفہ کا شکار ہوتا ہے تو اس میں خیال کی رفعت و پاکیزگی برقرار نہیں رہتی۔ سیاست دان کے قول و فعل کا تضاد تمام دنیا میں مشہور ہے۔ فلسفیانہ خیال، افکار، نظریئے اور کردار کی سچائی منافقانہ ہوتی ہے۔ جس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل فاشزم کا بنیادی عنصر سیاسی اقتدار و اختیار کی بے جا خواہش ہے۔ اس اعتبار سے ہیگل کے خیالات درست ثابت ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، قاضی عبدالستار، اقبال مجید کے کئی افسانے ماضی کی بازیافت پر مبنی ہیں۔ مگر سیکولرازم کی تعریف کے مطابق ان پر فاشزم کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ ادب، ماضی، حال اور مستقبل تینوں ادوار کا ترجمان ہوتا ہے۔

پوسٹ ماڈرن ازم مباحث کے زیرِ سایہ تھیوریز (Theories) وضع کرنے کا سلسلہ

جاری ہے۔ اس کی اہم وجہ فلسفہ کا زوال ہے۔ خاص طور پر کارل مارکس کے معاشیاتی فلسفہ کا زوال ایک تاریخی حقیقت ہے جس نے امریکی ناقدین کو مارکس کے جدلیاتی تاریخی نظریئے پر تنقید کا حوصلہ بخشا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اردو زبان وادب کے بعض بہت معتبر ناقدین ادب اور اساتذہ کارل مارکس کے جدلیاتی تاریخی نظریئے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مغربی فلسفہ کو فروغ دینے میں سر آئزک نیوٹن کے قانونِ ثقل نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ حالانکہ اس حقیقت کو مغربی نظریہ ساز دانشور قبول نہیں کریں گے مگر حقیقت یہی ہے اگر سر آئزک نیوٹن نہ ہوتے تو چارلس ڈارون، کارل مارکس، سگمنڈ فرائڈ جیسے فلسفی آئن اسٹائن اور ہاؤ ژن برگ جیسے سائنسداں بھی نہ ہوتے۔ مثلاً کششِ ثقل کا نظریہ مشہور ہوا تو اس سے متاثر ہو کر چارلس ڈارون نے جدلیاتی نظریہ وضع کر لیا۔ کارل مارکس نے اس نظریہ کا اطلاق جدلیاتی تاریخی معیشت پر کیا اور فرائڈ نے جدلیاتی تصورات کی بنیاد پر تحلیل نفسی کا نظریہ پیش کر دیا۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کارل مارکس نے اپنی کتاب ''داس کیپٹل'' کا انتساب چارلس ڈارون کے نام کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے منع کر دیا۔ اس کے علاوہ کارل مارکس ہیگلین (Hegalian) فلسفہ کا استاد تھا۔ اس نے ایک بار کہا تھا:

''میں نے ہیگل کے فلسفہ کو سر کے بل کھڑا پایا تو اُسے اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا۔''

مابعد جدیدیت عنوان سے ایک لامتناہی بحث کا سلسلہ چھیڑنے کا مقصد زبان وبیان کی فطری سمجھ اور شعور کو مادیاتی تفکرات کی تعمیر وتشکیل پر معمور کرنا ہو سکتا ہے تاکہ جدید علوم وفنون کے غیر فطری اور نظری حقائق کی ترجمانی کو زیادہ موثر اور قابلِ اعتبار بنایا جا سکے۔ دیگر علوم وفنون کی طرح زبان وبیان کا علم اور الفاظ کی تفہیم وتعیم مشرقی تہذیب وثقافت کی پیداوار ہے۔ اس سلسلہ میں مصر، ایران اور ہندوستان کا نام لیا جاتا ہے۔ کسی مغربی ملک کو زبان وبیان کی ترسیل وتہدید میں کوئی سبقت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ساختیات، پسِ ساختیات اور ردِ تشکیل جیسی تھیوریز کے ذریعہ زبان وبیان کے فطری شعور وادراک میں دراڑ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ مغربی فن اور فلسفہ کی انفرادیت ثابت کی جا سکے۔ زبان وبیان کی شکست وریخت کے لئے، علامتی بیانیہ اور غیر بیانیہ، جیسے مفروضات وضع کر لئے گئے ہیں جن کی کوئی جذباتی اور اخلاقی حیثیت نہیں ہے۔

عام طور پر افسانے اور ناول غیر جذباتی طرزِ بیانی سے معمور ہوتے ہیں۔ خصوصاً حقیقت پسندی کے بیان میں جذباتی امیجری کی نرم ونازک آہٹیں کم ہی سنائی دیتی ہیں۔ بیان اپنے موضوع کا رہین ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں عورت اور مرد کے درمیان جنسی، نفسی اور سماجی مسائل کے بیان میں، آزادی اور مساوات کے سیاسی تصوراتِ نفسی کو معیارِ صداقت بنا کر فطری اخلاقی قدروں پر محاسبہ قائم کیا جاتا ہے۔ غیر اخلاقی امور زندگی اور ضرورتوں کے درمیان انسانی شخصیت کے مثبت خدوخال تلاش کرنا بھی ایک دشوار گزار عمل ہے۔ انتظار حسین نے سماجی جدلیت کی موجودہ روش کے خلاف تہذیب وثقافت کی فطری صداقتوں سے اکتسابِ فن کرتے ہوئے قصہ، کہانی اور داستان کی رمزیت کو افسانوی شکل میں منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اظہار وبیان کو ایک ایسے اسلوبِ نگارش سے آشنا کیا جس کی جڑیں مشرقی تہذیبی روایات کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں ماضی سے جذباتی وابستگی کا عمل اس قدر شدید ہے کہ قاری ایک ٹھہر کے دورِ گزشتہ کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اکیسویں صدی کی سیاسی حقیقت پسندی کے جوش نے تخیلاتی فضا کی تعمیر میں فطرتِ انسانی کے مرتب کردہ ڈکشن کو فراموش کیا ہے۔ جدید افسانہ اور ناول نگار عام طور پر اپنا ایک غیر جذباتی وژن رکھتے ہیں۔ اس لئے واقعہ خواہ کتنا ہی دردناک اور حقیقت آمیز کیوں نہ ہو حسنِ بیان سے عاری ہوتا ہے۔ افسانہ کا اختتام میرؔ ومومنؔ کی غزل کے مقطع کی طرح دلچسپ اور ڈرامائی تاثرات سے بھرپور بھلے ہی نہ ہو مگر نتیجہ خیز تو ہونا ہی چاہئے تاکہ قاری کو غور وفکر کرنے پر مجبور کیا جاسکے۔ حالانکہ جذباتی اور اخلاقی موضوعات زندگی کے معاشی وسیاسی اور سماجی مسائل کے حل میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن انسان کی باحِس ذہنیت کو بے حسی کے کرب سے بچانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ انسانی ذہن کا کردار کسی کمپیوٹرائز مشن کی طرح اپنے وجود کی توانائی سے محروم ہو کر محض عقلی دلائل کا محتاج ہو جائے گا۔ موجودہ سیاسی اور صارفیت زدہ معاشرہ اور انسان کی بے اعتنائی اور بے اعتدالی نے خواہشاتِ نفسی کو اس قدر تقویت دی ہے کہ قدرِ انسانیت کے تمام جذباتی محاکات پر زوال آگیا ہے۔ اس لئے ایک بار پھر قصہ، کہانی کی صحت مند روایت کی طرف مراجعت ضروری ہے تاکہ تخیلاتِ انسانی کو مثبت خیالات کی دنیا آباد کرنے کا حوصلہ مل سکے۔ ☆☆

☆............ڈاکٹر ریاض توحیدی

# علامتی افسانہ.... تخلیقی مضمرات

لغوی اعتبار سے علامت کے معنی نشان، مارک، سراغ، کھوج، اشارہ، کنایہ وغیرہ ہیں۔ اصطلاحی مفہوم میں علامت نمائندگی کا ایک ایسا وسیلہ ہے جو کسی لفظ، شئے، کردار یا تصورّ کو کسی خاص معنی، مقصد یا مفہوم میں پیش کرتا ہے۔ مثلاً پھول ایک شئے ہے۔ یہ محبت کی علامت بھی ہے اور ماتم کی نشانی بھی۔ اب یہاں پر پھول کے حقیقی معنی کے برعکس جو دوسرے معنی سامنے آتے ہیں، اس کی نمائندگی علامت کرتی ہے۔ علامت سازی کی اہمیت پر چارلس بودلئیر (Charles Baudelaire) روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تاثرات کی تہہ میں جو ایک اساسی عالم چھپا ہوا ہے، اس کے رموز کا اظہار صرف علامتوں کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔''

کسی بھی لفظ یا شئے کے علامتی اظہار کا مدار ماحول کی کیفیت میں مضمر ہوتا ہے۔ اب شعرو ادب میں علامت نگاری کی بات کریں تو شعر و ادب میں علامت کا استعمال تخلیقی اظہار کا ایک معنی خیز وسیلہ ہے، اسی بنیاد پر علامت کو ''تخیلی تجربات کی گاڑی'' (Vehical for imagnative experience) بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ علامتی اسلوب، کسی بھی تخلیق کی امکان خیز معنویت میں توانا کردار ادا کرتا ہے اور تخلیق کی معنوی جہات میں وسعت پیدا کرنے کا تخلیقی وسیلہ بنتا ہے۔

افسانے میں علامتوں کے استعمال اور معنوی تہہ داری پر بات کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''علامتیں ایک طرح کے وسیع استعارے ہیں جن کے شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کر دیتا ہے۔ علامتوں کے حسی پیکر ہوتے ہیں، لیکن بعض علامتوں سے افسانہ نگار فضا آفرینی کا یا محض خاص طرح کے تاثر ابھارنے کا کام لیتا ہے۔ ایسے افسانے کا کمال یہ ہے کہ وہ لغوی اور علامتی دونوں سطحوں پر پڑھا جا سکے۔ بعض افسانوں میں خاص خاص لفظوں کا استعمال ایسی معنوی وسعت اختیار کر لیتا ہے کہ ان میں علامتی افسانہ کی شان از خود پیدا ہو جاتی ہے۔''

(فکشن کی شعریات، تشکیل وتنقید..ص.۲۵۱)

علامت کو 'تخلیق کا حسن' بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک علامتی افسانہ یا شعر کی قرأت میں جو فنی حسن اور معنی خیزی کا لطف موجود ہوتا ہے وہی اس کی تخلیقیت کا موثر فنی جواز فراہم کرتا ہے۔ علامتی اظہار میں جو مثبت معنوی ابہام پوشیدہ رہتا ہے وہ تخلیق کی تنقید و تفہیم کے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر کوئی بھی باخبر ناقد اور باشعور قاری علامتی تخلیق کی معنوی جہات کی تفہیم اپنی اپنی علمی بصیرت کے مطابق کرتا رہتا ہے۔ تفہیم کا یہ تصوراتی اظہار ہی ایک علامتی تخلیق کی کامیابی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک معمولی شعر یا افسانے میں جو عام سے خیالات پیش کئے جاتے ہیں وہ معنی کے اکہرے پن کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس تعلق سے پروفیسر مجید مضمر اپنی تصنیف ''اردو کا علامتی افسانہ'' میں لکھتے ہیں:

''ادب میں علامتوں کا استعمال کئی طرح سے ہوتا ہے۔ کہیں الفاظ یا زبان سے، کہیں تصورات سے، کہیں پیکروں سے اور کہیں پر کردار یہ کام انجام دیتے ہیں اور کہیں واقعات علامتی روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ مفروضہ بے بنیاد ہے کہ ادب میں صرف زبان یا الفاظ کے ایک خاص استعمال سے ہی علامتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ اگر چہ علامت کی ترسیل زبان

کے ذریعہ ہی سے ممکن ہے کیونکہ ''زبان سے آگے جانے کا راستہ بھی زبان ہی سے گزرتا ہے'' لیکن زبان کا علامتی استعمال علامتی فکر سے الگ کوئی معانی نہیں رکھتا۔ دراصل علامتی لفظ اور علامتی فکر دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کے علاوہ علامتوں کی ایک اور سطح بھی ہے یعنی کبھی کسی ادبی تخلیق میں لفظ' کردار یا کوئی واقعہ بطور علامت استعمال ہوتا ہے' جس سے پوری تخلیق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور کبھی پوری تخلیق علامتی روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ادبی علامت اور علامتی ادب میں اس طرح یہی فرق ہے کہ آخر الذکر ایک علامتی کل ہوتی ہے جبکہ اول الذکر اسی کل کے جز کا کام دے دیتی ہے۔ علامتی تخلیق کے عناصر تخلیق سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ پوری تخلیق کے اجزاء بن کر اس کی مکمل ساخت کو تشکیل دیتے ہیں۔'' (اردو کا علامتی افسانہ۔ ص ۲۵)

علامتی اسلوب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس اسلوب کی ضرورت ماحول کے تابع ہے یعنی اگر کہیں پر حالات اتنے سنگین ہیں کہ کوئی قلمکار اپنی بات عام فہم انداز سے نہیں کر سکتا ہے تو وہاں پر علامتی اظہار کی ضرورت پڑتی ہے لیکن علمی وفنی نقطہ نگاہ سے یہ رائے صحیح نہیں ہے کیونکہ علامتی اسلوب' فنی اظہار کا ایک تکنیکی اسلوب (Technical Style) ہے جو بقول ڈبلو۔ بی۔ ییٹس ''تمام اسلوب کا جوہر ہے۔'' (The substance of all style)۔

فنی طور پر کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیق میں الفاظ وخیال کا علامتی برتاؤ معنوی جہات کی تفہیمی راہیں استوار کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بطور مثال پروفیسر حامدی کاشمیری کے درجہ ذیل شعر دیکھیں تو علامتی اسلوب کی معنوی جہات کا تصور واضح ہو سکتا ہے۔

جتنے بھی اہل گلستاں تھے' ہوا کی زد میں تھے
طائران صبح کس کو حوصلہ دیتے رہے
ان کا شوقِ کوہ پیمائی جنوں انگیز تھا
اہل وادی دیر تک ان کو صدا دیتے رہے (خواب رواں)

اب افسانے میں علامتی اسلوب کی بات کریں تو اس مناسبت سے کئی مثالیں پیش کی

جاسکتی ہیں۔ اختصاراً درجہ ذیل اقتباسات بھی مناسب رہیں گے۔

''شیخ ابوالعباس اشقاقی ایک روز گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک زرد کتا ان کے بستر میں سو رہا ہے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ شاید محلے کا کوئی کتا اندر گھس آیا ہے۔ انہوں نے اسے نکالنے کا ارادہ کیا مگر وہ ان کے دامن میں گھس کر غائب ہوگیا۔ میں یہ سن کر عرض پرداز ہوا:

''یا شیخ' یہ زرد کتا کیا ہے؟'' ''فرمایا' زرد کتا تیرا نفس ہے۔''

(افسانہ: زرد کتا۔ انتظار حسین)

''لیکن عجیب بات تھی۔ بے حسی میں صدیاں بیت گئی تھیں مگر احساس کی بیداری کے بعد ایک لمحہ بھی اس کیفیت میں نہیں گزارا جا رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مکمل کوشش اور وہ کوشش ناکام رہی۔ پھر کوشش کی اور....اور پھر میں اٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔''

(افسانہ: سرنگ۔ سریندر پرکاش)

''ہوا آئی تو وہ بھی یہی خبر لائی۔ پھر تو جو بھی آیا' یہی خبر لایا۔ ایک ہی خبر....اور پھر....خوف اور مایوسی نے جسم کے خوبصورت حصوں پر تعمیر شدہ مسرت' آزادی اور امنگ کی خوبصورت عمارتوں کو منٹوں میں ڈھا دیا اور اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔

ہواؤں کی دیواروں پر لکھی تحریر سے آنکھیں موندی جاسکتی ہیں لیکن پلکوں کی دیواروں پر لکھی تحریریں! تمام دروازے' کھڑکیاں' روزن اور ہر وہ گوشہ بند کر دیا گیا جس سے باہر کے ذرے کے آنے کی امید بھی کی جاسکتی تھی۔

لوگ گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے لیکن سکون سڑکوں پر آزادانہ گھوم رہا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اسے بند کمروں سے نجات ملی تھی...یعنی بات الٹی ہوگئی تھی' لوگ گھروں میں اور سکون سڑکوں پر۔ میں نے اپنے بچے کھچے دل سے کہا یہ بہت برا ہوا۔

زبان نے فوراً اس کی تائید کی....بہت برا ہوا۔''

(افسانہ: اندھیرے میں چلنے والے...عبدالصمد)

''اجنبی سائے چیخ چیخ کر رونے لگے اور بین کر کے موسیٰ سے پوچھنے لگے۔کیا خوف ہی سب کچھ ہے؟ نہیں....وہ تو محض ابتداء ہے۔خون گاڑھا ہو کر جمنے لگا۔پانی جو سورج کی گرمی سے اڑا تو جمتا خون بساند بھی دینے لگا۔کاویاء شکلیں بدل کر ڈرانے لگا مگر اجنبی سائے یونہی ایک دوسرے کا گوشت کھا کھا کر پلنے لگے۔وہ اپنی دستار پر ستارے سجائے میلے پر قبضہ جمانے لگے۔ہتھیار آگ برسانے لگے۔چرند پرند بھاگنے لگے۔بستیاں لاشوں سے پٹنے لگیں....محابا، مردہ سایوں کو جگانے لگا۔اجنبی سائے حیران نظروں سے اس سے پوچھنے لگے....کون ہیں ہم؟ محابا، اجنبی سایوں میں مسیحا ڈھونڈنے لگا.....محبت کرو اپنے جیسوں سے کہ تمہیں اس نے محبتوں سے پیدا کیا۔اجنبی سائے چیخ چیخ کر ہنسنے لگے اور بے حیائی سے عیسیٰ سے پوچھنے لگے۔کیا محبت ہی سب کچھ ہے؟''      (افسانہ ''ستیہ کے بکھرے ہوئے بال''....ڈاکٹر بلند اقبال)

تخلیق کی کامیابی کا انحصار تخلیقیت (Creativity) پر ہوتا ہے۔جو ذہن تخلیقی طور پر جتنا زرخیز ہوگا تو اس کی تخلیق میں بھی اتنی ہی تخلیقیت موجود ہوگی۔علامتی اظہار کا تعلق بھی تخلیقی زرخیزی سے جڑا ہوا ہے۔اب یہ تخلیق کار کے تخلیقی رویہ (Creative Attitude) پر منحصر ہے کہ وہ تخلیق میں اپنے خیالات کو راست بیانیہ میں پیش کرتا ہے یا علامتی اسلوب اپناتا ہے۔علامتی اسلوب کے لئے علامتوں کا صحیح اور واضح شعور ہونا ضروری ہے تاکہ تخلیق کار صحیح تصوّر کے ساتھ کسی علامت کا استعمال کر سکے اور یہ حد سے زیادہ تجریدیت کا شکار ہو کر مہمل تصور نہ بن جائے۔تخلیق میں علامت کا استعمال پہلودار معنویت کا غماز ہوتا ہے اور سودمند بھی، لیکن اس میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو علامت استعمال کی جارہی ہے یا تو اس کا تصور تخلیق کار اور قاری کے ذہن میں بھی واضح ہو یا تخلیق میں وہ اس طرح سے مستعمل ہو کہ موضوع کے ماحول کے مطابق وہ اپنی مخصوص معنوی جہت بنا سکے۔مثلاً، کبوتر امن کی علامت ہے۔اب اگر یہ بطور علامت کسی تخلیق میں مستعمل ہوگا تو قاری

کے ذہن میں پہلے ہی اس کا علامتی تصور یا جواز موجود ہے' اسلئے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی افسانے میں کالا دیو کی علامت لائی جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ یا تو دیو کے اصلی تصوّر کا فنی اظہار ہونا چاہیئے یا پھر یہ علامت کسی مخصوص تصور مثلاً کسی ظالم و جابر قوت' انسان' حکمران' نظام' یا سیاسی وسماجی ظلم وستم کا تخلیقی اظہار ہونا چاہیئے۔ اس قسم کے فنی اظہار کی صراحت درجہ ذیل اقتباسات سے بھی ہوسکتی ہے:

''پولیس والا ہاتھ میں ڈنڈا گھماتے ہوئے چپ چاپ اپنے قدم آگے بڑھانے لگا۔ وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دھند میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھیلتی دھند میں لپٹے سرسبز درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھے کبوتروں کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں اور وہ بکھرتے گھونسلوں کو کوؤں کی یلغار سے بچانے کے لئے اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ کبوتروں کی بدحواسی دیکھ کر وہ سرد آہ بھرتے ہوئے سوچنے لگا کہ دہائیوں سے ان کبوتروں کی روح زخمی ہو رہی ہے' کب انہیں کوؤں کی یورش سے نجات ملے گی۔'' (افسانہ: سفید کبوتر۔ ریاض توحیدی)

افسانے میں علامتی اظہار عنوان' کردار' موضوع' چند جملوں اور کبھی کبھی پورے متن میں بھی چھایا رہتا ہے لیکن اس کے لئے اہم بات یہ ہے کہ تخلیق کار علامتی اسلوب اپناتے ہوئے تخیل کے سیال تصوّر کو معنی خیز تصوّر کی ترسیل کرنے پر قادر ہو' نہیں تو وہ تخلیق ایک بے معنی پہیلی کے سوا کچھ بھی نہ ہوگی۔ تخلیق کی کامیابی کا انحصار فنی رموز کی شناسائی اور پہلودار معنویت پر ہے۔ فنی اور معنوی طور پر افسانے کے متن میں تخلیقی رچاؤ ہونا چاہیئے نہ کہ کسی واقع یا خیال کو صحافتی انداز سے روداد نما بنایا جائے۔ تخلیقی رچاؤ کے لئے علامتی اسلوب بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ متن میں امکان خیز معنویت پیدا کرتا ہے اور قرات کے دوران قاری کا ذہن متن میں پوشیدہ معنی ومفہوم اور کیفیت وتاثر کے کئی تفہیمی جہات انگیز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی علامتی شعر یا افسانے کی تفہیم باشعور قارئین مختلف زاویوں سے کرتے رہتے ہیں کیونکہ علامتی تخلیق کے متن میں معنی سے زیادہ مفہوم کو انگیز کرنا پڑتا ہے' اس لئے علامتی تخلیق میں لفظ کے لغوی مفاہیم کے علاوہ وسعت پذیر معنوی انسلاکیت مضمر ہوتی ہے۔ علامتی اسلوب کی یہ وسعت پذیر معنوی انسلاکیت درجہ ذیل

اقتباس سے بھی ظاہر ہوتی ہے:

''ریوڑ کی حفاظت کی خاطر دائیں بائیں' آگے پیچھے چند خوانخوار کتے لمبی لمبی زبانیں نکالے رال ٹپکاتے دوڑ رہے ہیں' بھیڑوں کی معمولی حرکت پر بھی ان کی کڑی نظر ہے۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ ریوڑ سے کٹ کر دوسری سمت مڑ گئی ہے۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوگی کہ ایک محافظ کتے کی نگاہ اس پر پڑ جاتی ہے اور وہ غرا کر اس پر جست لگا دیتا ہے. کتے کے تیز اور نکیلے دانت بھیڑ کی گردن میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ دوسرے کتے بھی غراتے ہوئے اس گمراہ بھیڑ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں کہ چند لمحوں بعد وہاں ادھ چچھوڑی ہڈیوں' ریت میں جذب لہو کے بڑے بڑے دھبوں اور بھیڑ کی بھوری کھال کے خون آلود چیچھڑوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ دیگر بھیڑیں سہمی ہوئی نظروں سے اس منظر کو دیکھتی ہیں اور خوف و دہشت سے ایک دوسرے میں یوں سمٹ سکڑ جاتی ہیں کہ دور سے پورا ریوڑ زمین میں رینگتے ایک بھورے بادل کی مانند دکھائی دیتا ہے۔''

(افسانہ: معبر... سلام بن رزاق)

افسانے میں علامتوں کا تخلیقی استعمال اسی وقت مفید ثابت ہوتا ہے جب افسانے کی علامتی فضا بامعنی افسانوی اظہار کی حامل ہو اور اس کے متن میں کہانی پن کے ساتھ ساتھ خیالات کا ٹھوس پن بھی موجود ہو، تاکہ افسانے کے علامتی ماحول کی تفہیم میں کوئی بے معنویت یا بے مقصد ابہام موجود نہ رہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی علامتی افسانے میں مستعمل تراکیب اور جملوں کی ساخت کا صحیح ادراک ہونا لازمی ہے تاکہ تخلیق کار کسی بے معنی ترکیب یا جملے کو علامت سمجھ کر خود بھی دھوکے میں نہ رہے اور قاری کو بھی ذہنی الجھن میں نہ ڈال سکے۔ تنقیدی نقطہ نگاہ سے ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ کسی بھی علامتی تخلیق کی تفہیم و توضیح کے دوران صرف متن سے سروکار رکھنا ضروری ہے اور اسی کے دائرے میں رہ کر تشریح و توضیح کرنا صحیح طریقہ و تجزیہ ثابت ہو سکتا ہے' نہیں تو معاملہ سوال از آسمان جواب از ریسماں کے مثل بن جائیگا۔

اردو میں کافی تعداد میں علامتی افسانے تخلیق ہوئے ہیں اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے چند افسانوں کا ذکر (جو اس وقت یاد آ رہے ہیں) کرنا مفید رہے گا۔

''سلطان، وحشی'' (احمد ندیم قاسمی)' غالیچہ (کرشن چندر)' آخری آدمی کا یا کلپ' وہ جو کھوئے گئے (انتظار حسین)' ماچس، کمپوزیشن دو (بلراج مین را)' دوسرے آدمی کا ڈرائینگ روم' بجوکا (سریندر پرکاش)' لمحے کی موت (غلام الثقلین)، پرندے، چوراہا (انور سجاد)' میگھ ملہار (ممتاز شیریں)' معبر (سلام بن رزاق)' اندھیرے میں چلنے والے (عبدالصمد)' سرنگ (سریندر پرکاش)' اندھے پرندے کا سفر' پرندہ پکڑنے والی گاڑی (غیاث احمد گدی)' جلاوطن (عبداللہ حسین)' اپنا گوشت' تفتیش (شوکت حیات)' اور ٹائم (منشایاد) ہارا ہوا پرندہ (مظہرالزماں) آسمان، پھول اور لہو (نور شاہ)' شہر کا اغوا (عمر مجید)' ڈاکو پھر واپس آ گئے (نورالحسنین) بھوکا ایتھوپیا (مشرف عالم ذوقی) ارسطو کی واپسی (وحشی سعید) گھونسلہ (دیپک بدکی) پہلا چہرہ (زاہد مختار)' ہاؤس ہوسٹس' عمارت (پروفیسر غضنفر) رنگ' سوچ بورڈ کے نمبر' جنگل کے قیدی (مشتاق مہدی)' کالے دیوؤں کا سایہ' سفید کبوتر' سفید نور کا راز (ریاض توحیدی)' ستیہ کے بکھرے بال (ڈاکٹر بلند اقبال)' بابل کا مینار (ڈاکٹر اختر آزاد)' نقش فریادی (راجہ یوسف)' لاشے' اماوس نگری (سید تحسین گیلانی)' بددعا کرنے والے (سلیم سرفراز) وغیرہ۔

☆☆

☆..........فردوس جبین

# اردو ادب میں ہم ترجمہ کی روایت

کسی بھی متن کے ایک سے زائد ترجمے ''ہم ترجمے'' (C0-translations) کہلاتے ہیں۔ یہ ہم ترجمے ایک ہی متن کے ایک سے زائد ترجمے ایک ہی زبان میں ہوتے ہیں یا الگ الگ زبانوں میں بھی ہوتے ہیں۔ ہم ترجموں کے مترجم مختلف ہوتے ہیں یا ایک ہی مترجم کئی ترجمے بھی کرتا ہے۔

ترجمے کا اصل مقصد متن کے خیال اور مفہوم کو واضح طور پر بیان کرنا ہے۔ ایسا کرنے میں الفاظ کا انتخاب اہمیت کا حامل ہے۔ ایک ہی متن کے ہم ترجموں میں یکسانیت بھی ہوسکتی ہے اور فرق بھی ہوسکتا ہے یعنی ہر ترجمے کے مترجم کے الفاظ کا انتخاب، اسلوب اور طرز بیان کا طریقہ مختلف ہوتا ہے کہیں کہیں ہم ترجموں میں مماثلت ظاہر ہوتی ہے تو کہیں فرق نظر آتا ہے۔ بحروں کے انتخاب میں فرق بھی ایک اہم پہلو ہوتا ہے۔ ہر مترجم اپنے ترجمے میں الگ الگ بحروں کا انتخاب کرتا ہے۔ اسکے علاوہ تشبیہات، استعارات، کنایات وغیرہ بھی ایک مترجم کے ترجمے میں فرق یا یکسانیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

ہم ترجموں کے وجود میں آنے کی ایک اہم وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ایک مترجم دوسرے مترجم کے کئے ترجمے سے مطمئن نہیں ہوا ہو اور اس نے اسی متن کا خود ترجمہ کر ڈالا۔ ''سازِ مغرب'' نامی معروف کتاب میں صرف ۹۵ انگریزی شاعروں کی ۲۳۳ نظمیں ہی ہمارے شاعروں کی توجہ کا مرکز بنیں اور ہمارے شاعروں نے نئی نئی نظموں کا ترجمہ

کرنے کے بجائے اس مختصر ذخیرہ سے نظموں کا انتخاب کیا اور ۹ ۷ ۴ منظوم ترجمے پیش کئے۔

ان منظوم ترجموں کو ڈاکٹر حسن الدین احمد نے بہت ہی دلکش انداز میں مرتب کیا ہے۔ ان منظوم ترجموں میں انگریزی کے کئی مشہور نظموں کے ہم ترجمے بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد کی آرزو رہی کہ انگریزی نظموں کے اردو منظوم تراجم کو ایک ساتھ جمع کیا جائے ان کے مطابق!۔

"دوسری زبانوں کی نظموں کے منظوم تراجم کو اردو شاعری کی ایک مستقل صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں انگریزی نظموں کے تراجم کی تعداد زیادہ ہے۔ ان ترجموں نے اردو ادب کو جدید خیالات، نئی تشبیہات اور تازہ استعارے دیئے اور شاعری کو ایک نئی جہت میں وسعت دی۔" [۱]

اردو میں انگریزی نظموں کے تراجم اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ زبان شاعری اور موسیقی کے لئے بہت موزوں و مناسب ہے۔ شاعرانہ خیالات کو اس زبان میں بڑے ہی دلچسپ انداز اور لطیف جذبات کے اظہار کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندی کی وجہ سے اسے صوتی اعتبار سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو شاعروں نے انگریزی نظموں کے ترجمے کا مشکل کام انجام دیا تو انہیں کئی پابندیوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بامحاورہ ترجمہ، دوسرے شاعر کے خیالات کے ترجمے کی کوشش، ایک کامیاب ترجمہ کی پیش کش جس میں زبان کا صوتی نظام برقرار رہے اور بحر اور آہنگ کا انتخاب وغیرہ۔ بعض شاعروں یا مترجموں نے کافی کامیاب ترجمے کئے ہیں جس میں انہوں نے ہر اس بات کی پابندی کی ہے جو ایک نظم کے ترجمے میں حائل ہوتی ہے۔ بقول حسن الدین احمد

"ترجمہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ صرف اصل الفاظ کا صحیح لفظی ترجمہ ہو بلکہ مصنف کے نظریات، تصورات اور احساسات کی صحیح ترجمانی بھی کرتا ہوا۔ اصل متن کی روح اسی طریقہ سے برقرار رہ سکتی ہے اور یہی درست تر جمانی ہے اور لفظی ترجمہ اور ترجمانی میں فرق یہ ہوتا ہے کہ ترجمانی ترجمہ سے دشوار اور نازک کام ہے۔ ترجمہ ایک باقاعدہ اور مستقبل فن ہے۔ ترجمہ کے فن میں مہارت اور قدرت پیدا کرنے کے لئے اور دوسرے ہنر کی طرح

شوق اور صلاحیت کے ساتھ ترتیب اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمہ ایک محنت کا کام ہے ایک طرف تو وہ سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسرے طرف اس فن کے اصولوں سے واقفیت بھی لازمی ہے۔'' [۲]

صوتی اعتبار سے اردو شاعری کا اپنا خاص انداز ہے۔ اردو شاعروں نے اپنے قلم کو حرکت دی تو بے شمار زنجیریں اس قلم کو جکڑی ہوئی تھیں۔ کامیاب اور بامحاورہ ترجمہ کی کوشش، دوسرے خیالات کی ترجمانی، پھر یہ خواہش کہ ترجمہ نہ رہے بلکہ درست ترجمانی معلوم ہو۔ اصل نظم کے جذباتی اثر کو قاری تک پہنچانا الفاظ کا صوتی اور لغوی انتخاب اور ترجمہ ترجمہ نہ رہے بلکہ درست ترجمانی معلوم ہو۔ اصل نظم کے جذباتی اثر کو قاری تک پہنچانا، الفاظ کا صوتی اور لغوی انتخاب اور ترجمہ کی بحر اصل سے ہم آہنگ ہونا یہ سب مترجم کی خاص ذمہ داری ہوتی ہیں۔ کامیاب ترجمہ جس میں اصل نظم کا حسن اسی طرح باقی رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ نظم میں استعاروں اور کنایوں کی موجودگی بھی رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔

انگریزی تخلیقات کے ترجمے اردو کی ضرورت بھی تھے اور مجبوری بھی۔ کئی شعرأ نے انگریزی نظموں کے ترجمے کئے تاکہ وہ لوگ بھی ادبِ فرنگ سے واقف ہوسکیں جو انگریزی نہیں جانتے تھے۔

انگریزی شاعری میں ترجموں کا بالواسطہ اثر اردو شاعری پر زیادہ نمایاں اور زیادہ دیرپا رہا ہے۔ اردو میں موضوعات کے محدود دائرے سے نکل کر تمام زندگی کا احاطہ کرنا، تخیل کی بلند پردازی، آفاقیت یہ سب انگریزی شاعری سے کئے گئے منظوم ترجموں کی بالواسطہ دین ہے۔ یہاں منظوم ترجموں کے محرکات کے فرق اور اثرات کے فرق کا تعلق صاف نظر آتا ہے۔ جو منظوم تراجم وقت کے مطالبات کے تحت کئے گئے تھے جیسے جواہر منظوم، گوہرِ شب تاب اور ترجمہ منظوم ان میں بیشتر مثنوی ہی کی ہیئت کو اختیار کیا گیا ہے۔ ان ترجموں میں باون منظوم ترجموں کو شامل کیا گیا ہے لیکن ایک بھی ترجمے میں نیا تجربہ نہیں کیا گیا۔ جب منظوم ترجموں کا رواج عام ہوگیا اور ان کا محرک اردو شاعری کو نئے تجربات اور نئے خیالات سے متعارف کرنا قرار پایا تو ان کے اثر کے تحت نئے انداز کی نظمیں لکھی جانے لگیں اور شاعری میں نئی جدت سے آشنائی ہوئی۔ روایت سے انحراف اور تجربے کی جھلک سے شعری

تخلیقات مانوس ہونے لگیں۔ منظوم ترجموں کے اثر کے تحت جو نظمیں لکھی جانے لگیں ان میں خیالات بھی نئے تھے اور سوچنے کا انداز بھی نیا تھا۔

انگریزی سے اردو میں سب سے زیادہ ہم ترجمے جن شاعروں کے ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ W.H Long Fellow کی نظموں A Pslam of Life کے ۱۶ ہم ترجمے ہوئے ہے۔ The arrow and the song کے ۸ ہم ترجمے ہوئے ہیں۔ day break کے ۴ ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۲۔ P.B Shelly کی نظموں Love's Philosophy کے ۱۲ اردو ہم ترجمے ہیں۔ The Rose of Summer کے ۱۱ ہم ترجمے موجود ہیں۔ To The Sky Lark کے تین ہم ترجمے اردو میں ہوئے ہیں۔

۳۔ Stopping By Woods On a Snowy Evening رابٹ فراسٹ کی نظم کے ۹ ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۴۔ Willam Words Worth کی نظمیں جس کے سات اردو ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۵۔ Thomas Gray کی نظم Elegy Writtening Country Churchyard کے ۷ ہم ترجمے اردو زبان میں کئے گئے ہیں۔

۶۔ William Shakespear کا مشہور ڈرامہ As You Like it کی نظم The Seven Stages of Man کے ۴ ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۷۔ فلشیا ہمینس کی نظم The Child is The First Grief کے ۵ ہم ترجمے ہوئے ہیں۔ Curfew, It Must Net Ring to Night کے چار اردو ہم ترجمے کئے گئے۔

۸۔ سروجنی نائیڈو کی نظمیں The Royal Tomb of Golkonda کے چار ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۹۔ William Barnes کی نظم The Mothers Dream کے دو ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ Thomas Moray کی نظم The Light Of Other Days کے تین ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۱۱:- Goldsmith Allure کی نظم The Hermit کے ۳ ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۱۲ رابندرناتھ ٹائیگور کی نظم Where The Mind is Without Fear کے پانچ اردو ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

۱۳ رابرٹ سدے کی نظم The Scholar کے چار ہم ترجمے ہوئے ہیں۔

اردو زبان سے انگریزی میں جن شعراء کے ہم تراجم وجود میں آئے ہیں۔ان میں اقبالؔ، غالبؔ ، میرؔ، فیضؔ، سوداؔ، فراقؔ ،مجازؔ، مجروحؔ وغیرہ ہیں۔فیضؔ کی غزلوں اور نظموں کا انگریزی میں ترجمہ داؤد کمال نے کیا ہے اوران کی کتاب کا عنوان The Unicorn and Dancing Girl جس میں فیض کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔

۱:-آغا شاہد علی نے فیض کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ The Rerbel's Silhouette نام کتاب میں کیا ہے۔

۲:- Selected Poems of Faiz نام کی کتاب میں شوکمار نے فیض کی اردو نظموں اورغزلوں کا انگریزی میں ترجمے کیا ہے۔

۳:- A Treasury of Urdu Poetry from Mir to Faiz کتاب میں کلدیپ سلیل نے میرؔ سے لیکر فیضؔ تک کے مشہور شعراء کی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔اقبالؔ، غالبؔ ،مومنؔ، قتیلؔ ،فیضؔ، میرؔ، دردؔ، ظفرؔ، فرقؔ، ساحرؔ، جوشؔ، مجروحؔ وغیرہ۔

۴:-The Best of Faiz Ahmad Faiz کے عنوان سے شوکمار نے فیضؔ کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۵:- مقبول الحق نے An Elusive Dawn کی کتاب میں فیضؔ کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۶:- (The Noble Science of The Ghazal, the Urdu Poetry of Mirza) نام کی کتاب میں Brian Quayle Silver نے مرزاغالبؔ کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۷:-اعجاز نے Ghazal of Ghalib کے عنوان سے مرزاغالبؔ کی غزلوں کا

انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۸:- Mirza Ghalib (Hundred Famous Ghazals) کے عنوان سے ڈاکٹر سروت رحمن نے غالب کی مشہور غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۹:- O.P.Kejriwal نے Ghalib - Ghalib in Translation کی کتاب میں غالب کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۱۰:- Diwan e Ghalib (Selected Ghazals) کے نام سے کنور راجندر سنگھ رانا نے غالب کی منتخب غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۱۱:- غالب کی فارسی شاعری کا پروفیسر شفیع شوق نے انگریزی میں ترجمہ Persion Poetry of Galib Translated With on Introduction میں پیش کیا ہے۔

۱۲:- K.C.Kanda نے Mirza Ghalib Selected Lyrics and Letters کے عنوان۔ سے غالب کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۱۳:- Master Pieces of Urdu Poetry Selscted Seven Eminent Urdu Poets کے عنوان سے K.C.Kanda نے اردو کے سات مشہور شعراء کے کلام کو انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ جن میں مرزا غالب، علامہ اقبال، فیض، ظفر، جوش، قتیل شفائی اور ساحر لدھیانوی کا کلام موجود ہے۔

۱۴:- K.C.Kanda نے Urdu Ghazals an Anothology from 16 to 20 Century کی کتاب میں اردو کے مشہور شعراء کا کلام انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

۱۵:- Master Couplets of Urdu Poetry by Sterling Publisher اس کتاب میں میر، غالب، اقبال، فیض کے ۱۴۰۰ اسو اشعار کا ترجمہ موجود ہے۔

جذبات کا شعر سے خاص رشتہ ہوتا ہے۔ خیال کتنا ہی سچا ہو، باریک کیوں نہ ہو لیکن اگر ان میں جذبہ، تڑپ شامل نہ ہو تو وہ بے جان، بے رنگ لگے گا اور نہ اس میں شاعرانہ خیال کی کوئی خوبی موجود ہوگی۔ شعر کو لکھنے میں جو الفاظ استعمال ہوں وہ آسانی سے سمجھ میں آنے کے قابل ہوں یعنی الفاظ کے استعمال سے مطلب اس طرح ادا ہونا چاہئے کہ اس کو سمجھنے میں زیادہ وقت درکار نہ ہو۔ مشکل الفاظ کے

استعمال سے احتراز جہاں تک ہو سکے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ان لفظوں کا استعمال کیا جانا چاہئے جن سے زبان مانوس ہے۔اس کے علاوہ ایسے الفاظ کا استعمال ضروری ہے جو اختصار کے ساتھ مطلب رکھتے ہوں۔یعنی کم سے کم الفاظ میں شعر کا مطلب ادا ہو جائے بلاضرورت طویل الفاظ کا استعمال شعر کے مطلب ادا کرنے کے لئے ضروری نہیں ہوتے۔لفظوں کا استعمال اس طرح ہو کہ جو کیفیت شاعر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ مکمل طور پر آنکھوں کے سامنے آجائے یعنی جیسی تصویر وہ پیش کرنا چاہتا ہے ہو بہو ایسی ہی تصویر قاری کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔اس کے جذبات واحساسات اور فکر وخیال کا ویسا ہی نقشہ قاری کے ذہن پر چھا جائے اور یہ کمال کسی زوردار کلام میں ہی موجود رہتا ہے۔

بعض الفاظ لطیف اور آسان ہوتے ہیں اور بعض زوردار اور دقیق ہوتے ہیں اس لئے جیسی بات کہنے کی ضرورت ہوتی ہے ویسے ہی الفاظ کا استعمال بھی ضروری ہے۔ایک ہی بات کئی طریقوں سے کہی جا سکتی ہے لیکن سب سے موزوں اور پر اثر طریقہ منتخب کرنا بھی شاعری کا اہم جز ہے۔ایسا طریقہ اپنا جائے جس سے صرف شاعر کے خیالات ہی نہیں بلکہ شعر میں پنہاں جذبات اور احساسات بھی سمجھ میں آسکے۔ایسا کرنے میں شاعر کے کلام کا مقصد پورا ہوتا ہے اور وہ قاری کے ذہن میں ہی نہیں بلکہ دل میں بھی اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔شعر کو پر اثر بنانے کا کام لفظوں کے انتخاب پر منحصر ہوتا ہے۔ایک زبان کے شعر کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بہت مشکل کام ہے، شعر میں خیال سے زیادہ اہمیت اثر کو حاصل ہے اور اثر کا انحصار وزن، ردیف، خاص الفاظ اور ان کی مخصوص ترتیب پر ہوتا ہے اسی لئے کسی خاص خیال کے حامل شعر کو اسی اثر کے ساتھ دوسری زبان میں ادا کرنے لئے اس زبان میں بھی ویسے ہی پر اثر لفظوں کو پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔کامیاب ترجمے کی تعریف یہی ہے کہ وہ اصل کے مطابق ہو۔لیکن شاعری کے ترجمے میں یہ ممکن نہیں ہے۔شاعری کا ترجمہ تب کامیاب ہوگا جب مترجم دونوں زبانوں پر مہارت اور غیر معمولی عبور رکھتا ہو۔اکثر شاعری کے ترجمہ کی تعریف میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اصل کے مطابق ہو۔لیکن شاعری کے ترجمے میں یہ ممکن نہیں ہے۔شاعری کا ترجمہ تب کامیاب ہوگا جب مترجم دونوں زبانوں کی ادبی روایت سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ہر زبان کا خاص مزاج اور رنگ ہوتا ہے۔جو اسے زبان کے تہذیبی اور سماجی پس منظر سے حاصل ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس

زبان کے بولنے والوں کا بھی اس زبان کے رنگ ڈھنگ پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ عام طور پر شاعری کا ترجمہ شاعری ہی میں ہوتا ہے۔ شاعری کے ترجمے میں منظوم ترجمے کے اصول ہی مفید ثابت ہوتے ہیں۔ انگریزی میں اکثر شاعری کے ترجمے آزاد نظم کی شکل میں ہوئے ہیں لیکن اردو کے مترجم کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جس صنف کا ترجمہ کر رہا ہے، ترجمے کی زبان میں بھی اسی صنف کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مغربی اصناف سخن جیسے سانیٹ، ہائیکو، ترائیلے، معرا نظم، آزاد نظم اور نثری نظم کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اصناف جیسے گیت، دوہے وغیرہ بھی اردو میں ترجمے کی بدولت ہی داخل ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہوا ہے لیکن اردو کے سوا ان کی رباعیات کی ہیت کسی دوسری زبان میں باقی نہیں رکھی گئی۔ کیونکہ دوسری زبانوں میں رباعی کی کوئی خاص ہیت موجود ہی نہیں ہے۔

کسی بھی نثر کا ترجمہ ایک پیچیدہ امر ہے۔ جس میں پہلے مصنف کے معنی و مطالیب کی Encoding ہوتی ہے پھر De-Coding رمز کشائی ہوتی ہے اور پھر مترجم ان معنی، مطالیب کی Re-coding رمز بندی کر کے ترجمے میں پیش کرتا ہے یعنی مترجم پہلے مصنف کے لکھے ہوئے متن کے معنوں کو دوسری زبان کے الفاظ کے ذریعہ قاری کے سامنے پیش کرتا اور ایسا کرنے میں اسے مصنف کے اسلوب اور مقصد کا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ معنی کے انتخاب، مصنف کی نفسیاتی سطح، اس کے خیالات، متن میں موجود ماحول، دلکشی، جذبات، فقروں اور جملوں کی ساخت وغیرہ کو ترجمے کی زبان میں ڈھالنا ضروری ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ اس متن کی رمز کشائی اور رمز بندی کرتے وقت مترجم کو خاصی توجہ دینی پڑتی ہے۔ پہلے تو مترجم اصل زبان کے متن کا اچھی طرح مطالعہ کرتا ہے پھر وہ اسکے فقروں، جملوں اور لفظی سطحوں کا جائزہ لیتا ہے۔ آخر میں مترجم اصل زبان کے متن کا مطلب سمجھتا ہے۔ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ایک مترجم کس طرح زبان کے مطالیب کی زمر بندی کرتا ہے یعنی اصل زُبان کے مطالیب کی رمز بندی (Re-coding) کرتا ہے یعنی اصل زبان کے مطالیب کو ہدفی زبان میں کس طرح پیش کرتا ہے۔ یہ کسی بھی ترجمہ کا سب سے اہم اور مشکل کام ہے کیونکہ یہاں اصل زبان کے لفظ کو اسی معنی کے ساتھ دوسری زبان میں ظاہر کرنا ہوتا ہے۔

ترجمہ کا کام بہت مشکل کام ہے۔ اس عمل کے دوران مترجم مصنف کی شخصیت، فکر اور

اسلوب کو اپناتا ہے۔اس زبان کی تہذیب جس کا ترجمہ کیا جارہا اسے سمجھنا ہوتا ہے اور دوسری طرح اس زبان کی تہذیب جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے، اسے اپنی طرف راغب کرتی ہے۔یہ مترجم کے لئے صبر آزما اور محنت والا کام ہوتا ہے۔اس دوہری اسلوب کی سطح پر خاص طور پر ترجمہ کی زبان کو افادیت حاصل ہوتی ہے۔اس زبان میں نئے اسالیب کے داخل ہونے کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔اردو جملوں پر انگریزی زبان کے جملوں کا گہرا اثر رہتا ہے۔اسالیب میں یہ تبدیلی دراصل تہذیب کی تبدیلی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ایک زبان کا لفظ یا جملہ جب دوسری زبان میں ضم ہوکر ترجمہ ہوجائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دو تہذیبوں کا وصل ہوگیا اور یہ کام تراجم کے ذریعہ ممکن ہے۔اگر صحیح نکتہ نظر سے ترجموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں اسالیب کا بڑا تنوع ملے گا۔جملوں کی ساخت ان کے مزاج، لب و لہجے اور آوازوں میں بڑی تہہ داری اور رنگارنگی محسوس ہوگی۔

ترجمے کے ذریعہ زبان کئی اعتبار سے پنپتی ہے۔ترجمہ ایک طرف الفاظ اور زبان کی نشو ونما کے ذریعہ انسانی علوم کے ذخیرہ میں اضافے کا سبب بنتا ہے تو دوسری طرف ذہنی صلاحیتوں کو بھی ترقی دیتا ہے۔ترجمہ علمی اعتبار سے دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے اور متن کا اس کی تمام اسلوبی رنگوں اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔ترجمے کے اس راستے کے ذریعہ علوم، فنون، تصورات، خیالات ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو سفر کرتے ہیں۔

ترجمے کی بدولت ہی انسانی تہذیبوں نے آپس میں لین دین کا کام کیا ہے۔ایک زبان کے علمی اور ادبی ذخیرے کے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا موقع ملا۔انسانی، تہذیبی یا علمی ترقی کسی ایک زبان، ایک ملک یا ایک قوم سے جڑی نہیں ہے بلکہ اس کی ترقی مجموعی طور پر انسانی ترقی ہے۔ترجمے صرف علوم وفنون کو منتقل کرنے کا کام ہی انجام نہیں دیتا بلکہ الگ الگ گروہوں کے درمیان باہمی تال میل بھی قائم کرتا ہے۔نثری تراجم کی دنیا میں سب سے بڑا کارنامہ ۱۰۰۰ء کی مادام موراسا (Lady Murasaki Shikibu) کے جاپانی قصے The Tale of Genji کا ترجمہ ہے جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

بقول ایڈورڈ جی۔سائیڈن اٹسکر Edward G Seidensticker

''جاپانی ادب کا اعلیٰ ترین رومانی نثری کارنامہ ہے۔'' ۳

نثری ہم تراجم نے اردو زبان کو کافی وسعت بخشی۔ نثری ہم تراجم میں آپ بیتی، افسانہ، تاریخ وادب، تنقید، داستان، ڈراما، روزنامچہ، رزمیہ، سفرنامہ، سوانح، قصہ، کہانی، مضمون انشائیہ، مزاح، ناول، ناولٹ وغیرہ شامل ہیں۔ تنقید کے میدان میں سب سے اہم ترجمے جو اردو زبان میں ہوئے ہیں وہ بوطیقا کا ترجمہ ہے۔ ارسطو کی ۲ ہزار سال پرانی اس تصنیف کے اردو میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔

نثری ہم تراجم کے میدان میں ڈراما اور ناول ایسی دو اصناف ہیں جن میں زیادہ اردو ترجمے کئے گئے ہیں۔ انگریزی ڈرامہ اور ناول کے اردو میں ہم ترجمے بھی وجود میں آئے ہیں۔ جارج برنارڈ شاہ کے انگریزی ڈراما Arm and The Man کا پہلا اردو ترجمہ خورشید نکہت نے ''محبت اور جنگ'' کے عنوان سے کیا اور یہ پہلی بار لاہور میں شائع ہوا۔

شیریڈن اور رچرڈ کا انگریزی ڈراما The Rivals کا اُردو ترجمہ فضل الرحمٰن نے ''نئی روشنی'' کے نام سے کیا۔ انگریزی کے ڈراموں میں سب سے زیادہ شکیشپئر کے ڈراموں کے اردو میں ترجمے کئے گئے ہیں۔ شکیشپئر کا ڈراما Macbeth کے تقریباً ۹ اردو ہم ترجمے موجود ہیں۔ King lear کے ۸ اردو ترجمے The Winter's Tale کے ۳ اردو ہم ترجمہ موجود ہیں۔

عزیز احمد نے ارسطو کی بوطیقا Aristotle poetics کا اردو ترجمہ ''فن شاعری'' کے نام سے کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تفصیلی تمہید مثالوں کے ساتھ فنِ تنقید کے اصول بیان کئے ہیں اور اپنے اردو ترجمے میں عنوانات کی واضح تقسیم پیش کی ہے۔ ارسطو کی بوطیقا کا ایک اور اردو ترجمہ ''شعریات'' کے نام سے شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کیا ہے۔ عزیز احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی دونوں مترجمین نے کافی تفصیلی تعارف اپنے ترجموں میں پیش کیا ہے۔ انگریزی میں یونانی سے ترجمہ (S.H Butcher) نے کیا ہے لیکن انگریزی ترجمے میں عنوانات پیش نہیں کئے گئے ہیں۔ بوطیقا کے دونوں ہم ترجمے فنی شاعری اور شعریات میں عنوانات کی تقسیم کے ساتھ ترجمے پیش کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ارسطو کے Aristotle Poetics کا اردو میں ترجمہ ''بوطیقا'' کے نام سے کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اپنے اردو ترجمے میں تفصیلی تعارف کے ساتھ ابواب کی تقسیم بھی پیش کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو ترجمہ ٹی۔ ایس۔ ڈورش (t.s Dosch) کے جدید ترجمے سے

کیا ہیں جسے ڈورش نے Ingram Bywater کے آکسفورڈ کلاسیکل متن سے انگریزی میں کیا جو ۱۹۶۵ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے S.H Butcher کی مدد لی ہے، وہیں دوسرے مترجم جیسے ٹی۔ایس۔ڈورش کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ ''بوطیقا''۔ ''فنِ شاعری'' John Warringhton اور ''شعریات'' یہ تین نام ایک ہی کتاب کے ہیں جو کہ ارسطو کی یونانی زبان میں بے حد مشہور و مقبول رہی ہے۔اس کتاب نے صدیوں تک شاعری پر اپنا اثر ورسوخ قائم کئے ہوئے ہے۔ Aristotle Poetics ارسطو کی وہ کتاب ہے جو شاعری پر پہلی مستقل تصنیف ہے جس نے کئی صدیوں تک یورپ کے ادب اور فنِ تنقید کو متاثر کیا ہے۔اردو کے تینوں اہم ترجموں میں مصنف کے مقصد کو واضح بیان کر دیا گیا ہے۔جس میں شاعری کی مختلف اقسام کا مطالعہ اور کامیاب شاعری کے رمز بھی موجود ہیں۔تمام عناصر کا مطالعہ اس کتاب کا اہم مقصد ہے۔شاعری کی مختلف اقسام شاعری کے حصے اور نوعیت کی تحقیق ہی مصنف کا اصل مقصد ہے۔

یہ سچ ہے کہ ترجمہ اصل کی طرح دلچسپ نہیں ہوسکتا پھر بھی وہ اصل کے مفہوم کو آسانی ظاہر کرسکتا ہے۔اصل مصنف کے مفہوم کو ترجمے کے ذریعہ پیش کیا جاسکتا ہے اور اس طرح ترجمہ تحقیق کو اہمیت دیتا ہے اور ساتھ ہی World Litrature کی ترقی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔بعض اوقات ترجمہ اصل سے بھی زیادہ دلچسپ اور خوبصورت بھی ہوسکتا ہے جس کے لئے اس میں کئی اور خصوصیات کو شامل کرنا پڑتا ہے۔

☆☆

## حوالہ جات


۱:- انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (ڈاکٹر حسن الدین احمد)

۲:- سازِ مغرب (اردو آہنگ میں) حصہ اول۔مرتب: ڈاکٹر حسن الدین احمد

۳:- مغرب سے نثری تراجم (انگریزی) اور مغربی زبانوں سے ادبی تراجم کی روایت۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ۔صفحات ۳۰،۲۴،۱۷


☆☆

اصل......رولاں بارتھ
ترجمہ......سبزار احمد بٹ

# تخلیق سے متن تک

حقیقت یہ ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے (ہمارے یہاں) تصورِ زبان سے متعلق ایک اہم تبدیلی رونما ہو چکی ہے اور نتیجتاً اس تبدیلی کے اثرات ہمارے تصورِ ادبی تخلیق پر مرتب ہو رہے ہیں کیونکہ جس منطقے کو ہم ادبی تخلیق کہتے ہیں وہ اپنے طبعی وجود کے لیے زبان کی محتاج ہوتی ہے اور مذکورہ تبدیلی کا تعلق بنیادی طور پر (دیگر کلامیوں کے علاوہ) لسانیات، بشریات، مارکسیت، تحلیلِ نفسی سے ہے۔ اس تعلق سے جو بات نئی ہے اور جس نے (قائم شدہ) تصورِ تخلیق کی قلبِ ماہیت کی ہے اس کی تولید مذکورہ کلامیوں کے داخلی تغیر و تبدل کے بطن سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے برعکس مذکورہ تبدیلی کا بنیادی محرک وہ منطقہ رہا ہے جس کے ساتھ حال ہی میں ان کلامیوں کو سابقہ پڑا ہے تاہم روایتاً یہ منطقہ ان میں سے کسی ایک کا بھی معروض نہیں رہا ہے۔ اس کو آج کل ہم ''بین المتونیت'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ بین المتونیت کے منطقے کو دورِ حاضر میں دنیائے تحقیق میں خصوصی اہمیت کے حامل تصور کے بطور قبول کیا جاتا ہے۔ تاہم اس کا حصول علم کے مختلف کلامیوں کو ایک ہی عرصے میں جمع کرنے سے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی بین المتونیت ان علوم کے استحکام و ہم آہنگی پر دلالت کرتی ہے بلکہ ٹھوس صورت میں اس میلان کا آغاز وہاں ہوتا ہے جہاں مذکورہ کلامیوں کے درمیان پائی جانے والی روایتی ہم آہنگی دولخت ہو جاتی ہے مزید درشتگی کے

ساتھ کہیے تو جہاں پر یہ ہم آہنگی جدید رویوں کے تداخل سے شدید طور پر شکست وریخت کا شکار ہو جاتی ہے جن کا بنیادی مقصد نئے علمی معروض اور محاورے کی تشکیل ہے اور اس معروض کا تعلق روایتی علمی منطقوں میں سے کسی ایک سے بھی نہیں ہے جن کو محفوظ و مستحکم عرصے میں مجتمع کر کے بین المتونیت کے خدوخال ترتیب دینا (روایتاً) ہمارا مقصود رہا ہے۔ عہدِ حاضر میں روایتی علمی منطقوں کی درجہ بندی کے حوالے سے ہم جو دقت محسوس کر رہے ہیں وہ اصل میں ایک ایسے نقطے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جس کے تناظر میں ایک مخصوص قسم کے تغیر کا مشاہدہ ممکن بن جاتا ہے۔ ایک ایسا تغیر جس کی وجہ سے روایتی تصورِ تخلیق اپنی معنویت کے مسلئے سے جھوجھتا ہوا نظر آ رہا ہے تاہم اس تغیر کے تعلق سے معتدل رائے قائم کرنے کی ضرورت ہے یہ تغیر ایک طرح کی علمی تقلیب پر دلالت کرتا ہے نہ کہ (روایت سے) کسی ٹھوس انفصال پر۔ جس انفصال کو آجکل اکثر پیش منظر میں جگہ دی جاتی ہے اس کا آغاز پچھلی صدی کے دوران ہوا، مارکسیت اور فرائڈیت اس صدی کے دو انقلاب انگیز رجحانات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کے بعد مذکورہ سلسلہء انفصال میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملی۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی ایک صدی سے ہم خود کو دوہرا رہے ہیں۔ جہاں تک ہماری تاریخ کا تعلق ہے تو یہ صرف ہمیں تغیر، تبدل اور توسیع کی اجازت دیتی ہے۔ جس طرح کہ آئنسٹائین کی سائنسی فکر اس بات پر زور دیتی ہے کہ حوالہ جاتی تناظر کی اضافیت کو مطلوبہ معروض کے تجزیے کے دوران مدِ نظر رکھا جائے، اسی طرح مارکسیت، ساختیات اور فرائیڈیت مشترکہ طور پر روایتی تصورِ تخلیق کی (ثالمیت) کے برعکس مصنف، قاری اور شاہد (ناقد) کے درمیان پائے جانے والے رشتوں کی اضافیت کو انگیز کرتی ہیں۔ روایتی تنقید آج بھی تخلیق کو نیوٹنی فکر کے تناظر میں دیکھتی ہے (اس کی رو سے فن پارہ ایک ٹھوس اور حتمی معروض کی حیثیت رکھتا ہے)۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک نئے معروض کو وضع کیا جائے، جس کا حصول تب ہی ممکن ہے جب روایتی اضافی زمروں کی قلب ماہیت کی جائے یا ان کو تحلیل کر دیا جائے۔ اور وہ نیا معروض متن ہے (جو روایتی اضافی زمروں کی تحلیل کے بعد وجود میں آتا ہے)، مجھے اس بات کا علم ہے کہ لفظ متن آجکل کافی عام ہو چکا ہے، اس کے باوجود کچھ حلقوں میں مذکورہ لفظ کو کافی مشتبہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں

(اس حوالے سے) چند کلیدی مفروضات کا اثبات ضروری سمجھتا ہوں ۔جن کے نقطہء انقطاع پر میرے خیال میں متن کا منطقہ (کلامیاتی سطح پر) ٹکا ہوا ہے ۔یہاں پر لفظ ''مفروضہ'' کو اس کے لسانیاتی تناظر میں استعمال کر رہا ہوں نہ کہ منطقی (فلسفیانہ) تناظر میں ۔ذیل میں ،میں جو مفروضات پیش کرنے جارہا ہوں وہ دلائل سے زیادہ بیانات کی حیثیت رکھتے ہیں ۔جن کو استعاراتی نوعیت کے تناظرات کے نام سے بھی پکارا جاسکتا ہے۔اور یہ تناظرات/مفروضات: طریقۂ کار، اصنافی زمروں، نشانات، تکثیریت، نسب، قرات اور مسرت پر مشتمل منطقوں کو محیط ہیں :

(1):- متن کوئی ریاضیاتی اکائی نہیں ہے (جسے ایک جمع ایک برابر دو کی منطق کے ذریعے قابلِ فہم بنایا جاسکے) متن سے طبعی وجود کی حامل تخلیق کا استخراج ایک بے معنی کاوش کے مترادف ہے۔اس رجحان کو ترک کرنے کی ضرورت ہے جس کی رو سے تخلیق کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہے اور متن کی حیثیت آوگارد کی سی ہے۔سوال جدیدیت کے نام پر القابات کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کر کے ایک مخصوص فوقی ترتیب تشکیل دینا نہیں ،جس میں کچھ ادبی تشکیلات ترتیب کے مرکز میں جگہ پاتی ہیں اور کچھ اس سے خارج قرار دی جاتی ہیں ۔بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ روایتی تخلیق کے کچھ منطقے متن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں اور معاصر ادب کے کئی منطقے متن کی کسوٹی پر کھرے اترنے کے تعلق سے ناکام رہ جاتے ہیں ۔متن اور تخلیق کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ تخلیق ایک جز کی حیثیت سے اپنی کارگزاریاں سرانجام دیتی ہے اس کا تفاعل (کتاب کی صورت میں) ایک بڑے کتب خانے میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی جگہ بنانے تک محدود ہو کے رہ جاتا ہے جبکہ متن اس کے برعکس ایک منظّم عرصے کی حیثیت سے اپنی کارگزاریاں سرانجام دیتا ہے (جو مخصوص قواعد کے کھیل کے ذریعے اپنے تحرک کا اثبات کرتا ہے)۔ دونوں کے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لیے ،حقیقت اور حقیقت بحیثیت ایک التوائی معروض (THE REAL) کے درمیان پائے جانے والے فرق کو سمجھنا ضروری ہے جہاں اولذکر منطقہ سطحی اظہار سے تعلق رکھتا ہے وہیں موخر الذکر منطقہ اکتشاف سے ۔تخلیق کا معروض (کتاب کی صورت میں) ہمیں کتب خانوں ،کتابوں کی فہرست اور امتحانی نصاب کی صورت میں نظر آتا ہے جبکہ متن اس کے برعکس اکتشافی عمل میں محو ہوتا ہے متن مخصوص ضوابط کے تحت اپنا انکشاف کرتا ہے۔(یا کبھی

کبھاران ضوابط کو بے دخل کر کے ) تخلیق ٹھوس صورت میں ہماری دسترس میں آسکتی ہے لیکن متن اس کے برعکس زبان کے حرکیاتی اور کثیر الجہت کھیل کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ متن کا وجود کلامیے کی جدلیات کا پروردہ ہوتا ہے۔ متن تخلیق کی شکست وریخت کے نتیجے میں سامنے آنے والے معروض کا نام نہیں ہے بلکہ اس کو ہم تخلیق کا فرضی عقب بھی کہہ سکتے ہیں۔ متن کا تجربہ اس کے تشکیلی عمل کے دوران ہی ممکن ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ متن ایک غیر مختتم سلسلہ تشکیل کا نام ہے۔ متن کا ٹھہراو ناممکن ہے، متن کی تشکیل کا عمل تخلیق کے کئی سارے معروضات پر پھیلا ہوتا ہے ۔

(2):۔ اسی طرح یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ متن کا دائرہ کار ادب تک ہی سمٹا ہوا نہیں ہے اور نہ اس کو ایک ایک مخصوص فوقی ترتیب میں سمیٹا جاسکتا ہے نہ اصنافی زمروں میں، متن کی بنیادی کارگزاری روایتی اصنافی زمروں کی بے دخلی اوران کی شکست وریخت ہے۔ جارج بیٹلے کی بحیثیت مصنف، درجہ بندی کا معیار ہمارے پاس کیا ہے؟ کیا وہ ایک ناول نگار تھا، شاعر تھا، مضمون نگار، ماہر اقتصادیات، فلسفی یا پھر ایک صوفی ؟ شاید اس سوال کا جواب دینا انتہائی مشکل ہے۔ اسی لیے ادبی جریدوں کے صفحات میں جارج بیٹلی کو جگہ نہیں ملتی ہے۔ وہ ایک ایسا مصنف تھا جس نے کئی سارے متون کی تشکیل کا کام سرانجام دیا۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک ہی متن کو تسلسل کے ساتھ رقم کیا۔ متن کی درجہ بندی ناممکن ہے کیونکہ اس کی ساخت میں اطاعت شعاری کا عنصر مفقود ہے۔ تھیا ڈیٹ کے یہاں ہمیں اگرچہ محدود پیمانے پر ہی صحیح ''دائرہ شکن تخلیقات'' (LIMIT WORKS) کا تصور ملتا ہے۔ متن قائم شدہ اظہاری رویوں کی قواعد سے روگردانی کرتا ہے۔ متن بلاغت کا کوئی معروض نہیں ہے، جس کا استعمال جذبات کو تحریک دینے کے لیے کیا جائے، متن قائم شدہ فکر کی آخری حد کو پھلانگتا ہے ہم یوں بھی کہہ سکتے کہ متن کی ساخت متناقضانہ ہوتی ہے

(3):۔ متن ( کی حرکیات ) کا تجربہ یا اس کے ساتھ معاملہ کرنے لیے ہمیں دال کی حرکیات کو سمجھنا ضروری ہے، جہاں تک کتاب (تخلیق) کا تعلق ہے تو اس کا وجود ایک مخصوص مدلول پر آکے ختم ہو جاتا ہے۔ دلالت کے دو تناظر ہیں جن کو دال کے تفاعل کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے ایک تناظر کی رو سے یہ دعویٰ کیا جاتا کہ دال واضح معانی کو منکشف کرتا ہے اور پھر اس کی زائیدہ تخلیق ( کی معنوی کائنات کا تعین ) لسانیات یا پھر لغت کرتی ہے یا پھر دال کو ایک رمز، مکمل اور توضیح

طلب معروض کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس صورت میں دال ہر میںیات کا موضوع بن جاتا ہے جس کا وجود تشریح طلب ہوتا ہے مختصراً کہیے تو تخلیق ایک واضح نشان کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے اور اس حیثیت سے یہ ماسبق روایت کے نمائیندے کی حیثیت سے اپنی کارگزاریاں سرانجام دیتی ہے جبکہ متن اس کے برعکس مدلول کو مسلسل طور پر ملتوی کرتا ہے۔ متن اپنی کارگزاریاں دال کے منطقے میں سرانجام دیتا ہے اور دال معنی کی تشکیل کا کوئی اولین مرحلہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ معنی کا کوئی ٹھوس مظہر ہے بلکہ اس کے برعکس یہ معنی کے مسلسل التوا کو انگیز کرتا ہے۔ دال کی لامتناہیت کسی ناقابلِ بیان رمز کی بجائے اس کے مسلسل کھیل پر دلالت کرتی ہے اور یہ کھیل متن کے عرصے میں دلالت کی ایک لامحدود زنجیر کو انگیز کرتا ہے اور دلالت کا یہ کھیل نامیاتی ارتقاء کے مراحل سے گزر کر (معنیاتی) بلوغیت تک پہنچنے کو محیط نہیں ہے اور نہ ہی اس کا تفاعل تشریح کے عمل کو مختلف پرتوں سے گزارنے پر موقوف ہے، بلکہ اس کے برعکس یہ کھیل انفصال، امتزاج اور تغیر کے ایک سلسلہ وار عمل کی نمائندگی کرتا ہے۔ متن کی تنظیم کاری کے پس پشت کارفرما شعریات اس کی (معنوی) وسعت کی بجائے اس کی تلازماتی حیثیت کو انگیز کرتی ہے۔ تلازموں، ربط اور انتقال (معنی) کا یہ عمل اس کی ساخت میں مستور جامع علامتی قوت کی نجات کے امکانات پیدا کرتا ہے جبکہ تخلیق میں یہ قوت انتہائی محدود پیمانے پر موجود ہوتی ہے اس کے برعکس متن کلی طور پر علامتی ہوتا ہے۔ تخلیق کی تشکیل، قرأت اور تفہیم جب کلی طور پر ایک علامتی معروض کے طور پر ہوتی ہے تو یہ متن کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، اس طرح متن کی لسانی حیثیت بحال ہو جاتی ہے۔ متن کی ساخت زبان کی ساخت کے مماثل ہوتی ہے زبان کی طرح ہی متن بھی لامرکز اور خاتمے سے مبرا ہوتا ہے۔

4:۔ متن (تفاعل کے اعتبار سے) تکثیری جہات کا حامل ہوتا ہے جس کا مطلب اسے ایک یا ایک سے زیادہ معنی کا استنباط نہیں ہے بلکہ متن اپنے داخلی تفاعل (کھیل) کی بنیاد پر معنی کے لامتناہی سلسلے کو انگیز کرتا ہے۔ متن مختلف معانی کے اجتماع کی بجائے، معنی کے مسلسل انتقال اور انخلاء سے عبارت ہے اس لیے متن قائم شدہ تشریحی حکمت عملیوں بشمول ان کے جو معروضیت کی مدعی ہیں، کے دائرے میں سمٹنے سے روگردانی کرتا ہے۔ متن کا بنیادی تفاعل معنی کی تخم ریزی کرنا ہے۔ متن کی کثیر الجہتی سے مراد اس کے بطن میں پایا جانے والا خلقی ابہام نہیں ہے بلکہ اس سے مراد

متن کے دلالتی عناصر کی نگارانہ تکثیریت (Stereographic plularity) ہے۔ متن کے ساتھ قاری کا رشتہ ہمیشہ غیر یقینی ہوتا ہے کیونکہ، متن ایک غیر مستحکم معروض کی حیثیت سے ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ راقم الحروف کو بھی اس چیز کا سامنا کرنا پڑا (تفہیم متن کے تعلق سے) جس کے بعد ہی میرے ذہن میں اس کی حرکیات سے متعلق ایک واضح تصور قائم ہوا۔ ایک ناظر کی طرح جو کسی وادی کے کنارے بیٹھ کر اس کے گزرانِ مسلسل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس دوران جو مظاہر اس کی نگاہوں سے گزرتے ہیں۔ ان میں روشنی، رنگ، نباتات، تمازت، ہوا، پرندوں کی چہچہاہٹ، دھیمی آوازیں، بچوں کی کلکاریاں اور وادی کی دوسری سمت پگڈنڈیوں، فطرت اور ذی روح اشیاء کی حرکات، مقامی لوگوں کے ملبوسات پر مشتمل غیر مربوط اور متباین معروضات شامل ہیں جس کے مشاہدے میں مذکورہ مظاہر نیم واضح صورت میں آتے ہیں۔ یہ مظاہر اگرچہ واضح رموز کی صورت رکھتے ہیں تاہم ترکیب کے اعتبار سے یہ غیر معمولی نظر آتے ہیں جو اپنے متباین وجود کا اثبات افتراقی رشتوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس لیے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ متن کی شناخت اس کی ساخت میں پائے جانے والے حرکی افتراق کے ساتھ مشروط ہوتی ہے اور اس کی قرأت اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہمیشہ لمحاتی ہوتی ہے۔ متن کی تشکیل میں متنوع تہذیبی مظاہر، معروضات، عناصر اور روایتی/غیر روایتی ثقافتی محاوروں پر مشتمل منطقے کارفرما ہوتے ہیں جو متن کی بنت میں گہرے طور پر سرایت کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر متن اپنی ساخت کے اعتبار سے بین المتونی ہوتا ہے تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی ایک متن کے منابع دوسرے (قابلِ تشخیص) متن میں مضمر ہوتے ہیں۔ تخلیق کے مصادر اور سرچشموں کی تلاش ایک واہمۂ محض ہے جس کی رو سے دیکھا جائے تو تخلیق کا اپنے خالق کے ساتھ نسبی رشتہ ہوتا ہے وہ تمام منطقے جو متن کی تشکیل میں کارفرما ہوتے ہیں اپنی شناخت کے اعتبار سے ہمیشہ محجوب اور ناقابلِ دریافت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم ان منطقوں سے شناسا ہوتے ہیں (لیکن متن ساخت میں ان کی دریافت ناممکن ہے)۔ یہ منطقے بغیر قوسین کے اقتباسات کے بطور متن کی ساخت میں مضمر ہوتے ہیں۔ جہاں تخلیق کا تعلق ہے تو یہ وحدانی فکر کو بے دخل کرنے کی قوتوں سے محروم ہوتی ہے کیونکہ اس کے لیے تکثیریت بشر کی حیثیت رکھتی ہے۔ تخلیق کے برعکس متن اپنا اثبات مارک کی انجیل کے اس جملے کے ذریعے کرتا ہے ''ایک

ایسا فرد جس پر شر انگیز قوتیں غالب آچکی ہیں'' یا پھر اس جملے کے ذریعے، ''میرا نام لیجن ہے اور ہم تعداد میں بہت ہیں''۔ متن کی خلقی تکثیریت اسے تخلیق سے الگ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ قرأت کے وظیفے کو روایتی اور اکہریت پسند تناظرات سے خلاصی عطا کر کے انقلابی تبدیلیوں سے ہمکنار کرتا ہے خصوصاً ان متون کی قرأت کو جن کی تفہیم کا عمل ہمیشہ الہیاتی / اکہریت پسند تناظرات کی رو سے سرانجام دیا گیا۔ ان میں خاص طور پر مذہبی متون شامل ہیں۔ اگر ان دستاویزات کو بھی بحثیت متن معروض قرأت بنایا جائے۔ تو یہ بھی معنی کے متنوع امکانات پیدا کر سکتے ہیں۔ اب جہاں تخلیق کی مارکسی تعبیرات کا تعلق ہے تو وہ بھی ہمیں اکہرے مزاج کی حامل نظر آتی ہیں۔ مارکسی مفکرین اگر اپنی تعبیری حکمت عملیوں کو تکثیری بنیادیں عطا کریں تو مارکسی تجزیاتی عمل مزید فعال اور ٹھوس صورت اختیار کر سکتا ہے۔

5:۔ تخلیق نسبی رشتوں میں جکڑی ہوتی ہے اس پر (تعبیر کے حوالے سے) خارجی حوالوں کا تسلط قائم ہوتا ہے۔ تخلیقات ہمیشہ فوقی ترتیب میں مقید ہوتی ہیں اور ہمیشہ مصنف کی ذات سے (تعین معنی کے تعلق سے) جڑی ہوتی ہیں۔ مصنف تخلیق پر بحثیت خالق کے اپنا تسلط قائم کرتا ہے اور تخلیق پر ملکیت کے جملہ حقوق وہ اپنے نام محفوظ کر لیتا ہے۔ (اسی لیے) روایتی تنقید مصنف کی منشاء کا احترام سکھاتی ہے۔ اور معاشرہ مصنف اور تخلیق کے رشتے کو قانونی صورت عطا کرتا ہے۔ اب جہاں تک متن کا تعلق ہے تو یہ اپنی فعالیت کا اثبات مصنف کی منشاء سے روگردانی کر کے کرتا ہے۔ میں اس بات کو پھر سے دوہراتا ہوں کہ متن تخلیق سے بالکل مختلف منطقے کی حیثیت رکھتا ہے۔ تخلیق ایک ایسے عضویے کی حیثیت رکھتی ہے جس کا سفر تدریجی نوعیت کا ہوتا ہے۔ متن اس کے برعکس ایک مشترکہ عرصے کی حیثیت سے اپنی کارگزاریاں سرانجام دیتا ہے۔ یہ اپنی توسیع ایک منظّم منطقے کے بطور کرتا ہے۔ متن کبھی بھی خلقی اعتبار سے مستحکم مرکز یافتہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو توڑا بھی جا سکتا ہے (تنظیم نو کے لیے) اور مصنف کی ضمانت کے بغیر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ متن کی بین المتونی حیثیت کی بحالی مصنف کی روایتی حیثیت کو رد کرنے سے ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے مصنف متن سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو جاتا ہے بلکہ متن میں مصنف کی حیثیت حاشیائی ہو کے رہ جاتی ہے اگر مصنف ناول نویس ہے تو وہ اپنے تحریر کردہ ناول میں محض ایک کردار

کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔لیکن متن کی تعبیر کے حوالے سے وہ روایتی پدرانہ تسلط ،استحقاق اور معنی کے تعین کنندہ کی حیثیتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔اس کا وجود متن کی ساخت میں سمٹ جاتا ہے اس کی ذات/حیات اس کے تحریر کردہ فکشن کے مصدر کی بجائے اس کا تحریر کردہ فکشن اس کی ذات/حیات کے مصدر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔متن مصنف کی ذات کا تعین کنندہ ہوتا ہے نہ کہ مصنف متن کا۔ پروست اور ژینٹ کی تحریریں ان کی ذات کو متن میں منقلب کر دیتی ہیں ۔اس طرح سے سوانح حیات (BIO-GRAPHY) کے اشتقاقی معنی اور بیان کی صداقت بحال ہو جاتی ہے۔روایتی ادبی اخلاقیات نے مصنف کو جو مستبدانہ حیثیت عطا کی تھی وہ بھی ایک واہمے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے مصنف کا وجود کلی طور پر اس کی تحریر کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔

6:۔عموماً تخلیق کا منطقہ تصریفی معروض ہوتا ہے۔ صارفییت کا حوالہ دینے سے میرا مقصد فتنہ پردازی نہیں ہے لیکن یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ تخلیق اور متن کے درمیان امتیاز ان کی داخلی خصوصات قائم کرتی ہیں نہ کہ قرأت کا وظیفہ۔ساخت کی رو سے مہذب باذوق قرأت اور عارضی لمحاتی قرأت کے درمیان فرق قائم کرنا ناممکن ہے۔متن کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ تخلیق کو بطور صارفی معروض کے ضائع ہونے سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کی حیثیت کو ایک کھیل،عمل، وظیفے اور پیداوار کے بطور قائم کرتا ہے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ متن کی تشکیل کے لیے لکھت اور قرأت کی درمیانی خلیج کا خاتمہ ضروری ہے جس کے معنی یہ نہیں ہے کہ قاری تخلیق پر مسلط ہو جائے بلکہ اس سے مراد دونوں کا ایک ہی دلالتی وظیفے کے ساتھ انسلاک ہے۔لکھت اور قرأت کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والی خلیج اپنی ماہیت کے اعتبار سے تاریخی ہے۔اس کا آغاز تاریخ کے ان ادوار میں ہوتا ہے جب معاشرے کی طبقاتی تقسیم اپنے عروج پر تھی ۔قرأت اور لکھت ایک مخصوص طبقے کا استحقاق بن گیا تھا۔علمِ بیان عظمت یافتہ ادبی علمی اصول کی حیثیت سے اس وقت کی تحریروں کو متشکل کرتا تھا۔ جب قرأت کا تفاعل (معنی کی) تصریف تک سمٹ جاتا ہے تو یہ متن کے داخلی کھیل کو انگیز کرنے کے تعلق سے ناکام ہو جاتی ہے۔ یہاں لفظ کھیل کو اس کے کثیر الجہت معانیاتی زاویوں میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔متن مسلسل طور کھیلتا ہے اور قاری اس کے ساتھ دو سطحوں پر کھیلتا ہے،ایک سطح پر وہ اسے بطور کھیل کے کھیلتا ہے اور دوسری سطح پر

قرأت کے توسط سے اس کی بازتشکیل کر کے کھیلتا ہے۔ بشرطیکہ قرأت متن کی داخلی نقل ہو کے نہ رہ جائے (اس کو دوہرائے نہ)۔ موسیقی کے محاورے میں کہے تو قرأت متن کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ متن اور موسیقی کی تاریخ میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے، ایک وقت وہ بھی تھا جب موسیقی کو بطورِ مشغلہ اختیار کرنے والے شائقین کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی تھی۔ اس وقت موسیقی بجانا اور موسیقی سننا، دو مختلف کارگزاریاں تصور کی جاتی تھیں اور یہ ترتیب وار سرانجام دی جاتی تھیں۔ اس ترتیب کے پہلے سرے پر موسیقار موسیقی کے شارح کی جگہ تھی، جسے بورژوازی طبقے نے فاعل کا مقام عطا کیا تھا اور ترتیب کے دوسرے پر منفعل سامع کھڑا ہوتا تھا۔ جس کا کردار موسیقی کی سماعت تک محدود تھا۔ لیکن پس سیریل موسیقی نے موسیقار شارح کلید موسیقی کی روایتی حیثیت کی قلبِ ماہیت کر دی۔ اب اس کی حیثیت کلید موسیقی (Musical Score) کے اشتراکی مصنف تک سمٹ کے رہ گئی۔ جو اس کو منطقہ اظہار میں لانے کی بجائے فقط اس کا تکملہ کرتا ہے۔ متن بھی کلید موسیقی کی طرح قاری سے فعال اشتراک کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق کی تشکیل کا کام کون سرانجام دیتا ہے۔ جس کا جواب یہ کہ اس کا تفاعل دورِ حاضر میں ناقد کے ساتھ مشروط ہو کے رہ گیا ہے۔ قرأت کا وظیفہ تصریفی عمل میں منقلب ہو جانے کی وجہ سے، قاری جدید متن کی قرأت کے حوالے سے ایک عجیب قسم کی بوریت کا شکار ہو گیا ہے۔ اس میں آواگارد فلم اور مصوری بھی شامل ہے۔ بوریت سے مراد یہ ہے کہ قاری متن کی بازتشکیل پر تیں اتارنے اور (متحرک قرأت کے توسط سے) اس کے دورانِ مسلسل کو جاری رکھنے کے حوالے سے ناکام نظر آتا ہے

7:۔ اس کے بعد میں متن کے حوالے سے اپنا آخری مفروضہ پیش کرتا ہوں۔ اور وہ لذت کا مفروضہ ہے۔ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے کہ لذت پرست جمالیات کا وجود کبھی تھا بھی کہ نہیں، لیکن میں یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تخلیق ایک مخصوص قسم کی لذت کی متحمل ہوتی ہے میں پروست، بالزاک، ژینٹ اور ایلکزانڈر ڈمس کو پڑھنے کے بعد لطف اندوز ہو سکتا ہوں، لیکن لذت کوشی کا یہ عمل اپنی ماہیت کے اعتبار سے بڑی حد تک تصریفی ہی رہتا ہے چاہے میری قرأت کتنی ہی گہری اور معروضی ہو۔ جس کے بعد مجھ میں یہ احساس اجاگر ہو جاتا ہے کہ جہاں میں ان مصنفین کو پڑھ سکتا ہوں وہیں میں ان کو دوبارہ لکھ بھی سکتا ہوں، اور یہی احساس بعد میں

جا کر میرے لیے ان کی تخلیقات کی باز تشکیل کے تعلق سے سدِ راہ ثابت ہوتا ہے۔ احساس کا یہ لمحۂ تخلیق اور میرے درمیاں جو فاصلہ قائم کرتا ہے وہ نا قابلِ تلافی ہوتا ہے۔ اب جہاں تک متن کا تعلق ہے تو یہ JOUISSANCE کے ساتھ گہرے طور پر منسلک ہوتا ہے جس کے معنی غیر منفصل لذت کوشی ہے۔ متن دلالتی اکائیوں کے توسط سے ایک فرضی کائینات کو تشکیل دیتا ہے اور اس تعلق سے یہ تاریخ سے بھی ماورا ہو جاتا ہے، متن اگر چہ سماجی رشتوں کی شفافیت (تحرک) کو اجاگر نہیں کر پاتا ہے تاہم لسانی رشتوں (کی فعالیت) کو انگیز کر پاتا ہے۔ متن ایک ایسے عرصے کی حیثیت رکھتا ہے جہاں ایک محاورہ دوسرے محاوروں کے تفاعل کو سلب نہیں کر سکتا ہے، جہاں مختلف (نظریاتی ثقافتی) محاورے مسلسل گردش میں رہتے ہیں۔

یہ مفروضات متن کی کسی جامع تھیوری کو وضع نہیں کرتے ہیں اور اس کی وجہ راقم الحروف کی کوتاہیاں نہیں، بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ فوق لسانی منطقوں کے ذریعے متن کی تھیوری ترتیب دینا ناممکن ہے۔ متن کی تھیوری فوق لسانی منطقوں کی تحلیل یا کم سے کم ان کو مشتبہ قرار دینے کے ساتھ مشروط ہے۔ متن پر قائم کیا جانے والا مخاطبہ بھی متن، تحقیق، یا متنی وظیفہ ہی ہونا چاہیے۔ متن کے دائرہ کار سے کوئی بھی (ثقافتی) محاورہ مظہر ماورا نہیں ہے اور نہ ہی بیان کا کوئی مخصوص موضوع اس پر ایک منصف، آقا، شارح، معبر یا مفسر کی حیثیت سے مسلط ہو سکتا ہے کل ملا کر دیکھا جائے متن کی تھیوری لکھت کے وظیفے کے ساتھ مشروط ہے۔

☆☆

# غزلیات

☆..........راجیش ریڈی

کوئی ہلچل نہیں دریا میں ، روانی چپ ہے
جانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا پانی چپ ہے

ہو کے بھی کیوں ہے نہ ہونے کا مسلسل احساس
میرے کردار کے بارے میں کہانی چپ ہے

کس قدر ناچتی پھرتی تھی یہ الھڑ پن میں
زندگی ہوگئی ہے جب سے سیانی، چپ ہے

خوش ہے، جینے کے معانی سے ہے جو ناواقف
جس کو معلوم ہیں جینے کے معانی، چپ ہے

اشتہاری سا ہوا جاتا ہے لہجہ سب کا
شورِ بازار میں ہر سادہ بیانی چپ ہے

اپنی پہچان سے محروم ہے کیوں میرا وجود
میری ہی ذات میں کیوں میری نشانی چپ ہے

☆☆

جانے کتنی اُڑان باقی ہے
اس پرندے میں جان باقی ہے

جتنی بٹنی تھی بٹ چکی یہ زمین
اب تو بس آسمان باقی ہے

اب وہ دُنیا عجیب لگتی ہے
جس میں امن و امان باقی ہے

امتحاں سے گزر کے کیا دیکھا
اک نیا امتحان باقی ہے

سر قلم ہوں گے کل یہاں اُن کے
جن کے منہ میں زبان باقی ہے

☆☆

☆..........راجیش ریڈی

✿

ہر کسی کا خیال میں رکھوں — کتنے رنج و ملال میں رکھوں
کیا ضروری ہے کھیل میں ہر بار — تیغ تو رکھے، ڈھال میں رکھوں
جبر اک بے مثال آپ کریں — صبر اک بے مثال میں رکھوں
خط میں اک لفظ بھی نہیں لکھا — اور کس طرح حال میں لکھوں
کاش ! بدلے ترا مرا کردار — تو چگے دانہ، جال میں رکھوں
میری کوشش ہے ایسے دور میں بھی — رزق اپنا حلال میں رکھوں
آئینہ رکھ دیا ترے آگے — اور اب کیا مثال میں رکھوں
یہ دعا ہے تجھے ہو وصل نصیب — ہجر کے ماہ و سال میں رکھوں
بولتا ہے وہ آئینے کی طرح — اس سے کیا بول چال میں رکھوں

موت کہتی ہے اور ابھی کچھ دن
زندگی کو بحال میں رکھوں

☆☆

## ☆............پروفیسر غضنفر

سامانِ عیش سارا ہمیں یوں تو دے گیا
لیکن ہمارے منہ سے زباں کاٹ لے گیا
دفتر میں ذہن، گھر میں نگہ، راستے میں پاؤں
جینے کی کاوشوں میں بدن ہاتھ سے گیا
سینے سے آہ، آنکھ سے پانی، رگوں سے خون
اک شخص ہم سے چھین کے کیا کیا نہ لے گیا
لب پہ سکوت، دل میں اُداسی، نظر میں خوف
میرا عروج مجھ کو یہ سوغات دے گیا
خوابوں کا اک طلسم بچا تھا دماغ میں
اب کے برس اسے بھی کوئی توڑ لے گیا
پھنکارتا ہوا مجھے اک اژدہا ملا
جب بھی کسی خزانے کا در کھولنے گیا

☆☆

یہ تمنّا نہیں کہ مر جائیں
زندہ رہنے مگر کدھر جائیں
ایسی دہشت کہ اپنے سایوں کو
لوگ دشمن سمجھ کے ڈر جائیں
وہ جو پوچھے تو دل کو ڈھارس ہو
وہ جو دیکھے تو زخم بھر جائیں
بچ کے دنیا سے گھر چلے آئے
گھر سے بچنے مگر کدھر جائیں
ایک خواہش ہے جسم سے میرے
جلد سے جلد بال و پر جائیں
اب کے لمبا بہت سفر اُن کا
ان پرندوں کے پر کتر جائیں
سوچتے ہی رہیں گے ہم شاید
وہ بلائیں تو ان کے گھر جائیں

☆☆

☆......پروفیسر غضنفر

جب کوئی چادر رُخِ شفاف پر تانی گئی
تب کہیں جاکر ہماری شکل پہچانی گئی
خوش گمانی ہے کہ اس دنیا سے من مانی گئی
سچ تو یہ ہے دیدۂ حیراں سے حیرانی گئی
عقل و دانش کی کمی کا رنج ہے سب کو مگر
غم زدہ میں ہوں کہ میرے گھر سے نادانی گئی
اب کنارے پر پہنچنے کا مزہ باقی کہاں
کشتیاں سیدھی ہوئیں، دریا سے طغیانی گئی
روشنی، پہچان، لذت، ولولہ سب کچھ گیا
میں نے سمجھا تھا فقط اک اوڑھنی دھانی گئی
شاید آجائے ہماری راہ میں کچھ روشنی
اب تو اپنے جسم و جاں سے خوئے انسانی گئی
روشنی تھی کس قدر اس کے بدن کی تابناک
گھور کہرے میں بھی جس کی شکل پہچانی گئی
پوچھیئے اس ملک کے راجا سے اس کا حال چال
جس کے قبضے سے نکل کر صرف اک رانی گئی
دوست کو دشمن سمجھ کر دشمنی کرتے رہے
کیا اسی مقصد سے یہ چادر یہاں تانی گئی

☆☆

حصارِ رنگ و نکہت کی اسیری روک دیتی ہے
فقیری چاہتا ہوں، پر امیری روک دیتی ہے
بہت جی چاہتا ہے آدمی کو آئینہ کر دوں
مرے خامے کو پر، طرزِ نظیری روک دیتی ہے
نظر کہتی ہے سارے منظروں کو نوچ کر رکھ دوں
مگر مجھ کو مری پیری فقیری روک دیتی ہے
فضا ایسی کہ اک اک شخص سے میں دشمنی کر لوں
مگر دل کو کوئی بانگِ کبیری روک دیتی ہے
جو غصّہ پھوٹتا ہے درد کی شدّت سے برسوں میں
تعجب ہے بس اک روٹی خمیری روک دیتی ہے
نئی کِل میں لگاتے وقت اکثر میرے ہاتھوں کو
کیاری سے جو اُکھڑی ہے پنیری، روک دیتی ہے
جہاں زیبی کی خواہش بھی تو اُٹھتی ہے مرے دل میں
مگر اس کو ہوائے ملک گیری روک دیتی ہے

☆☆

☆............فدؔا راجوروی

آنکھوں میں روز نت نئے منظر اُتارنا
تب دل کے شیشے میں کوئی پیکر ابھارنا
سب عمر مستعار تھی اک خواب کی طرح
جیسے بھی دن کٹے، کیا انہیں اب پکارنا
آئیں نہ لوٹ یاد کے بچھڑے ہوئے سُراغ
دیوانے کو، کہیں بھی ہو پتھر نہ مارنا
ہر تیز گام تو ہے چلا قافلے کے ساتھ
ہم کو پڑا ہے ہر قدم رستہ سنوارنا
شمعیں بجھیں رفاقت و احساس کی فدؔا
اب روزنوں سے کیا ہے سویرا نکھارنا

☆☆

حشر سامانی نے کچھ ایسا پشیماں کردیا
بکھرے ہنگاموں نے پھر محشر بداماں کردیا
شور سارا تھا وہ میری بے نوائی کی دلیل
خود ہی خاموشی کو میں نے اپنے عنواں کردیا
پھر چمن میں آگئی ہے میرے اشکوں سے بہار
میرے ہی خونِ جگر نے پھر چراغاں کردیا
صحنِ گلشن سے مٹے ہیں موسمِ گُل کے نقوش
کس نئی تعمیر کا لوگوں نے ساماں کردیا
ناخداؤ اب نہ چھیڑو اِس طرح ذکرِ بہار
شورشِ دل نے فدؔا ہے تنگ داماں کردیا

☆☆

☆.........فدؔا راجوری

۞

آرزوؤں کے چلے خنجر بہت
اپنی اُمیدیں رہیں خود سر بہت
مجھ کو لوٹا دو میرے موسم سبھی
کس لئے دیتے ہو یہ منظر بہت
کون سا چہرہ بسالیں آنکھ میں
روز ملتے ہیں ہمیں رہبر بہت
ظلمتِ شب کا بھی اندازہ کرو
روشنی پھیلی یہ کیا گھر گھر بہت
اپنے آنگن میں بھی رہتی کچھ بہار
رُخ بدلتی ہے ہوا اکثر بہت
ہوگیا اُٹھنا قدم مشکل فدؔا
ہر طرف ہیں راہ میں اجگر بہت

☆☆

۞

عجب اک کشمکش میں زندگی معلوم ہوتی ہے
یہاں ہر روشنی بجھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
ہوئیں کیا بُلبلیں! سارے بپا تھے جن سے ہنگامے
ہمارے باغ میں کیوں مردنی معلوم ہوتی ہے
روا کب تک رہیں گے برق و باراں کے یہ پیمانے
یہ فصلِ گل انہیں کیوں کشتنی معلوم ہوتی ہے
ہماری بستیاں پامال ایسے ہوگئیں ساری
کہ اب اُجڑی ہوئی خود بے کسی معلوم ہوتی ہے
کسی کا اس طرح کوئی نہ پھر سے آشیاں پھونکے
یہ اپنوں کی فدؔا بے گانگی معلوم ہوتی ہے

☆☆

☆ ............راشد انور راشد

۞

اپنی اک مخصوص لے میں گنگناتی تھی ندی
پار کرتے وقت یہ جانا کہ گہری تھی ندی
جس جگہ اب ہے گھنی آبادیوں کا سلسلہ
کل اسی قصبے کے بیچوں بیچ بہتی تھی ندی
یہ بھرم تھا سو رہی ہے وہ بھنور آغوش میں
ڈوبنے کی آ گئی نوبت کہ جاگی تھی ندی
ایک ہیبت ناک منظر دل کو دہلاتا ہوا
راستہ اپنا اچانک پھر سے بدلی تھی ندی
مل کے لہروں سے بھی سنگم کو ترستی ہی رہی
اس سفر میں ایسا لگتا ہے اکیلی تھی ندی
دیکھ قدموں کی تھکن ، وہ روکتی اپنا بہاؤ
اور میرے اک اشارے پر ہی چلتی تھی ندی
اس کے اندر کی خموشی میں غضب کا راز تھا
اوپر اوپر شوخ ، چنچل اور رنگیلی تھی ندی
اب بڑی ہو کر سمندر کی طرح لگنے لگی
چند برسوں پہلے دیکھا تھا تو چھوٹی تھی ندی
پُل شکستہ تھا مگر سیاح تو بے خوف تھے
گرمیوں کے دن تھے، چاروں سمت سوکھی تھی ندی

☆☆

۞

دھویں کے تار سا اب کے اُٹھا ہے گردو غبار
ہر ایک چہرے پہ جمنے لگا ہے گردو غبار
بدل کے بھیس ہوا کا ہے قافلے میں شریک
کسی کے روکے سے کب رُک سکا ہے گردو غبار
ہر ایک شئے ہے نظر کی گرفت سے باہر
چہار سمت ہی پھیلا ہوا ہے گردو غبار
اب اس علاقے میں سبزہ تلاشتے کیوں ہو
یہاں تو برسوں سے اڑتا رہا ہے گردو غبار
نجانے قصبے میں کیا کچھ ہوا تھا رات گئے
نگہ میں خواب کے بدلے بسا ہے گردو غبار
ضرور ہوتا ہے خوشبوئے یار کا دھوکہ
کوئی دوانہ کہیں چومتا ہے گردو غبار
کھلی نہ ایک بھی کھڑکی تو پھر یہ کیسے ہوا
تمام کمرے میں بکھرا پڑا ہے گردو غبار

☆☆

☆............خورشید طلبؔ

⚙

اتنا حساس ہو چکا تھا میں پیڑ کٹتے تھے چیختا تھا میں
مجھ کو مقتل میں لے کے آیا کون اپنے کمرے میں سو رہا تھا میں
موت نے جب مجھے دبوچا تھا زندگی سے بھرا ہوا تھا میں
ایک لڑکی تھی بادلوں جیسی وہ برستی تھی، بھیگتا تھا میں
اس نے پوچھا تھا مجھ سے کیسے ہو اور اندر سے پھٹ پڑا تھا میں
ملنے آئی تھی ایک سرگوشی اور تب چیخ بن چکا تھا میں
رات کو کیا پتہ کہ اس کے لئے سارا دن دھوپ میں جلا تھا میں
میں طلبؔ حسن تھا سمندر کا
یوں تو کہنے کو بلبلہ تھا میں

☆☆

☆............خورشید طلبؔ

۞

اتنا مت بول کہ الفاظ کے لالے پڑ جائیں
اور اک روز ترے ہونٹ پہ تالے پڑ جائیں
ابر یوں برسے کہ ہر سنگ سے سبزہ پھوٹے
دھوپ یوں نکلے کہ دیوار میں چھالے پڑ جائیں
اپنے باطن کی طرف ایک نظر کر لینا
ماند جس روز یہ باہر کے اُجالے پڑ جائیں
عین ممکن ہے مری بات نہ پہنچے تجھ تک
اور جب پہنچے تو کچھ مرچ مسالے پڑ جائیں
روز جو پھیل رہی ہے تری شہرت کی زمیں
یوں نہ ہو پیچھے ترے آسماں والے پڑ جائیں
میں ترے شعر سنوں گا بھی ، سناؤں گا بھی
پہلے منہ میں ذرا دوچار نوالے پڑ جائیں
یہ کوئی ہجر منانے کا طریقہ ہے طلبؔ
ہونٹ کے ساتھ ترے پھیپھڑے کالے پڑ جائیں

☆☆

☆............انورؔ فاروقی

۞

ایک ذرے کی تاب کیا کہیے
بن گیا آفتاب کیا کہیے
فکر و غم جب ہیں میرے ہمسائے
مجھ کو خانہ خراب کیا کہیے
رخ پہ نظریں ٹھہر نہیں سکتیں
ان کا عہدِ شباب کیا کہیے
جس کے دیدار کو ترستا ہوں
اس کے رخ پر نقاب کیا کہیے
تیری آواز پر مچل اُٹھے
سارے چنگ و رباب کیا کہیے
ان کی فرقت مرے لیے انورؔ
بن گئی ہے عذاب کیا کہیے

☆☆

۞

کبھی کبھی وہی بانگِ درا لگے ہے مجھے
کہ ٹوٹتی سی جو دل کی صدا لگے ہے مجھے
مرا خلوص مجھے لے کے آ گیا ہے کہاں
وہ ہنس کے گالیاں دے تو دعا لگے ہے مجھے
نہ آیا حرفِ شکایت مرے لبوں پہ مگر
یہ بات سچ ہے کہ وہ بے وفا لگے ہے مجھے
جزا کی فکر ہو کیوں مجھ کو بزمِ ہستی میں
مرا وجود ہی جب اک سزا لگے ہے مجھے
میں اپنے آپ سے بے گانہ ہو گیا انورؔ
کسی حسین کی یہ بددعا لگے ہے مجھے

☆☆

☆..........انورؔ فاروقی

۞

بڑا عظیم تھا فکرِ ہنر میں رہتا تھا
وہ ایک شخص جو ویران گھر میں رہتا تھا
سنا ہے اس کو اچانک نگل گئیں سڑکیں
جو سب سے آگے ہمیشہ سفر میں رہتا تھا
وہ روتے چہرے کو ہنسنا سکھانے والا بھی
غموں کے گھر میں، دکھوں کے نگر میں رہتا تھا
مٹادی جس نے مری شامِ غم کی تاریکی
وہ میرا دوست تھا میرے ہی گھر میں رہتا تھا
جلا کے مشعلِ افکار ہوگیا روپوش
کہ وہ تو حرف ونوا کے نگر میں رہتا تھا
جدید نسلوں میں انورؔ ملے گا مشکل سے
وہ احترام جو پہلے بشر میں رہتا تھا

☆☆

۞

یہ عجب حادثہ رونما ہوگیا
منزلیں سوگئیں راستہ کھوگیا
جس کو پھولوں سے وابستہ میں نے کیا
راہ میں میرے کانٹے وہی بوگیا
روشنی کے لیے دل جلانے کوئی
تیرگی میں کہیں کارواں کھوگیا
جب بھی اونچائی سے میں گراہوں کبھی
قطرہ قطرہ سمندر میں خود کھوگیا
اپنے انجام کی فکر ان کو ہوئی
جب بھی کانٹوں کے بستر پہ میں سوگیا
انورؔ اس کے تغافل میں کیا بات تھی
سانس بھی رُک گئی ، وقت بھی سوگیا

☆☆

☆............ذوالفقار نقوی

خاموش زمزمے ہیں ، مرا حرفِ زار چپ
ہر اختیار چپ ہے ، ہر اک اعتبار چپ
بادِ سموم درپئے آزار دیکھ کر
سکتے میں بے قرار ہے ، بادِ بہار چپ
منظر نہیں ہیں بولتے، صحرا اُداس ہے
پتھرا گئی ہے آنکھ ، دلِ داغ دار چپ
جو کچھ بھی ہو رہا ہے ، یہ مقسوم تو نہیں
بس تجھ کو کھا گئی ہے تری خون خوار چپ
ہر ایک کو ہوں گوش بر آواز دیکھتا
اوڑھے ہوئے ہوں جب سے میں اک باوقار چپ
حرفِ دعا نہ دستِ طلب، در پہ آن کر
لب پر فقط ہے رقص میں اک دلفگار چپ

☆☆

اندھیروں سے اُلجھنے کی کوئی تدبیر کرنا ہے
کوئی روزن، کسی دیوار میں تسخیر کرنا ہے
ذرا دیکھوں تو اِس بادِ مخالف میں ہے دم کتنا
گھروندا اک سرِ دشتِ بلا تعمیر کرنا ہے
نکل آیا ہے جو بے دار راہوں پر دلِ بے خود
کوئی ناوک فگن آئے اِسے نخچیر کرنا ہے
سرِ دشتِ جنوں جو بےخودی کے پھول کھلتے ہیں
اُنہیں روشن دماغوں کے لئے اکسیر کرنا ہے
مکانِ لا مکانی کا سفر میرا نہیں رُکتا
تمہاری یاد کو اب پاؤں کی زنجیر کرنا ہے

☆☆

☆............ذوالفقار نقوی

۞

دشت میں دھوپ کی بھی کمی ہے کہاں
پاؤں شل ہیں مگر ، بے بسی ہے کہاں
لمسِ دشتِ بلا کی ہی سوغات ہے
میرے اطراف میں بے حسی ہے کہاں
خاک میں خاک ہوں، بے مکاں، بے نشاں
میرا ملبوسِ تن خسروی ہے کہاں
میرا سوزِ دروں مائلِ لطف ہو
مجھ میں شعلہ فشاں وہ نمی ہے کہاں
پھونک دے بڑھ کے جو تیرگی کا بدن
میری آنکھوں میں وہ روشنی ہے کہاں
صوت و حرفِ تمنا سے ہو با خبر
ایسی ادراک میں نغمگی ہے کہاں

☆☆

۞

مجھ کو تیری چاہت زندہ رکھتی ہے
اور تجھے یہ حالت زندہ رکھتی ہے
ڈھو ڈھو کر ہر روز جسے تھک جاتا ہوں
اُس ساماں کی سنگت زندہ رکھتی ہے
سورج نے تیزاب ہے چھڑکا شاخوں پر
گلشن کو کیا رنگت زندہ رکھتی ہے ؟
چڑھتے سورج کی میں پوجا کرتا ہوں
یار یہی اک خصلت زندہ رکھتی ہے
چوم کے ہاتھوں کی ریکھائیں سوتا ہوں
خوابوں کی یہ دولت زندہ رکھتی ہے
پل دو پل آنگن میں تیرے رہتا ہوں
ایک یہی تو فرصت زندہ رکھتی ہے

☆☆

## ☆..........اشرف عادلؔ

۞

ہم نے کب اپنا گھر تلاش کیا
ہر سفر میں سفر تلاش کیا
جب کہیں فن کی پیاس ہی نہ بُجھی
اپنا ہی پھر ہُنر تلاش کیا
شکر ہے لفظ کے نگر میں ہوں
بھیڑ میں اپنا سر تلاش کیا
جسم میں اپنے جو نہیں رہتا
اس قلندر کا در تلاش کیا
ایک قطرہ بھی اک سمندر ہے
آنسوؤں میں گہر تلاش کیا
رقص جگنو کا تھا بہت عمدہ
تیرگی میں قمر تلاش کیا
خانقاہوں میں بھیڑ کم ہوگی
تم کو دل میں اگر تلاش کیا
دوستو ! بھیڑ میں فرشتوں کی
ہم نے بھی اک بشر تلاش کیا

☆☆

۞

جلتے ہیں دیئے شام سے آنکھوں کے کنارے
نکلے ہیں پلک پر مری قسمت کے ستارے
الفاظ کے افلاک پہ اک رقص ہے جاری
معنی کی زمینوں سے غزل مجھ کو پکارے
احساس کے سُرتال پہ میں جھوم رہا ہوں
جذبات کے نغموں سے کوئی بوجھ اُتارے
قسمت کے درختوں پہ نہ طائر ہے نہ مینا
تقدیر کی زلفوں کو بتا کون سنوارے
یہ خاک نشینی ہی ہمیں روک رہی ہے
ملتے ہیں ہمیں ورنہ ستاروں کے اشارے

☆☆

☆............منصور خوشتر

۞

عشق ، تسلیم و رضا کا عالم
حسن اک جبر و جفا کا عالم
ہائے وہ طرزِ تغافل اس کا
اور عاشق کی وفا کا عالم
لاکھ برپا ہو قیامت کوئی
ہائے وہ تیری ادا کا عالم
شوق کی اپنی ہے روداد یہی
زد پہ طوفان کی دِیا کا عالم
ایک امید کی موہوم کرن
دور سے تیری صدا کا عالم
ہائے وہ رنگِ تذبذب تیرا
ہائے وہ میری خطا کا عالم
جس سے کچھ تو نے ہے سیکھا خوشتر
رنج و غم، موجِ بلا کا عالم

☆☆

۞

وفا کے شہر کا منظر ہے بدلا
مزاجِ یار بھی یکسر ہے بدلا
امیرِ شہر کی کیا پوچھتے ہیں
جنابِ عالی کا تیور ہے بدلا
تقاضہ وقت ہی کا ایسا ہے کچھ
کہ اندازِ بیاں ، منبر ہے بدلا
حیا وشرم ، عشوے اور غمزے
حسینوں کا بھی اب لشکر ہے بدلا
کچھ ایسی اب زمانے کی روش ہے
کہ اندر جو بھی ہو ، باہر ہے بدلا
سمجھتے ہیں اسے اہلِ جنوں بھی
کہ اب ہر ہاتھ کا پتھر ہے بدلا
کسی سے اس نے کچھ ایسا کہا ہے
"تعجب ہے مرا خوشتر ہے بدلا ؟"

☆☆

☆.........روبینہ میر

دھوپ میں جیسے تمازت نہ رہی
اب طبیعت میں شرارت نہ رہی
جن کی خوشبو سے مہکتا تھا چمن
اُن گلوں میں بھی نفاست نہ رہی
یہ کسی سے بھی نہیں کرتا وفا
اس زمانے سے شکایت نہ رہی
منجمد جب سے ہوئے ہیں جذبات
زندگی میں وہ حرارت نہ رہی
بند کرلو سب دریچے کھڑکیاں
اب نظاروں کی بھی چاہت نہ رہی
دیکھنے میں ہے وہی روبینہ مگر
اُس کی پہلی طبیعت نہ رہی

☆☆

ایسا کاروبار نہ کرنا
خواب مرے مسمار نہ کرنا
جھوٹے اب اقرار نہ کرنا
دل کا کاروبار نہ کرنا
نظروں سے سب کچھ ظاہر ہے
ہونٹوں سے اظہار نہ کرنا
عہدو پیاں جو بھی کئے ہیں
اُن سے اب انکار نہ کرنا
طوفاں آخر تھم جائے گا
ایسے میں دریا پار نہ کرنا

☆☆

☆..........روبینہ میر

اپنی نظر سے آپ یوں مسحور کر گئے
خاموش رہ کے بھی مجھے مشہور کر گئے
ہم چاہتے تھے چُپ رہیں گے بزم میں مگر
وہ دل کا حال کہنے پر مجبور کر گئے
دُزدیدہ تر نظر لئے گزرے قریب سے
کیسے کہوں کہ دل کو وہ رنجور کر گئے
دونوں کے درمیاں ہے اب کس درجہ فاصلہ
کیوں اپنے سے وہ مجھ کو بہت دور کر گئے
پتھر سا دل پہ رکھ کے چلے مجھ سے دور دور
وہ میرے ساتھ خود کو بھی رنجور کر گئے
روبینہ کیا کہوں جو میرے دل کا حال ہے
وہ میرے دل کو رونے پر مجبور کر گئے

☆☆

میں چشمِ تمنّا کو نم دیکھتی ہوں
کہ تعبیر خوابوں کی کم دیکھتی ہوں
نہیں راس آئے جو اس زندگی میں
یہ سر اُن کے آگے ہی خم دیکھتی ہوں
ہے میری نگاہوں میں تصویرِ فردا
کہ ماضی کو اکثر میں کم دیکھتی ہوں
مجھے یاد آتے ہیں گیتا و قرآن
میں جب سوئے دَیر و حرم دیکھتی ہوں
کئی غم اُبھر آتے ہیں زندگی کے
جو آنکھیں کسی کی میں نم دیکھتی ہوں
نہیں جن کو روبینہ سلجھانا آساں
زمانے کے وہ پیچ و خم دیکھتی ہوں

☆☆

☆............رفیق ہمراز

۞

کچھ عشق تھا، جنون تھا، جو تھا ترا ہی تھا
وحشت تو تھی، سکوں بھی مرا سر پھرا ہی تھا
قدموں میں رکھ کے چھوڑ گیا وہ دل وجگر
پاگل بھی تھا نہ صاحب نعم وعطا ہی تھا
لکھا تھا خواب میں کبھی صحرا دیوار پر
ٹوٹا جو خواب گھر بھی مرا ریت کا ہی تھا
وہ گھات میں لگے ہیں، یہ سب کو تو تھی خبر
لوٹا ہے مجھ کو جس نے مرا حوصلہ ہی تھا
سب ڈھونڈتے ہی رہ گئے اسبابِ قتل اور
جو کچھ وہاں سے مل گیا رنگِ حنا ہی تھا

☆☆

۞

خداوند یہ کیسا مرحلہ ہے
سفر کا اذن ہے اور کربلا ہے
سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے
فنا کا مرحلہ کیا ہو چکا ہے
ستارے آج کس کے منتظر ہیں
سحر واقع ہوئی یا لگ رہا ہے
میں دیکھوں خواب یا تعبیر ان کی
مری نیندوں میں کوئی جاگتا ہے
ہے چہرے پر ابھی پہچان قائم
مگر اندر تو سب ٹوٹا ہوا ہے
گلی کے موڑ پر مڑ کر تو دیکھو
تمہارے گھر کا بھی اک آنکڑا ہے

☆☆

☆........ساگر سرفراز

حالانکہ میں تو حسن سے بیزار نہیں ہوں
لیکن اسیرِ زلفِ طرحدار نہیں ہوں
کاندھوں پہ اپنا بوجھ لئے جا رہا ہوں خود
اے زندگی میں تجھ پہ گراں بار نہیں ہوں
تونے جو مجھ کو شہر میں بدنام کر دیا
اے دوست میں تو سرخیِ اخبار نہیں ہوں
میں تو ذرا سی چوٹ سے ہی ٹوٹ جاؤں گا
مضبوط کوئی آہنی دیوار نہیں ہوں
اجڑا ہوا دیار ہوں، اک دشتِ بلا ہوں
کھلتا ہوا میں کوئی چمن زار نہیں ہوں
مظلوم کی آواز ہوں، گریہ ہوں، نوحہ ہوں
میں ظالم و جابر کا طرفدار نہیں ہوں
ظالم کی حمایت میں جو لکھتا ہے قصیدے
ساگر میں کوئی ایسا قلم کار نہیں ہوں

بخوبی جانتا ہوں بے وفا ہے
مگر یہ دل مرا کب مانتا ہے
مزاج بادِ صرصر تند خو ہے
چراغِ شام بھی ضد پر اڑا ہے
بہت ہیں چارہ گر بستی میں لیکن
یہ دردِ عشق ہے، یہ لادوا ہے
عیاں ہے اس کے چہرے پر، وہ اب بھی
کسی کے غم میں شاید مبتلا ہے
گزرتا ہے یہاں سے جو مسافر
تمہارے نقشِ پا کو چومتا ہے
ارے او باغباں تو سو رہا ہے
تمہارا گلستان تو جل رہا ہے
بسا ہے وہ تمہارے دل میں ساگر
کسے در در بھٹک کر ڈھونڈتا ہے

☆☆

☆............ پروفیسر ظہور الدین

# علم وادراک کا شاعر............خورشید بسملؔ

خورشید بسملؔ کا تعلق ایک مردم خیز خطۂ زمین، جس کو تھنہ منڈی کہتے ہیں اور جس کی شہرت کی کئی ایک وجوہات ہیں خصوصاً ایک یہ کہ اگر آپ حضرت بابا غلام شاہ بادشاہ رحمتہ اللہ علیہ، جن کو خاص وعام شاہدرہ شریف کے نام سے جانتے ہیں، کی زیارت کرنا چاہیں تو آپ کو اسی قصبے سے گزر کر جانا ہوگا۔ دوسری وجہ اس کا فطری حُسن اور جانفزا آب وہوا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ قدیم مغل روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے نہ صرف خود تاریخی اہمیت کا حامل ہے بلکہ نوری چھم، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں وہاں کشمیر آتے جاتے اکثر آبشار کے نیچے نہایا کرتی تھی اور بادشاہ ایک مخصوص جگہ بیٹھ کر مختلف زاویوں سے اس منظر کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اس مقام تک بھی اگر آپ جانا چاہیں تو اسی قصبے سے گذر کر جانا پڑتا ہے۔ اگر چہ اب دوسرے راستوں سے بھی وہاں پہنچنے کی سہولیات میسر ہیں۔

اسی تاریخی اور فطری حسن سے معمور مقام سے خورشید بسملؔ کا تعلق ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ خورشید بسملؔ اپنے خاندان کے پہلے فرد نہیں جنھوں نے اردو شاعری سے ناتا جوڑا ہے۔ اُن کے خاندان میں ایک طویل عرصے سے یہ روایت چلی آرہی ہے۔ اُن کے ایک بزرگ جو عبدؔ تخلص کیا کرتے تھے، اُن کے ہمعصر نادر شاعر چراغ حسن حسرتؔ سے چشمک تھی، جس کا اظہار دونوں اکثر شعر کی صورت میں کیا کرتے تھے۔ اُن کی قلمی بیاض آج بھی اُن کے خاندانی تبرکات میں

موجود ہے۔ میں نے یہ بیاض تقریباً تیس سال قبل انھیں کی وساطت سے دیکھی تھی۔ عبد کا ذکر میرے ڈی لٹ کے مقالے میں موجود ہے۔ جو چھپ کر خاص و عام تک پہنچ چکا ہے۔ خاندان میں شعری روایت اگر تواتر سے چلی آرہی ہو تو پھر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ غیر شعوری طور پر بھی کچھ کہہ دیں تو وہ موزونیٔ طبع کا پتہ دیتا ہے۔ اس کا ثبوت بسمل کے شعری مجموعے میں بیان کردہ اُس واقع سے مل سکتا ہے جو ایک حمد کی تخلیق کا موجب بنا۔ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بسمل لکھتے ہیں۔

''۱۴/اگست ۱۹۸۶ء کو علیل ولدِ محترم سے میں نے اُن کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے جواباً فرمایا ''راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے''

اِس موزوں جملے یا مصرعے نے اس حمد کی تحریک کا کام کیا جس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

ساری ہے حمد تیری ساری تیری ثنا ہے
رحمت کی تیری بے شک کوئی نہ انتہا ہے

تجھ سے ملی بشر کو منزل بھی آگہی بھی !
ظلماتِ یاس میں تو امید کا دیا ہے !!

ہم سب ہیں تیرے بندے مالک ہے تو ہمارا
''راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے''

غزل اردو شاعری کی معراج ہے اس میں جہاں حسن وعشق کے معاملات کو پیش کیا جاتا ہے جو اس کا محبوب ترین موضوع ہے وہاں زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی بھی بھرپور ترجمانی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خصوصاً جدید غزل نے تو اپنے روایتی موضوع سے ہٹ کر ہی اپنی کائنات تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ بسمل نے بھی غزل کے روایتی موضوع سے قدرے ہٹ کر زندگی کے اُن تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس سے وہ عبارت ہے اور جس کو دیکھے اور سمجھے بغیر اُس کے حقائق تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ان غزلوں کا اہم ترین پہلو وہ تفکر ہے جو قاری کو غور وخوض کی نہ صرف ترغیب دیتا ہے بلکہ رک کر شاعر کی روح میں اترے ہو۔ ئے اُس گوہر

مراد تک پہنچنے کی تحریک بھی دیتا ہے جو دراصل شاعر کا عندیہ ہے۔ بسملؔ کے یہ اشعار دیکھئے۔

ادراک ہی بے بس تھا ، کچھ بھی نہ سمجھ پایا
آنے کا ہے کیا مطلب، کیوں لوٹ کے جانا ہے

☆

احباب کی قبروں کو کیا دیکھنے آئے ہو؟
مٹی کے کھلونے تھے ، مٹی ہی ٹھکانا ہے

☆

جینا کسے کہتے ہیں آخر جو سمجھ آیا
''اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے''

☆

ہے کاوشِ لاحاصل ، انسان کی ہر کوشش
کہتے ہیں سکوں جس کو اِک خواب سُہانا ہے

☆

ان اشعار کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے گہرے شعور نے بسملؔ کو بہت سے ایسے حقائق تک پہنچا دیا ہے۔ جن تک انسان زندگی کی بھٹی میں تپنے کے بعد ہی پہنچ پاتا ہے۔ زندگی کے یہ ٹھوس حقائق ایسے نہیں ہیں کہ اُن تک کسی نے پہلی بار رسائی حاصل کی ہو لیکن اُس کے لہجے میں جو ایک صوفیانہ انجذاب پیدا ہو گیا ہے وہ بیانیہ ہوتے ہوئے بھی متاثر کرتا ہے۔ اس انجذاب کو تفکر کی آنچ نے اگر دو آتشہ نہیں تو کم سے کم آتشِ زیرِ پا کی کیفیت سے ضرور آشنا کر دیا ہے۔

معلوماتی واطلاعاتی دھماکہ خیزی (Knowledge Explosion) نے اس دور کی زندگی کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے کہ بسا اوقات انسان خود کو ایک ایسی دلدل میں پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے جس سے نہ تو وہ نکل سکتا ہے نہ اُس میں غرق ہو سکتا ہے۔ ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' والی کیفیت سے خود کو دوچار پاتا ہے۔ اس دور میں انسان کی حالت یہی ہے۔ شائد اسی لئے فراقؔ بھی

یہ کہے بنا نہ رہ سکا۔

اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہوگئی

اقدار کی شکست نے زندگی کی بے معنویت کے احساس کو جس طرح عام کرنے کی کوشش کی ہے اُس سے بسملؔ بھی متاثر ہوئے نظر آتے ہیں گو وہ نامساعد حالات کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے۔ ایسا اگر ہوتا پھر وہ یہ جاننے کی کوشش کبھی نہ کرتے کہ ایسا کیوں ہے؟ نہ وہ اپنے عمل کا محاسبہ کرتے نہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نگاہ ڈالتے، اُسے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اُن کا یہ رویہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ابھی وہ زندگی سے قطعی طور مایوس نہیں ہوئے۔ دور وجود کے نہاں خانے میں کہیں کوئی دیا ابھی ٹمٹما رہا ہے۔ جو غور وخوض کی ترغیب دیتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

سمندر خامشی کا شش جہت ہے اُبھرتا، ڈوبتا رہتا ہوں اکثر!
مری آنکھوں میں ہے خوابِ پریشاں! عجب ہے میری بیداری کا منظر!
ہے سارا صحن روشن قمقموں سے طلاطم ظلمتوں کا گھر کے اندر!
سوا نیزے پہ سورج آگیا ہے ہوئی ہے زندگی مانندِ محشر!

انسانی معاشرے کی تشکیل میں انسانی رشتے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی لئے سبھی آسمانی صحیفے اُن کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ لیکن کچھ رشتے وہ بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق صرف انسان کا اپنی ذات سے ہوتا ہے جو براہِ راست تو سماج کی تہذیب میں کردار ادا کرتے نظر نہیں آتے لیکن غور کیجئے تو یوں لگتا ہے جیسے معاشرے کی تہذیب وترتیب میں وہ بھی کوئی کم اہم کردار ادا نہیں کرتے۔ معاشرے کی تشکیل کا منبع اگر انسان ہے تو ذات سے رشتوں کا محور بھی انسان ہی ہے پھر دوئی وبُعد کیا؟ لیکن انسان کی زندگی میں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کی زہرتابی سے بچنے کے لئے مجاز کا سہارا لینے کے لئے خود کو مجبور پاتا ہے۔ ذات کے آئینے میں اُسے جو عکس دکھائی دیتے ہیں وہ اتنی ہولناک صداقتوں کو لئے ہوتے ہیں کہ وہ اُن کی جگہ مادی اور عبوری صداقتوں کے سائے میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ ان اشعار میں بسملؔ نے اِسی انسانی حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوم کے پتھر آئینے کو توڑ دیا اِک بالک نے
اپنے آپ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اِک بالک نے

آگے اونچی دیواریں ہیں پیچھے گرد اُڑاتی راہ
کیسے موڑ پہ لاکر بسملؔ چھوڑ دیا اِک بالک نے

زندگی کی وہ قدریں جو اسے وزن ووقار عطا کرتی ہیں جب گھنا جاتی ہیں یا جب آدمی کا یقین اُس سے اُٹھ جاتا ہے تو اِس تبدیلی کا منفی اثر فطرت کے نظام پر بھی پڑتا ہے کیونکہ اس کائنات کی تشکیل انسان کے لئے ہی تو کی گئی ہے۔ وہی تو اشرف المخلوقات اور مرکزِ کائنات ہے۔ ہمارے دور میں زمینی و ماحولیاتی عناصر میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے اُس کی بنیادی وجہ آدمی کا اپنے منصب سے ہٹنا ہی تو ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کی طرف بسملؔ کس خوبصورتی سے اشارہ کرتے ہیں۔

کوئی بادل اس طرف سے کیا گیا ہر کلی ہر شاخ کو ایطا گیا
مچھلیاں پانی میں جل کر رہ گئیں اور چٹانوں کا دل کجلا گیا

چاند، سورج میرے کوچے میں کبھی آئے نہیں
غالبًا اس شہر کی ہیں ساری تعمیریں غلط

☆

جی چاہے جیسے جو بھی کئے جاؤ دوستو!
بستی میں کوئی فعل نہ معیوب رہا ہے

☆

یوں تو زندگی بذاتِ خود کسی المیے سے کم نہیں ہے، اس پر اگر انسان نظر بینی اور دلِ وجود تک اُترنے کی قدرت بھی رکھتا ہو تو وہ یعنی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ بسملؔ کے یہاں یہ کیفیت بھی جاری وساری نظر آتی ہے۔ اُن کی شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں یہ ایک طرح کی خنکی محسوس نہ کی جاسکتی ہو۔ زندگی کے گہرے شعور میں اس خنکی میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

دوستو! کیسے کہوں کیسی قیامت ہوگئی زندگی جو بھی ملی وقفِ ملامت ہوگئی
ٹہنی ٹہنی پھول خوشیوں کے تلاشے تھے مگر ہر قدم پر خار پائے اور ندامت ہوگئی

☆

اس طرح اب خموش ہوں بسملؔ　　اک شکستہ ستار ہوں گویا

☆

غم کی ایسی ہوا چلی بسملؔ　　شہر سارا اُداس بیٹھا ہے

☆

نہ رات ہی کا سکوں ہے باقی نہ دن کی راحت رسانیاں ہیں
زمانہ گزرا ، میں پھر رہا ہوں گلی گلی میں خیال ہو کر

☆

اب کے موسم کیا رنگ لایا　　ہر گل پر کانٹا اُگ آیا
کیوں آنکھیں ویرانے ڈھونڈیں　　کیوں بستی سے جی گھبرایا
مایوسی ، محرومی منزل　　ہم نے کیا رشتہ اپنایا

☆

کس لئے رکھا تھا میری داستاں کو نا تمام　　کیوں لکھا ہے ریت کی تختی پہ تو نے میرا نام
میں تو اپنی بھول سے دلدل میں آ کر پھنس گیا　　دیکھتے ہو تم تماشہ بیٹھ کر بالائے بام

☆

جدیدیت نے جس نئی حسیّت کو جنم دیا تھا اس نے عالمی ادب کے ساتھ ہی ساتھ اردو ادب کو بھی متاثر کیا اور کم و بیش بیس برس تک اردو شعر و ادب میں ایسے ایسے تجربے کرائے جو مثبت ہو یا منفی پر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے کچھ ایسے فن پارے بھی اردو ادب کو دئے جو اب ہماری ادبی تاریخ کا حصّہ ہیں اور جن سے کوئی صرفِ نظر کی جسارت نہیں کر سکتا۔ اس جدید حسیّت نے موضوعاتی ہی نہیں لسانی سطح پر بھی ایسے لہجے کو یا شعریات کو پروان چڑھایا جو متاثر کئے بنا نہیں رہتا۔ ایسی شعریات کا احساس ہمیں بسملؔ کے ان اشعار کو پڑھتے ہوئے ہوتا ہے۔

گھر میں جب بے گھر رہتے ہیں　　روتے بام و در رہتے ہیں
بسملؔ خود سے بھی چھپتا ہوں　　شیشے نے چہرا دِکھلایا
ساری فصلیں زہریلی ہیں　　کھیتوں میں کیا ناگ رہے ہیں

بسمل نے غزلوں کے علاوہ اچھی خاصی تعداد نظموں کی بھی تخلیق کی ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے ان میں بھی خاص تنوع ہے۔ مثلاً کچھ نظمیں اگر حُسنِ فطرت (دہرہ گلی کے نام، پیڑ، برف باری، شجر، بہار کا موسم) سے متعلق ہیں تو کچھ سماج میں ہو رہے خون خرابے کو موضوع بناتی ہیں۔ اِن میں ''ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا'' اور ''سرزمینِ کشمیر کے نام'' خصوصاً قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ کچھ سماجی بُرائیوں کے انسداد پر مبنی ہیں جیسے ''سگریٹ نوشی، نقل کے خلاف صدائے احتجاج'' ایک دو نظموں میں اتفاق واتحاد کی برکتوں کو موضوع بنایا گیا ہے چند تہنیتی اور رثائی نظمیں بھی ہیں۔

مجموعی اعتبار سے بسملؔ نے انھیں اچھی طرح نبھانے کی کوشش کی ہے ہاں اُن نظموں میں روانی زیادہ ہے جن کا تعلق حالاتِ حاضرہ سے ہے۔ کچھ نمونے پیش کرتا ہوں۔

راہ گیروں کے تڑپتے ہوئے لاشے دیکھوں
رات دِن خوں میں نہائی ہوئی گلیاں دیکھوں (ہندنامہ)

بادِ صبا و سبزۂ نورستہ اب کہاں
بارود کا دھواں ہے چناروں کے دیس میں (ایک پہلو ......)

بنے فردوس برروئے پھر سے چمن میرا
خدایا آگ کے دریا سے کوئی راستہ دے دے

(سرزمینِ کشمیر کے نام)

انہوں نے کچھ قطعات بھی لکھے ہیں جو عصری مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ مثنوی خیرِ کثیر سے پہلے ''سی حرفی'' کے عنوان سے بھی طبع آزمائی کی ہے۔

مثنوی خیرِ کثیر میں کچھ اخلاقی مضامین یا پند ونصائح کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تصوف کی چاشنی نے اشعار کی تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

گھر روشن ہوں بن جاتے ہیں دشمن بھی پروانے تاریکی میں ساتھ رہیں جو وہ سچے یارانے
تنگی طلبی جیون ساتھی اس سے نہ گھبرانا چند لمحوں کے موسم بسملؔ اب آنا اب جانا
محنت کرکے راکھ جو پاؤ اُس کو امرت جانو لوٹ کھسوٹ کے سیم وزر کو زہرِ قاتل مانو

بدعملوں کی صحبت سے کب فیض کسی نے پایا کیکر پر انگور چڑھایائے ہر گچھا زخمایا
داناؤں نے اس دُنیا سے کب ہے آنکھ ملائی اِس کے جال میں جوبھی آیا اُس نے لی رُسوائی
ذاتوں پر جواتراتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ان لچروں سے بچ کے رہنا یہ سارے سودائی
رشتے ناتے جھوٹے بسملؔ اِن پر نہ اترانا تنہا آئے تنہا رہنا تنہا ہی ہے جانا

ان اشعار میں بعض ایسے بھی ہیں جن میں ٹھوس تجربات کو بے کم وکاست پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کچھ چہرے ہیں پیارے پیارے ناگ ہیں پر زہریلے
باطن میں ابلیسی ہیں یہ ظاہر میں شرمیلے
جیب رکھو گے بھر کے بسملؔ بنے گا یار زمانہ
خالی جیب اگر ہوجاؤ گھر پر بھی نہ جانا
کوئی ظاہر کوئی باطن روئے خلقت ساری
اِس دنیا میں کون ہے بسملؔ جو ہے غم سے عاری

جہاں تک شعریات کا تعلق ہے بسملؔ نے اپنے کلام میں اُسی لب ولہجے کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جو عوام سے قریب تر ہے۔ اِس کی وجہ شائد یہ کہ ان پر پہاڑی اور پنجابی لب ولہجے کا خاصا اثر ہے۔ غزلیات میں البتہ اُنھوں نے اردو کی کلاسیکی روایت سے ہی خود کو قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ سادگی، غنایت اور شستگی ایسی خصوصیات اُن کے کلام کو تاثیر کے جوہر سے آراستہ کرتی ہیں۔

☆☆

کہنہ مشق

☆...........ودیارتن عاصیؔ

# مٹھی بھر غزلیں

مری دُنیائے دِل زیرو زبر ہے
محبت کی نظر بھی کیا نظر ہے
مزاجِ دشمناں زیرو زبر ہے
ہمارا بخت بھی کیا اوج پر ہے
سحر تک خاک بھی باقی نہ ہوگی
یہ بزمِ ماہ و انجم رات بھر ہے
مِری مانے تو مانے کیا مِرا دل
یہ کافر آپ کے زیرِ اثر ہے
امیرِ شہر کو اس سے غرض کیا
فقیرِ شہر کب سے دربدر ہے
ہمارا دِل جسے کہتی ہے دنیا
جو سچ پوچھو وہ عاصیؔ ہی کا گھر ہے

☆☆

غمِ زندگی ہے نہ دَہشت قضا کی
بلائیں لیے جاتا ہوں ہر بَلا کی
اُسے فکر کیا ہو سزا و جزا کی
تری آرزو جس نے صُبح ومسا کی
جہاں تک ہوا ہم نے اُن سے وفا کی
وہ پھر بھی ہیں برہم، تو مرضی خدا کی
تری بے رُخی کا سبب کیا ہے آخر؟
سزا مل رہی ہے ہمیں کس خطا کی؟
اِدھر منتظر کوئی مہر و وفا کا
اُدھر اُن کو عادت ہے جور و جفا کی
دوا سے ملے اب شفا غیر ممکن
مِرے چارہ ساز و گھڑی ہے دُعا کی
کبھی اِس طرف بھی ہو نظرِ عنایت
کبھی سُن تو لیں عاصیؔ مُبتلا کی

☆☆

☆ ............ودیارتن عاصیؔ

غم میں اک لطفِ شادمانی ہے
ٹھوکروں میں بھی کامرانی ہے
صرف اِک عشق غیر فانی ہے
ورنہ ہر چیز آنی جانی ہے
جو نہیں آشنا محبت سے
دِل پہ اس بُت کی حکمرانی ہے
موت اور زندگی میں ہے یہ فرق
اک حقیقت ہے، اک کہانی ہے
یاد تیری ہے زیست کا حاصل
غم ترا وجۂ شادمانی ہے
چشمِ پُرنم پہ میری خاموشی
دِل کے زخموں کی ترجمانی ہے
کیا بُرا جو کِسی کے کام آئے
جان اِک دِن تو یوں بھی جانی ہے
اٹکی ہے جاں لبوں پر اے عاصیؔ!
چارہ سازوں کی مہربانی ہے

☆☆

چارۂ دردِ نہاں بن کر رہے
وہ ہمارے رازداں بن کر رہے
یہ زمانہ طنز فرماتا رہا
ہم محبت کی زباں بن کر رہے
ہم سے قائم تھا وقارِ زندگی
پھر بھی گردِ کارواں بن کر رہے
موت بھی اُس سے رہی دامن کشاں
آپ جس کے مہرباں بن کر رہے
دِل کی دُنیا عمر بھر روشن رہی
داغ دل کے کہکشاں بن کر رہے
اس میں کوئی مصلحت تھی دوستو!
ہم جواب تک بے زباں بن کر رہے
ہم رہے خاموش اے عاصیؔ مگر
اِک سراپا داستاں بن کر رہے

☆☆

☆ ............ودیارتن عاصیؔ

هنس کر کبھی ہم سے گلفام نہیں ملتا
کچھ اپنی وفاؤں کا انعام نہیں ملتا
عنقا ہے محبت میں اب لطف وکرم ان کا
اب رنج میں راحت کا پیغام نہیں ملتا
کہیے تو کسے کہیے ، اس محفلِ دنیا سے
تکلیف تو ملتی ہے ، آرام نہیں ملتا
ہم جس کی تمنّا میں مدّت سے ہیں سرگرداں
وہ صبح نہیں ملتا، وہ شام نہیں ملتا
جو مست بنا ڈالے ہر غم کو مٹا ڈالے
ساقی تری محفل میں وہ جام نہیں ملتا
ہر بزم میں اے عاصیؔ چرچے تھے کبھی جن کے
ڈھونڈے سے کہیں اُن کا اب نام نہیں ملتا

☆☆

جب کبھی اس شوخ سے میری نظر ٹکرا گئی
کیا کہوں میں زندگی پر بے خودی سی چھا گئی
وہ نظر جب بھی مرے دِل پہ کرم فرما گئی
آرزوئیں مسکرائیں ، زندگی لہرا گئی
اس نوازش سے تو دِل کچھ اور مضطر ہو گیا
اُن کی آمد مجھ پہ اک طرفہ قیامت ڈھا گئی
اُن کی زلفوں کا مچلنا جب مجھے یاد آ گیا
میرے دِل پر یک بیک اک برق سی لہرا گئی
بحرِ غم میں آج پھر اک حشر برپا ہو گیا
کشتیِ دِل آج پھر طوفان سے ٹکرا گئی
ساقیِ گلفام کے چہرے سے جب سرکی نقاب
عاصیِؔ وارفتہ کی آنکھوں میں مستی چھا گئی

☆☆

☆............ودیا رتن عاصی

چند لوگوں نے زندگی کی ہے
ورنہ اکثر نے خودکشی کی ہے
پاک ہم بھی نہیں ہیں، ہم نے بھی
چڑھتے سورج کی بندگی کی ہے
ہم وہی ہیں ، ہمارے طور وہی
صرف پینے میں کچھ کمی کی ہے
کیوں بگڑتے ہیں لوگ، ہم نے میاں
کب کسی کی برابری کی ہے
تنکا تک بھی نہ توڑ پائے کبھی
فکر سارے جہان کی کی ہے
دوست ہم بھی نہیں رہے اپنے
کس نے کس سے زیادتی کی ہے
سب نے دیکھا ہے دور سے، وہ بھی
ہم نے عاصیؔ سے بات بھی کی ہے

☆☆

ایک دِن سارے نشے اُتر جائیں گے
تم بھی مر جاؤ گے، ہم بھی مر جائیں گے
ہم نہ ہوں گے تو ہم بدلیوں کی طرح
آسمانوں سے ہو کر گزر جائیں گے
تیر کر جو نہیں، ڈوب کر ہی سہی
دیکھنا پار ہم بھی اُتر جائیں گے
رات دھومیں مچالو ! سرِ میکدہ
صبح دم تُم کِدھر، ہم کِدھر جائیں گے
نا خداؤں کی پہچان ہونے تو دو!
لوگ خودکشتیوں سے اُتر جائیں گے
تو ہی عاصیؔ بتا آخری وقت ہم
تیرا در چھوڑ کر کس کے در جائیں گے

☆☆

مکالمہ

☆............محمد سلیم سالک

# شعر خوب معنی ندارد

(ریاست کی معروف شاعرہ رخسانہ جبین کے ساتھ ایک گفتگو)

**س:- اپنے تخلیقی سفر کی ابتداء کے بارے کچھ بتایئے۔؟**

ج:- یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے جب میں نے کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں داخلہ لیا۔ شعبہ کی طرف سے ہر ہفتہ ایک بزمِ ادب ہوا کرتی تھی جس میں طلباء و طالبات اپنی نگارشات پیش کرتے تھے۔ یہ ہفتہ وار بزم پوری یونیورسٹی میں مشہور تھی۔ اس لئے دیگر شعبہ جات کے طلباء شوق سے اس بزم میں شامل ہوتے تھے۔ اس بزم کی خاص بات یہ تھی کہ خود حامدی کاشمیری صاحب تشریف لاتے تھے اور طلباء کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، ساتھ ہی فنی رموز کی آگاہی بھی دیتے تھے۔ اُن کی ہی تحریک سے میں نے باضابطہ لکھنا شروع کیا۔

بقولِ شاعر ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار	اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

**س:- گھر میں کیسا ماحول تھا جب آپ نے شاعری شروع کی۔؟**

ج:- میرے گھر میں والدین میں سے کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ میں شعر کہنے لگی ہوں لیکن میری بڑی بہن چونکہ شعبۂ اردو میں پڑھ رہی تھی تو اُن کو پتا تھا اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس کے بعد انہوں نے بھی شعر و شاعری شروع کر دی اور باقاعدہ پروین شاہی کے نام سے مشاعروں

میں حصہ لیتی تھیں۔اس طرح گھر میں ایک ادبی ماحول بن گیا۔

**س:-آپ نے فارسی میں ایم۔اے کیا ہےاس کی کوئی خاص وجہ؟**

ج:-اردو میں ایم،اے کے دوران ہی میں نے محسوس کیا کہ فارسی زبان کی شناسائی کے بغیر اردو میں کوئی سنجیدہ کام کرنا بہت مشکل ہے اس لئے فیصلہ کیا کہ فارسی میں ایم،اے کروں، پھر فارسی میں اتنی دلچسپی پیدا ہوگی کہ ایم فل کے لئے ''شعر معاصر ایران'' زیرِ نگران ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی ایک تحقیقی مقالہ سپردقلم کیا۔اس کے بعد پی،ایچ،ڈی کے لئے مواد جمع کر رہی تھی کہ ریڈیو سے بلاوا آیا۔اس طرح پی،ایچ،ڈی مکمل نہ کرسکی۔

**س:-کشمیر میں فارسی شعراء کی ایک زبردست روایت رہی ہے آپ نے کس شاعر کا خصوصی مطالعہ کیا۔؟**

ج:-بہ طورِ خصوصی ملا طاہر غنی کشمیری کو میں بہت پسند کرتی ہوں۔میں نے اُن کا مطالعہ گہرائی سے کیا ہے اور دل میں یہ خواہش تھی کہ اُن کے کلام کا کشمیری میں منظوم ترجمہ کروں۔

**س:-آپ کے متعلق یہ تاثر عام ہے کہ آپ بہت کم لکھتی ہیں اس کی کیا وجوہات ہیں۔؟**

ج:-یہ شکایت اپنی جگہ بجا ہے لیکن شاعری کرنے کے لئے وقت درکار ہے۔کیونکہ فنونِ لطیفہ میں شاعری مشق طلب فن ہے۔مثال کے طور پر گھر سے نکلتے وقت میرے ذہن میں شعر تخلیق ہو رہا ہے لیکن جب تک ذہنی یکسوئی میسر نہیں آتی تب تک یہ شعر غزل یا نظم کے قالب میں نہیں سما سکتا۔اب اگر انسان گھر میں بھی مصروف ہے اور دفتر میں بھی،تو شعر ذہن کے نہاں خانوں میں ہی دب کر رہ جاتا ہے۔دوسری بات شاعری کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے رسالوں یا اخباروں کا سہارا لینا ضروری ہے یا پھر کلام کو کتابی شکل دینی ہوگی۔جس کے لئے پیسوں کے علاوہ وقت اور ذہنی یکسوئی نہایت ضروری ہے،خدا کا شکر ہے کہ پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں،اللہ کے فضل سے اتنا مواد جمع ہو گیا ہے کہ اب ایک شعری مجموعہ منظرِ عام پر آسکے۔

**س:-ریاستی ادیبوں کو اکثر یہ شکایت رہی ہے کہ برِ صغیر میں انہیں پذیرائی حاصل نہیں ہوتی۔آپ کی دانست میں اس کے کیا محرکات ہیں؟**

ج:-میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔پہلی بار جب میرا کلام ''سطور'' میں شائع ہوا تو اس

کے ایڈیٹر مشہور شاعر کمار پاشی تھے، وہ مجھے بالکل نہیں جانتے تھے لیکن کلام دیکھ کے انھوں نے پورا ایک صفحہ تعارفی کلمات سے بھر دیا۔ اس کے بعد مسلسل میرا کلام چھپتا رہا۔ ملک کے تمام رسائل میں جن میں شبِ خون، شاعر، مفاہیم، عصری آگہی، تناظر، الفاظ، شیرازہ وغیرہ شامل ہیں۔

**س:- آپ کا نظریہ شعر کیا ہے؟**

ج:- بقولِ بیدلؔ          شعرِ خوب معنی ندارد

شاعری کے متعلق بہت سے نظریات پیش کئے گئے ہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں شعر کو ایک ضرورت مانتی ہوں۔ شاعری میں انسان اپنے جذبات و احساسات کو بہترین اور پُر اثر طریقہ سے ادا کرسکتا ہے جب کوئی بات دل یا ذہن کو چھو جائے تو اسے شعر میں ڈھالنے کے لئے دل میں بے چینی کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور جب تک یہ احساس کاغذ پر نہیں اترے گا تب تک ذہن و دل پر بوجھل پن محسوس ہوگا۔

**س:- کہا جاتا ہے کہ پدرشاہی نظام کے خلاف ''نسائی آتش فشاں'' پھوٹ پڑا ہے۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟**

ج:- ذاتی طور پر میں اس سے اتفاق نہیں کرتی ہوں۔ چونکہ عورت کو پدر شاہی نظام نے صدیوں سے دبایا ہوا ہے اس لئے عورت فنونِ لطیفہ کا سہارا لے رہی ہے۔ تخلیقی اپج اپنا کام خاموشی سے کرتی رہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دبی کچلی روح زیادہ متحرک ہوسکتی ہے کیونکہ مایوسی اور اداسی کے ماحول میں زیادہ رسیلے نغمے تخلیق ہوتے ہیں لیکن مغرب میں جہاں عورت مردانہ زندگی گزار رہی ہے پھر وہاں کی عورت کو تخلیقی میدان میں Inactive ہونا چاہئے تھا۔

**س:- مابعد جدیدیت میں Feminism پر زور دیا جا رہا ہے یہاں تک کہ ''نسوانی تخلیق'' کی اصطلاح رائج ہوگئی ہے۔؟**

ج:- یہ عورت کے ساتھ زیادتی ہے کہ اس کی تحریر کو صرف ایک عورت کی تحریر سمجھا جائے۔ وہ عورت پن سے انکار تو نہیں کرسکتی اور نہ ہی کرنا چاہیے لیکن اس کی تخلیقات کو ایک تخلیق کار کی نظر سے دیکھا جانا چاہیے نہ کہ مرد یا عورت کی حیثیت سے۔ اتنا ضرور ہے کہ اکثر خواتین کی تخلیقات میں نسوانیت جھلکتی ہے لیکن اسے نہ کمزوری سمجھا جانا چاہیے نہ کوئی اضافی خوبی۔ یہ ایک فطری بات

ہے کہ عورت کے لب ولہجہ میں نسائیت ہوگی اس کا اسلوب مرد سے مختلف ہوگا۔

**س:- کشمیر میں شاعرات بہت کم نظر آتی ہیں اس کی بنیادی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔؟**

ج:- کشمیر میں لِلہ عارفہ کے نام سے کون واقف نہیں۔ ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ کشمیر میں شاعری کا پہلا سنگِ میل ایک عورت سے منسوب ہے اور پھر اس کارواں میں اور بھی نام شامل ہوتے رہے۔ حبہ خاتون، ارنہ مالؔ، روپہ بھوانیؔ اور جہاں تک موجودہ دور کی خواتین کا تعلق ہے ایک اچھی خاصی تعداد شاعرات کی ہے۔ عورت کے جذبات کے اظہار کے لئے شاعری بہترین وسیلہ ہے، ہماری ان پڑھ خواتین Folklore (لوگ گیت) میں ہر زمانے میں اضافہ کرتی رہی ہیں۔ جب وہ چرخہ کاتتے گنگناتی تھیں تو اپنے دل کا حال بھی اس خزانے میں بھر دیتی تھیں۔ یا بچے کو سلاتے وقت جب ماں لوری سناتی ہے تو وہ ایک شاعرہ بن جاتی ہے۔ عورت تو بنیادی طور پر ایک شاعر کا دل رکھتی ہے۔ اب اس بیچاری کو وہ مواقع میسر نہیں ہیں جو مرد کے لئے ہیں۔ اس وجہ سے بہت خواتین سامنے آسکی ہیں لیکن جتنی بھی خواتین لکھ رہی ہیں، شعر اور شعر شناس طبقہ داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج جو تازہ دم خواتین شعر و ادب میں اپنا مقام پا چکی ہیں ان میں ترنم ریاضؔ، نسیم شفائیؔ، بملا رینہ قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ایک خاتون ہیں جن کی شاعری مجھے بہت پسند تھی جو عابدہ احمد کے نام سے لکھتی تھی نہ جانے انھوں نے لکھنا کیوں ترک کر دیا۔

**س:- بین الاقوامی سطح پر آپ کن شاعرات سے متاثر ہیں۔؟**

ج:- موجودہ دور میں کشور ناہیدؔ کو بہت پسند کرتی ہوں۔ حالانکہ پروین شاکرؔ کو بھی دلچسپی سے پڑھا ہے اور ان کے سینکڑوں اشعار ازبر ہیں کیونکہ وہ خالص جذبہ کی شاعرہ ہیں، جبکہ کشور ناہیدؔ فکر کی شاعرہ ہیں۔ فکر کا عنصر انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

**س:- آپ نے ہمیشہ بحیثیت شاعرہ اپنا تشخص چاہا ہے یا بطورِ براڈ کاسٹر۔؟**

ج:- ادب کے ساتھ ساتھ نشریات کی دنیا میں بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے وابستہ رہی ہوں۔ بفضلِ خدا میرے پیش کردہ پروگرام سامعین کو پسند آتے تھے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ بحیثیت شاعرہ مجھے کشمیر سے باہر بھی لوگ جانتے ہیں یہاں تک کہ اردو زبان کے معروف نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ''سانحہ کربلا بطورِ شعری استعارہ'' میں بطورِ حوالہ میرا تذکرہ

کیا ہے۔ بین الاقوامی مشاعروں میں شرکت کرنے کا شرف بھی مجھے حاصل رہا ہے۔لیکن اس کے باوجود میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں بطورِ شاعرہ میرے قارئین کا دائرہ وسیع نہیں ہے جتنا کہ بطورِ براڈ کاسٹر میرے سامعین کا تھا۔ کیونکہ ریڈیو کی آواز گھر گھر پہنچتی ہے اس لئے ریڈیو کے حوالے سے لوگ مجھے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ بات میرے لئے اعزاز ہے کہ ریاست کے کونے کونے میں میرا پروگرام دلچسپی سے سنا جاتا تھا۔

**س:۔'' پیامِ صبح'' آپ کا مقبول ترین پروگرام رہا ہے اس میں نت نئے اور متنوع موضوعات کے مواد کی فراہمی آپ کیسے ممکن بنا پاتی تھیں۔؟**

ج:۔مواد فراہم کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ہماری زندگی جتنی رنگا رنگ ہے ہمارے موضوعات بھی اتنے متنوع ہوتے ہیں۔قومی اخبارات، رسائل، کتابیں، انٹرنیٹ اور سب سے بڑھ کر دن بھر کے مشاہدات اور عملی زندگی میں پیش آنے والے واقعات یہی سب تو ہے جو پروگرام کا موضوع بنتے تھے۔ حالانکہ ذاتی طور پر میں محسوس کرتی ہوں کہ اس پروگرام کے لئے جتنی لگن اور محنت کی ضرورت تھی، میں اتنا نہیں کر پاتی تھی۔ کاش! میں کچھ کر پاتی۔

**س:۔کشمیر میں یہ روایت رہی ہے کہ خواتین کو میڈیا سے دور رکھا جاتا تھا۔آپ نے اس مرحلے کو کیسے طے کیا؟**

ج:۔یہ بیس پچیس سال پرانی بات ہے آج کل تو میڈیا خواتین کو خوش آمدید کہتا ہے اور گھر والے بھی اس تلاش میں ہوتے ہیں کہ ہماری بیٹی کہیں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرے۔لیکن جب میں نے ریڈیو Join کیا تو اپنی سوسائٹی کو اس بات کے لئے قائل کرنا میرے لئے بہت مشکل تھا کیونکہ لوگوں کا تصور ریڈیو کے بارے میں یہ تھا کہ یہاں جو خواتین نوکری کرتی ہیں وہ یا تو گانا گاتی ہیں یا ڈراموں میں اداکاری کرتی ہیں اور کوئی کام ہوسکتا ہے انہیں معلوم نہیں تھا۔ پہلے پہل مجھے بہت جدوجہد کرنا پڑی لیکن جب بعد میں میرے رشتہ داروں کو پتہ چلا کہ براڈ کاسٹنگ کی دنیا کتنی وسیع ہے تو داد دینے لگے اور پھر شاید ہی کوئی رشتہ دار ایسا ہوگا جو میرا پروگرام سننے کے لئے بے چین نہ رہتا تھا۔

**س:۔اردو زبان وادب کے حوالے سے میڈیا کیا رول ادا کر رہا ہے۔؟**

ج:۔میرا یہ ماننا ہے کہ میڈیا مردہ کو زندہ ثابت کرسکتا ہے۔اگر میڈیا کا استعمال مثبت

انداز سے کیا جائے تو ایک انقلاب آسکتا ہے جہاں تک اردو کا سوال ہے یہ تو میڈیا کی بدولت زندہ ہے ورنہ جن گوشوں سے اسے سرپرستی ملنی چاہیے تھی نہیں مل رہی ہے۔

**س:- حال ہی میں آپ نے ایران کا سفر کیا، کشمیر کو ایرانِ صغیر کہا جاتا ہے۔ کیا سچ مچ وہاں اس بات کا احساس ہوتا ہے۔؟**

ج:- کشمیر کو ایران صغیر اس لئے بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے تہذیب و تمدن میں مماثلت بہت ہے۔ ایرانی بھی ہماری طرح بے انتہا مہمان نواز ہیں یہاں تک کہ مخاطب پر جان فدا کرتے ہوئے گفتگو شروع کرنے کی روایت بھی دونوں کے درمیان مشترک ہے۔ ''قربون شما'' یعنی ''زووندے''۔ ''بلا یہ لگے''۔ بات بات پر زبان پہ آجاتا ہے۔ کلام میں یہ شیرینی شاید ہی کسی اور زبان میں پائی جاتی ہو۔ حسنِ فطرت کی وجہ سے بھی کشمیر ایرانِ صغیر کہلاتا ہے۔ لیکن میں اس مختصر سے دورے میں ایران کو نہیں دیکھ پائی، یہ عالمی سطح کی اسلامی کانفرنس تھی جس میں شرکت کی غرض سے میں مدعو تھیں۔ اس کا شیڈول اتنا مختصر تھا کہ کانفرنس کے علاوہ اور کچھ کرنے یا اور کہیں جانے کی بات سوچنے کا مجھے موقعہ ہی نہیں مل پایا۔ انشاء اللہ میرا ارادہ ہے کہ میں اس مقصد سے دوبارہ ایران جاؤں گی تاکہ میں تہران کے علاوہ دیگر اہم شہروں کی زیارت کر پاؤں۔ اصفہان جیسا شہر جسے نصف جہان کہا جاتا ہے شیراز جہاں سے سعدی اور حافظ جیسی ہستیاں وجود میں آئیں اور پوری دنیا میں اپنے ملک کا نام روشن کر دیا۔ قم جو ایرانی تمدن اور مقدس مقامات کا مرکز ہے۔ طوس، نجف اور بھی بے شمار خوبیوں کے شہر دیکھنے کی تمنا ہے وہ انشاء اللہ دیکھوں گی۔

**س:- ریڈیو سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ کا شعری مجموعہ آنا چاہئیے تھا لیکن اس میں اب دیری کیوں۔؟**

ج:- میرے شعری مجموعے کی اشاعت میں حد سے زیادہ تاخیر ہوگئی ہے۔ وجہ کچھ بھی نہیں بس میرا تساہل ہے اور کچھ نہیں لیکن انشاء اللہ اب مزید تاخیر نہیں ہوگی۔ دو ہزار اٹھارہ ہی میں ''چراغ چہرہ'' نام سے میرا مجموعہ آنے والا ہے۔

**س:- ریڈیو میں سروس کے دوران آپ کن کن شخصیات سے متاثر رہی اور کیا کیا تجربات رہے۔**

ج:- ریڈیو نشریات کے ساتھ میری وابستگی یوں تو گزشتہ چار دہائیوں کو محیط ہے لیکن باضابطہ طور پر میں نے ریڈیو کی خدمات بتیس سال تک انجام دیں مختلف حیثیتوں میں، میں نے ریڈیو کشمیر میں پروگرام ایگزیکٹیو کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اس کے بعد اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہی جو انتظامی امور چلانے کے لئے مخصوص عہدہ ہے لیکن چونکہ میری دلچسپی بنیادی طور پر پروگراموں کی پروڈکشن سے زیادہ تھی، میں اس سے دست بردار نہیں ہوئی۔ اس دوران میں ایڈمنسٹریشن کے ساتھ ساتھ پروگرام بھی پیش کرتی رہی اور آخر میں اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے دو ہزار پندرہ میں ریٹائر ہوئی جو کہ خالصتا ایڈمنسٹریٹیو پوسٹ ہے۔ پروگراموں کی ترتیب و پیشکش کے دوران بڑی بڑی ہستیوں کے ساتھ ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ ریڈیو کشمیر کے مختلف ادبی پروگراموں کی ترتیب و تہذیب کے دوران بہت ساری ادبی شخصیات سے ملنے کا موقعہ ملا۔ پہلے اپنی ریاست کے ادیبوں شاعروں کی بات کریں تو اپنے استاد محترم کا نام لینا چاہوں گی۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کا جن کے ساتھ بے شمار ادبی نوعیت کے پروگرام کرتی رہی خاص کر ماہانہ ادبی میگزین ''ہم قلم'' کے لئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے متعدد مسودے لکھوائے فکرِ اقبال سلسلے کے تحت۔ فکرِ اقبال ہی کے سلسلے میں مرحوم پروفیسر محمد امین اندرابی، پروفیسر رشید نازکی، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر بشیر احمد نحوی اور دیگر محترم ماہرینِ اقبالیات سے تقاریر لکھواتی رہی۔ ہاں اقبالیات کی بات چلی تو پروفیسر آل احمد سرور کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں جو کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اقبالیات کے ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے، وہ ہمارے پروگراموں کی شان بڑھاتے تھے۔ میں نے متعدد آل انڈیا اردو مشاعروں کا اہتمام ریڈیو کی طرف سے کرائے جن میں ملک کے مقتدر شعراء کو میں بلاتی تھی۔ شہریار، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، عزیز بانو، داراب وفا، بشیر بدر، ندا فاضلی، مخمور سعیدی، پریم کمار نظر، زبیر رضوی، کرشن کمار طور، افتخار امام صدیقی، غرض تمام شعراء ان مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ میں نے برصغیر کی معروف و مقبول گلوکارہ ملکہ پکھراج کے ساتھ ریڈیو کشمیر کے لئے ایک محفل بھی ریکارڈ کرائی تھی، جو لسہ کول کے زمانے میں یہاں تشریف لائی تھیں۔ بلکہ ریڈیو میں آنے سے پہلے میں دور درشن کے ایک پروگرام میں عصمت چغتائی کے ساتھ ایک محفل میں شریک ہوئی تھی جس میں پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر حامدی

کاشمیری بھی عصمت چغتائی کے ساتھ گفتگو میں شامل تھے۔اس پروگرام کے پروڈیوسر مرحوم ظفر احمد تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو ادب کی بڑی بڑی ہستیوں کے ساتھ پروگرام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے،سب کے نام گنوانا ممکن نہیں۔

جہاں تک تعلق ہے متاثر ہونے کا وہ مجھے نہیں لگتا کہ میں کسی سے متاثر ہوئی کہ نہیں لیکن غیر شعوری طور پر ہوسکتا ہے کہ کچھ نہ کچھ اثر پڑا ہو، ہاں البتہ ایک بار میں نے عالمی سطح کی ایک براڈ کاسٹر محترمہ رجنی کول کے ساتھ ایک محفل ریکارڈ کی تو بڑا کاسٹنگ کے حوالے سے انہوں نے کچھ رموز بتائے جو مجھے اچھے لگے تھے اور ہوسکتا ہے اُن باتوں کا اثر مجھ پر پڑا ہو۔موصوفہ بی بی سی کی ہندی سروس کی بہت ہی سلجھی ہوئی براڈ کاسٹر تھیں۔

**س:۔نئی نسل کی شاعرات کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گی؟**

ج:۔نئی نسل کی شاعرات کے لئے سب سے پہلے کلاسیکل شعراء کا مطالعہ ضروری ہے دوسری بات مشق سخن کے ساتھ ساتھ کسی ایسے استاد کی تلاش جو فنی رموز سے آگاہ ہو۔

☆☆

## منظومات

☆............ پرتپال سنگھ بیتاب

### تمھیں نہیں معلوم

تمھیں نہیں معلوم کہ تمھارے ساتھ سفر میں
میں تم سے بہت آگے نکل چکا ہوں
میں جانتا ہوں کہ تم اپنے ساتھ
مجھے جہاں سمجھتی ہو
میں تمھارے ساتھ وہاں نہیں ہوں
بلکہ میں تمھارے ساتھ
وہاں سے بہت آگے نکل چکا ہوں
لیکن میں یہ سب تمھیں نہیں سمجھا سکتا
کیوں کہ اگر یہ سب تمھاری سمجھ میں آگیا
تو تم کہیں یہ نہ سمجھ لو
کہ میں تمھارے ساتھ ہوں ہی نہیں
بلکہ بہت آگے نکل چکا ہوں
اور تم پیچھے رہ گئی ہو
کہیں بہت پیچھے

☆☆

### کیا یہ تمھیں ہو؟

آج فوٹو البم میں تمھاری تصویر دیکھتے ہوئے یوں لگا
جیسے میں نے تمھیں کبھی دھیان سے دیکھا ہی نہیں
کچھ دیر کے لئے یہ دھوکہ ہوا
گویا یہ تصویر تمھاری نہیں کسی اور کی ہے
اور تصویر میں تمھاری نظر کے زاویئے کو دیکھ کر
محسوس ہوا کہ تم جہاں تک دیکھ سکتی ہو
میں کبھی وہاں تک سوچ ہی نہ سکا
عمر بھر ایسا کیوں ہوتا رہا؟
کیا اس لئے کہ تمھارے چہرے پر جو جلال ہے
اس نے مجھے کبھی تمھاری طرف غور سے دیکھنے ہی نہیں دیا
یا پھر روزمرّہ کی مصروفیات نے
ہمیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی
یا پھر اس لئے کہ ہم نے ایک دوسرے کو
کبھی دھیان سے دیکھنے کے قابل ہی نہیں سمجھا

☆☆

☆............پرتپال سنگھ بیتاب

## میرے بعد

قرطاس پر تحریر شُدہ میری تخلیقات
دنیا پڑھتی ہے، پڑھتی رہے گی
لیکن میری وہ نظمیں کون پڑھے گا
جو میں نے ہواؤں پر، فضاؤں پر تحریر کی ہیں
میرے وہ اشعار کوئی کیسے پڑھے گا
جو میں نے پانیوں پر منقش کیے ہیں
میری متعدد شعری تخلیقات جو
اونچے پہاڑوں پر جمی ہوئی برف پر
اور سمندروں سے اُٹھ اُٹھ کر
تیز رفتار میں دور دور اُڑتے پھرتے بادلوں پر
منعکس ہیں
اُن کا کیا ہوگا
میرے اندر موجود بے انتہا شعری کلام
جس کا ایک بہت چھوٹا حِصّہ میری زندگی میں
باہر آسکے گا
میرے بعد اُس کا کیا ہوگا

☆☆

## مکڑ جال

دوسروں کی کہانیاں سُنتے سُناتے
اس بات کا خیال ہی نہ تھا
کہ میرے اپنے اِرد گرد
کئی کئی کہانیاں بُنی جا رہی ہیں
سنی جا رہی ہیں، سُنائی جا رہی ہیں
اور جب تک اِس بات کا پتہ چلا
میرے اِرد گرد
کہانیوں کے تانے بانے
اِتنے الجھ چکے تھے
کہ ان سے باہر نکل پانا ممکن ہی نہیں تھا

☆☆

☆............ابراہیم اشک

# رُباعیات

(۱)

الفاظ یہ کہتے ہیں سخنور ہوجا
ہر موج یہ کہتی ہے سمندر ہوجا
پرواز یہ کہتی ہے کہ چھولے افلاک
لمحہ ہے تو صدیوں کے برابر ہوجا

(۲)

آہٹ کوئی محسوس ہوئی جاتی ہے
اب ساری فضا جھوم کے لہرائی ہے
پھر کوئی تصور میں چلا آیا ہے
ہر سانس رباعی کی طرح گاتی ہے

(۳)

امید وفا کی نہ کِیا کر اے دل
جو زخم ملے اس کو سیا کر اے دل
جو مانگے اسے پیار کا ساغر دے دل
جب پیاس لگے زہر پیا کر اے دل

(۴)

عظمت جو اگر اپنی بچانا ہے تمھیں
دنیا میں اگر امن ہی لانا ہے تمھیں
ملکوں کی تباہی کو ہوائیں مت دو
دہشت کو اگر جڑ سے مٹانا ہے تمھیں

(۵)

حالات سے مجبور بھی ہوجاتے ہیں
دنیا میں جو طوفان سے ٹکراتے ہیں
جب ہار کا ہوتا ہے تجربہ کوئی
پھر جیت کے آداب نئے آتے ہیں

(۶)

پایا ہے قلندر کا جس نے مزاج
رکھتا ہے ٹھوکر میں شاہوں کے تاج
دنیا کے بدلنے سے نہیں بدلے گا
یکساں ہیں اشک اس کے کل اور آج

(۷)

وہ لوگ جو دنیا پہ ستم ڈھاتے ہیں
اپنے ہی فریبوں میں اُلجھ جاتے ہیں
ہوتا ہے عذاب ایسا نازل اُن پر
تنہائی میں سائے سے بھی ڈر جاتے ہیں

(۸)

جس قوم کا معیار نہیں ہوتا ہے
اس قوم کا کردار نہیں ہوتا ہے
جو قدر نہیں کرتا ہے فن کاروں کی
اس ملک میں شہکار نہیں ہوتا ہے

☆☆

☆............مظفر ایرج

# یافت

رقص کرتے ہوئے پابہ زنجیر
لمحوں کی پرچھائیوں کے قفس میں مقید
سیہ
پھڑ پھڑاتا ہوا
ایک زاغِ کہن سال
صدیوں کی تاریکیاں
ان سُنی
التجاؤں کے بے ربط مدھم ہیولوں کے
مربوط، بے انتہا دائروں کی عجب سرسراہٹ
ابھی وقت گزرا نہیں
انتظارِ مسلسل
ابھی آسماں
سات نیزے پہ آیا نہیں
ابنِ آدم کی
تخلیق پیہم
کہ
سورج
ابھی آگ بن کر تو برسا نہیں
تجسس
عمل

سنسنی
موج پیرا ہوائیں
بلندی کو
چھوتی ہوئی
سربلندی کی خواہاں
ستارہ شناسوں میں اعلان کردیں
کہ
شمس وقمر سے
گزرتے ہوئے
کہکشاں سے
مجھے
صبحِ نو کی بشارت ملی ہے
قلم روئے دل کی امامت ملی ہے
مرے واسطے
احتسابِ قلم، انتساب نظر...... (کچھ نہیں ہے)
مسرت کا مژدہ
بلند بانگ بھی، خوبرو، خوبصورت
مری سلطنت میں جو آنے کا
مشتاق ہو
آرزومند ہو

برگزیدہ ہو، برگشتہ تسلیم سے ہو، گنہگار ہو
آئے آئے
کہ میری قلمرو میں
تیغ وسناں کی ضرورت نہیں
مری مملکت میں
مرا
ہمسفر بن کے چلنے پہ ایمان لائے کوئی
تیسری آنکھ چاہے نہ رکھتا ہو
لیکن وہ حساس تو ہو
روایت شکن مجتہد ہو
کہ اب کانچ جیسے فرشتوں کی تقدیس
بے بہرہ ذہنوں کی چوکھٹ سے ٹکرا کے
ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی چلی جا رہی ہے
رفیقِ غمِ آدمیت!
تصنع کو چھوڑیں
تنوع کی پرچھائیاں رقص کرتی ہیں
آنکھوں کی سہمی ہوئی پتلیوں میں
کوئی خواب، کوئی خیالِ پریشاں
نہیں
اب نہیں
اپنی سمٹی ہوئی بند پلکوں کو وا کر کے دیکھیں
تلطف کا خورشید بھی جوفشاں ہے
اندھیرے سمٹتے چلے جا رہے ہیں

یہاں
چاک دامن رفو ہو رہے ہیں
کوئی
مشقِ بخیہ گری سے ہراساں نہیں ہے
کہ
افہام و تفہیم کی منزلیں سر ہوئی جا رہی ہیں
روایت کی
تقلید لازم نہیں ہے
مگر ان کی تقدیس
بے حد اہم ہے
جو معراجِ انسانیت چاہئے؟؟
تو پُراسرار یادوں کو نوچیں
دھند لکے سمیٹیں
ذرا
قبلہ رُو ہو کے سجدہ کریں
رحمتوں کے سمندر کو آواز دیں
اپنا دامن کشادہ کریں
آسمان منتظر ہیں
کہ
وعدہ ہے
نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ
☆☆

☆ ..........عبدالاحد ساز

# بخیہ گری کے مرحلے

لو، میں کیا کچھ بھول رہا ہوں
اک گردابِ فراموشی میں گھوم رہا ہوں
نِسیاں کے جھولے میں پیہم جھول رہا ہوں
ذہن کے پیچھے کچھ دُھندلے سائے لرزاں ہیں

بچپن بھی بیتا تھا، جوانی بھی گزری تھی
عمر کی سونی راہ گزر سے کوئی کہانی بھی گزری تھی
مکتب، دفتر، عشق، سمندر، گھر بستر کا ماضی جاری
کیا کچھ تھا، یا کچھ بھی نہیں تھا، اک آنِ واحد ہے طاری
میں، آوارۂ امشب دوش و فردا کا معمول رہا ہوں
بے ربطی میں کتنی ترتیبیں حیراں ہیں

صحرا میں اُٹھے تھے بگولے، بادِ صبا گلشن میں چلی تھی
سیدھا صاف سفر تھا پہلے، پھر دنیا اُلجھن میں چلی تھی
اک ساعت کی قید میں کتنی سمٹی پھیلی تاریخیں ہیں
اک سکتے کی گونج میں مضمر کتنے زمانوں کی چیخیں ہیں
میں اک لمحہ بے گانہ جو، قرنوں کا عرض و طول رہا ہوں
خاموشی کے زہر میں نشے کتنے سوالوں کے غلطاں ہیں

دنیا کیا ہے، عقبیٰ کیا ہے؟
ہونے اور نہ ہونے کا یہ قصّہ کیا ہے؟
یہ تمام سفر ہے یا آغازِ دگر ہے؟
روح کا آخر کون سا گھر ہے..........؟
قلب و جگر ہے؟ کاسۂ سَر ہے؟ حدِّ نظر ہے؟
......قبر کی دیواریں ہیں یا آفاق کا در ہے......؟
اپنی رگوں میں سمٹا میں اپنی سانسوں میں پھول رہا ہوں

لو، میں کیا کچھ بھول رہا ہوں
اک گردابِ فراموشی میں گھوم رہا ہوں
نِسیاں کے جھولے میں پیہم جھول رہا ہوں

☆☆

☆..........عبدالاحد ساز

## متبادل

جیون کی باتیں چھوڑو
پا نہ سکو گے
رنگ برنگی موتیں
سنسار سماج کے ہر بازار کی ہر دکان پہ ملتی ہیں

تم بھی کوئی
اچھی سی موت کو چن لو
ہنستے کھیلتے مرتے مرتے جی لو!

☆☆

## بے سیاق

اک اہم کڑی کھو جائے گی
اک دور حذف ہو جائے گا
ورنہ..........
اب تک جو کچھ سوچ سمجھ رکھا ہے
جلد از جلد اظہار کرو
اس سے پہلے کہ آگے کی تیز نکیلی سوچیں
ذہن کی سب پرتوں کو کھرچ دیں
اور نظر کو وقت کی ان تجریدی سمتوں میں الجھا دیں
جن میں گزشتہ منظر کی پہچان کٹھن ہوگی
تقریباً ناممکن ہوگی!

☆☆

☆.........عنبر بہرائچی

# سیر بین

(ا)

سرمئی اجالوں سے
دوب کے دوپٹوں کے خال وخد ابھرتے ہیں
جن کی سبز بانہوں میں،
فاختائیں اور خرگوش
بے خطر ہیں محوِرم
گل فشاں لطافت ہے
اک گھنیرا جھرمٹ ہے
دفعتاً نکلتی ہے
ایک جنگلی بلی
رنگ اور خوشبو کی شاہکار تحریریں
یک بہ یک سمٹتی ہیں
کرب ناک سناٹا
ہر طرف ہے خیمہ زن

(ب)

آبنوس پیکر میں
بجلیاں تھرکتی ہیں
گل ہتھیلیوں میں قید، موسموں کی شمشیریں
کھیت اور چھپر میں
ہن برستا رہتا ہے
لب پہ بول کجلی کے دل میں روپ گبھرو کا
دودھ سے بھری مٹکتی، ہم چاندنی پہ ہنستی ہے
چاہتوں کی پھلواری درد کو چڑاتی ہے
نیم کا گھنا سایہ زندگی لنڈھاتا ہے
آم کا ہر ایک پتہ بانسری بجاتا ہے
دھان اور گندم کی بالیوں کے سائے میں
جھونپڑے کا ہر بازو
مطمئن سے مدت سے

(پ)

نیل کنٹھ کا جوڑا
کرب ریز لمحوں میں، تازگی لٹاتا ہے
دھوپ کھلکھلاتی ہے سبز مرغ زاروں پر
بھوک سے بجھی آنکھیں
منظروں سے خالی ہیں
سوپ میں نہیں دانے
او کھلی بھی خالی ہو
جھیل میں پڑی بنسی
دکھ بھری پچھیرن کا درد بانٹ لیتی ہے

☆☆

☆............عنبر بہرائچی

# آتی جاتی رہیں

اور پھر آنسوؤں کی گھنی چھاؤں میں
کیسے کیسے مناظر ابھرتے رہے
ہم نے میزائیلوں اور سیارچوں کی نئی کھیپ تو خلق کر دی مگر
چھپروں کی بلکتی ہوئی زیست پر طائرانہ نظر ڈال کر چپ رہے
اک ضعیفہ ادھر آم کی گٹھلیاں پیس کر بھوک اپنی مٹاتی رہی
اک ننھا فرشتہ چراگاہ میں خشک گوبر سے دانے اٹھاتا رہا
ماں کے آنچل میں دانے وہی ڈال کر مسکراتے ہوئے رقص کرتا رہا
سبز کاغذ کے تیور پہ ماں باپ نے دل کے ٹکڑوں کو کیوں کر نچھاور کیا؟
سادگی ہر قدم ضرب کھاتی رہی
اور حساس آنکھوں سے ٹپکا لہو
مفلسی، اپنا چہرہ چھپاتی رہی
فلم میں یہ مناظر دکھاتے ہوئے پیکرِ جہل دھنوان بنتے رہے
روز و شب سسکیاں، حسبِ دستور، ان جھگیوں میں شرر پاش ہوتی رہیں
چاندنی، خوشبوئیں، گل بداماں رتیں
خامشی اوڑھ کر آتی جاتی رہیں

☆☆

☆............ڈاکٹر شبنم عشائی

# نظمیں

۞

میرے آقا
میں تمہارے
اور صرف تمہارے ذریعہ
زندہ رہتی
جو مجھے
میری شناخت کی خاطر
ہانکا نہ جاتا!
باقی میں تمہیں
میرا گلا گھوٹنے سے نہیں روکتی......
جانتی ہوں
یہی لمحے
تمہارے مرد ہونے کا
جواز ہیں............

۞

کالا سورج
پھر طلوع ہو رہا ہے
پھر ٹھوکر کھاؤں گی
چکنا چور ہو جاؤں گی!
موت اپنی پھانسی
اگر میرے گلے میں ڈالتی
میری خیر تھی......

۞

جب کبھی بھی
تم سے
الزام تراشی
چھوٹ جائے گی
اس پل
پچھتاؤ گے
اکیلے......

۞

خیال
تجربہ
دُکھ
خوشی
سب آواز اُتارتے ہیں
جب
اپنوں کے چہروں سے
اجنبی اُبھرتے ہیں

☆☆

☆............علی شیدؔا

# سانسوں کا اگلا موسم

موت کا گھر کوئی سرائے نہیں
کہ بس چلے آؤ
زندگی کا بوجھ اتار کر دروازے پہ دستک دینی پڑتی ہے
موت کو پانے کے لئے زندگی صرف کرنی پڑتی ہے
پائی پائی چکانا پڑتا ہے
قرض کا احسان............
زندگی سانسوں کو تھکا دینے کے درپے رہتی ہے
خزاں کی زردی رنگوں میں زنگ گھولتی رہتی ہے
تم شاخیں پتے اور ثمر تیاگ دیتے ہو
نئے موسم کی آرزو میں
آرزوئیں انتظار کو ہرا دیتی ہیں
جب تک نئے موسم کا انتظار بوڑھا ہو جاتا ہے
بڑھاپا آنکھوں میں اُترتے ہی
آہٹیں ٹوٹنے لگتی ہیں

بوجھ بھاری ہے
گھنگرو سہہ نہیں پاتے

سفر سمٹ جاتا ہے
نشان دھند میں کھونے لگتا ہے
ہارمونیم کی مدھرتا خاموشی کی منوں مٹّی تلے دب جاتی ہے
ہلکی ہلکی ہوائیں پرندوں کے پنکھوں میں ٹھہر جاتی ہیں
گھونسلے میں پڑے تنکوں کے اندر پرانی سانسوں کی عبارت دہک اُٹھتی ہے
دیواروں پہ پھیلا دھواں پگل کر ٹپکنے لگتا ہے
اشک کا نیا موسم بن کر............
گماں کی سرحدوں میں اک نئی دھرتی جنم لیتی ہے
تمہارا آدم مری حوا
ایک دوسرے کی باہوں میں
سمٹ کر کن فیکون کے ورد پہ ٹھہر جاتے ہیں
میں اپنے نئے گماں کی اور چل پڑا ہوں
زندگی میں تجھے سلام کرتا ہوں
تو نے مجھے مرنا سکھا دیا............!

☆☆

☆.........علی شیدا

# اجنبی خریدار

اک ہسپتال کے کسی کونے میں
ایک اجنبی ماں
اپنے بستر پہ اپنے ماضی کو تک رہی ہے
اجنبی ماں!

تیرے اور میرے درمیاں
کوئی جانی پہچانی صورت
جن کو سناتے تھے روز ہم اپنی داستاں
جو ہمیں پیار کی دہلیز پہ لے آئی تھی
آج بھی وہ پیغام سناتی ہے
تو کسی زمانے میں میری ہمدم رہی
یوں سمجھ لو کہ خوابوں کی صنم رہی
لیکن اب ہم دو بھی اجنبی بن بیٹھے
تم نے چاہا تو وقت کو للکارا
اور قدرت سے چھیننے کی کوشش میں
خود کو بھی گنوا بیٹھی
میں تو کیا تھا
ایک آندھی چلی اور لٹ گیا
تم میں ہمت ہے تو آنسو بہاتی رہو

میں تو ایک ریت کے میداں کی طرح سلگتا ہوں
تم اندھیروں میں دیئے لئے پھرتی ہو
میں تو بس کرتا ہوں نفرت کی تلاش
تیرے ہونٹوں پہ بھی کھلتی ہے عارضی ہنسی
میں نے وہ مصنوعی تتلی بھی جلا ڈالی ہے
تمہیں شاید گماں ہے کہ تم جیتو گی
وقت ہنستا ہے تیری اس نادانی پہ
میں نے توڑے ہیں اب تمام آئینے
جن میں چاہت کا عجیب دھوکا دکھتا تھا
اور وہ کرچیاں..........!
کوئی اجنبی خریدار آ کے لے گیا

☆☆

☆............مصداق اعظمی

# تیسری آنکھ

سرحدِ کبر پر نہ جانے کیوں
آمنے سامنے ہیں
ہم دونوں
چند لاغر وجود والوں کے
ہم نے لشکر کئے ہیں صف آرا
کتنی موتوں کے
ذمہ دار ہیں ہم
بے پناہوں سے کتنی راتوں کو
کاٹ کر
تھک چکے ہیں اندر سے
صبح صادق بھی ہم پہ
روتی ہے
شام بیوہ کی لُٹ سی لگتی ہے
آسماں گرد گرد ہے بالکل
دامنِ ابر سوکھا سوکھا ہے
خشک دھرتی کے ہونٹ
لگتے ہیں
ایسے آہ و بکا کے عالم میں
کوئی اک
جھگڑے کو
پشت در پشت
خون میں لت پت
دیکھنا چاہتا ہے صدیوں تک
اس کی ہمدردیوں میں فتنہ ہے
جو ہمارے جنوں کی آتش کو
تیز سے تیز تر بھی کرتی ہے
صلح کی ساری کوششیں اس کی
آگ میں گھی کا کام کرتی ہیں
ایسے عالم میں لوگ سنتے ہیں
اس کی ہتھیار بند سوچوں کی
خود سے کی جانے والی سرگوشی

☆☆

طویل نظم

☆............ارتکاز افضل

# رنگارنگ (سات مسلسل نظمیں)

﴿1﴾

محبت کے
ہزاروں رنگ دیکھے
ہزاروں ڈھنگ دیکھے
کبھی توسِ قزح کے سات رنگوں میں
سلونی سہ پہر کے ساتھ
رگ و پے میں
رنگارنگ مستی بن کے آتی ہے
من موہ لیتی ہے لبھاتی ہے
اور کبھی
صحرا کی لق و دق دوپہر میں
سایۂ ابرِ کرم بن کر
مسافت کی لگائی آگ پر
گھن گھن برستی ہے
آبلہ پا رہروانِ شوق کے
پاؤں دھوتی ہے

﴿2﴾

محبت کے ہزاروں رنگ دیکھے، ڈھنگ دیکھے
محبت موسمِ گل میں
نسیمِ صبح ہے کیا گدگداتی ہے
ہاتھ تھامے دوڑتی ہے
ننھی منی توتلی بھاشا میں اپنی
برگزیدہ پیڑ پودوں کو سارے
گیت ساون کے سکھاتی ہے
بزرگوں کو رلاتی
اور ہنساتی ہے
یہ روتے ہیں تو خود بھی روٹھ جاتی ہے
یہ ہنستے ہیں تو جی بھر
قہقہے خود بھی لگاتی ہے

﴿3﴾

محبت کے ہزاروں رنگ دیکھے، ڈھنگ دیکھے
محبت رات کا پچھلا پہر جو
دیس سے باہر
طلوعِ صبح تک
نت نئے پیکر بدلتا ہے
کبھی اک لمس ہے جو
گھر کی ہر شے میں بسا ہے
اور کبھی
رگ و پے میں دھڑکتا ہے

دوستوں کی اَن کہی اور
اَن سنی روداد ہے
گھُپ اندھیرے میں
دیا اک ٹمٹماتا ہے
نونہالانِ چمن سے
رات کے پچھلے پہر ہم کیا کہیں
دیدۂ نم دیکھنا
جوئے خوں ہے یا پھر ہے
شمعِ فروزاں سوچنا

﴿4﴾

محبت کے ہزاروں رنگ دیکھے، ڈھنگ دیکھے
محبت چیختے چنگھاڑتے
دریا کی طغیانی
اندھیری رات کی آندھی
بگولوں کی بلاخیزی
محبت،
بال کھولے جیسے اک ڈائن
ازل کی بھوک
رانوں میں دبائے
قریہ قریہ گھومتی ہے
نوجوانوں کو لبھاتی ہے
جسم وجاں میں آگ بھر کر
خون کے آنسو رلاتی ہے
درد کے مارے
کلیجہ منہ کو آجائے
تو دل پرواز کرتی ہے

﴿5﴾

محبت کے ہزاروں رنگ دیکھے، ڈھنگ دیکھے
محبت لہلہاتے کھیت میں
کچی فصلوں کی مہک
مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو
دانہ دُنکا چگنے والے
ننھّے منّے پنچھیوں کے چہچہے
تمازت دھوپ کی سہتے ہوئے
خوشوں کے بال و پر
محبت ابتدا سے آفرینش تک
صبح کا پہلا پہر
محبت ڈوبتے سورج کی ٹھنڈک
چاندنی راتوں میں جیسے
چاندکی
چارسو پھیلی ہوئی رونق
محبت خود فراموشی کا اک عرصہ
کہ جیسے لمبے لمبے ان درختوں کے
گھنے سائے، گھنے سایوں سے ہم آغوش ہوں
بساطِ زندگانی کیا ہے، گویا
پھول، خوشبو، چاندنی، مہکی ہوا

﴿6﴾

محبت کے ہزاروں رنگ دیکھے، ڈھنگ دیکھے

محبت دیدنی ہے
دیدۂ حیرت کی حیرت دیکھنا
دیکھنا جواب تلک دیکھا نہیں تھا
اور جو دیکھا تھا وہ بھی
از سرِ نو دیکھنا
رات کا پچھلا پہر ہو
یا کہ پھر
صبحِ کاذب کا،
منہ زور سناٹا
محبت وجہِ گویائی وقفِ سکوت
حاضر بھی، وہ ناظر بھی وہ
طلوعِ صبح تک
مونس بھی، وہ غمخوار بھی
دولتِ بیدار بھی

**7**

محبت کے ہزاروں رنگ دیکھے، ڈھنگ دیکھے
سنا ہوگا کبھی ممکن ہے لیکن
کبھی دیکھا نہیں تھا
راستہ چلتے اچانک
اجنبی کوئی
کسی کا ہاتھ تھامے
منزلیں تنہائیوں کی
پار کرنے کا صلہ دے
لمس کا کوندا ذرا سا
آس کی ہلکی لپک
اور پھر ہر سو
گھپ اندھیرا
روشنی کے سائبانوں میں
چند گھڑیاں کیا گزاریں
اندھیروں نے خون بہا مانگا
اور ناکردہ گناہوں کی
چھوٹی چھوٹی ساری تفصیلات
اس قرینے سے سجائیں
نیکیاں سب دنگ ہیں
آیئے چل کر سرِ بازار ہم
خلقِ خدا کے سامنے اپنا
اشکوں سے تر دامن پساریں
سرِ تسلیم خم ہے، صاف کہہ دیں
جو مزاجِ یار میں آئے

☆☆

# فکرِ فردا

☆............محتشم احتشام

✿

ہوس کے دور میں جب رسمِ عاشقی نہ رہی
دلوں میں بغض رہا بندہ پروری نہ رہی
جدیدیت نے تو آسانیاں بہت دی ہیں
مگر حیاتِ بشر میں وہ دلکشی نہ رہی
ہیں آج مسجدیں آباد بھی تو کیا حاصل
سجود تو ہیں مگر روحِ بندگی نہ رہی
اگرچہ گل ہیں بہت گلستانِ ہستی میں
وہ دلکشی نہ رہی اب وہ تازگی نہ رہی
ہوئی ہے ہم پہ مسلط جو مغربی تہذیب
حیا سے دور ہوئے، ہم میں سادگی نہ رہی
ہے نورِ کرب وبلا چارسو میں کیسے کہوں
''پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی''
یہ بات تلخ سہی محتشم مگر سچ ہے
جہاں میں صدق وصفا، صلح وآشتی نہ رہی

☆☆

✿

جہاں میں کٹتے ہوئے سروں کو شمار کر کے
میں جی رہا ہوں سبھی ستم در کنار کر کے
حساب دینا پڑے گا، اک دن انھیں یقیناً
جو خوش ہیں اوروں کی آبرو تار تار کر کے
وہ بات تمہارے دیدار میں نہ ہوگی
جو لطف پا تا رہا ہوں، میں انتظار کر کے
مجھے یقیں تھا، وہ اپنا وعدہ وفا کرے گا
جو جاتے جاتے، مجھے گیا شرمسار کر کے
میرے خدایا ہمیں تو ہی راستہ دِکھا دے
کہ تھک گئے ہم حسابِ لیل ونہار کر کے
میں مانتا ہوں مجھے وفا کی سزا ملے گی
میں جانتا ہوں کہ روؤں گا اعتبار کر کے

☆☆

## ☆.............محتشم احتشام

✿

اگرچہ راہ طولانی بہت ہے
سفر الفت کا نورانی بہت ہے
سہارا ہے مجھے کچے گھڑے کا
جو اس دریا میں طغیانی بہت ہے
خوشی سے میں جو لٹتا جا رہا ہوں
لٹیروں کو پریشانی بہت ہے
وہ اب ہر بات میری کاٹتا ہے
وہی جس نے میری مانی بہت ہے
چمک چہرے پہ سب کے دِکھ رہی ہے
مگر سینوں میں ویرانی بہت ہے
بہاؤں گا تیرے غم میں مسلسل
کہ آنکھوں میں مری پانی بہت ہے
غریبی میں محتشم مطمئن ہوں
جہاں والوں کو حیرانی بہت ہے

☆☆

✿

عمر مشتِ غبار لگتی ہے
موت با اختیار لگتی ہے
حرص آلود بندگی واعظ
بوجھ لگتی ہے، بار لگتی ہے
مجھ کو محلوں کے شہر میں اپنی
جھونپڑی شاندار لگتی ہے
ہم فقیروں کی تنگدستی بھی
کتنی سرمایہ دار لگتی ہے
محتشم مختصر کہ یہ دنیا
حسرتوں کا مزار لگتی ہے

☆☆

☆............محتشم احتشام

❁

کوئی شعلہ ،کوئی شبنم ،کوئی پتھر ہوگا
زندگی میں یہ تماشہ تو برابر ہوگا
اپنی پہچان اسے پہلے گنوانی ہوگی
پھر کہیں جاکے یہ قطرہ بھی سمندر ہوگا
آئینہ جس کیلئے خود کو کیا تھا میں نے
کب یہ سوچا تھا لئے ہاتھ میں پتھر ہوگا
بعد میرے ،میرا احساس رلائے گا اسے
میں نہ ہوں گا تو میری یاد کا لشکر ہوگا
ایک امید پہ بس عمر گزاری میں نے
وقت جو آنا ہے وہ آج سے بہتر ہوگا
ان کو منسوب تو کر ایک مقدس غم سے
محتشمؔ اشک کا ہر قطرہ گلِ تر ہوگا

☆☆

❁

مانا کہ ہمیں تم سا تو دلبر نہ ملے گا
تم کو بھی تو ہم سے کوئی بہتر نہ ملے گا
اے خانہ بدوشی مجھے پردیس ہی لے چل
اب شہر میں رہنے کو کوئی گھر نہ ملے گا
ہے وقت سنبھلنے کا سنبھل جاؤ ابھی سے
سر پھوڑنے کو پھر کوئی پتھر نہ ملے گا
جا کر کوئی سرکش سے کہے چاہا جو رب نے
اترا رہا ہے جس پہ وہ لشکر نہ ملے گا
کہنے کو تو دنیا میں بہت ہوں گے محتشمؔ
تم جیسا کوئی اور سخنور نہ ملے گا

☆☆

آپ بیتی

☆..........خالد بشیر احمد

# اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

میری زندگی میں حیرت انگیز اور پر از فسوں واقعات بدرجہ قلیل تر بھی موجود نہیں ہیں۔ کبھی ایسا کوئی کارنامہ سرزد نہیں ہو سکا جس پر فخر سے سینہ پھولتا۔ ساری زندگی ست رفتار سے مگر اپنی شرطوں پر گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ کبھی کچھ عجلت میں کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ اپنی مختصر سی دنیا میں مگن ہوں، جس میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں مسرت فراہم کرتی ہیں اور ذرا ذرا سے مسائل پریشان کرتے ہیں۔ پیدائش سرینگر شہر کے معروف علاقہ سونہ وار میں ہوئی۔ اس دن کشمیر نے دبیز سفید چادر اوڑھ لی تھی۔ گھر کے بڑوں کے مطابق غضب کی سردی تھی اور برف گھٹنوں اونچی جمع ہو کر جم گئی تھی۔ پانی کے نلوں کے ساتھ ساتھ سارا ماحول منجمد تھا۔ ایسے میں گھر میں پانی موجود نہیں تھا جو جمی ہوئی برف آگ پر پگھلا کر میسر کیا گیا۔ اسی پانی سے مجھے پہلی بار نہلایا گیا۔

میرے آبا و اجداد سونہ وار میں ہی آباد کشمیری الاصل تھے، جو میری پیدائش سے کئی نسلیں قبل مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ والد صاحب محکمۂ کسٹم میں ملازم تھے۔ چار بھائیوں اور دو بہنوں پر مشتمل ہم والدین کی چھ اولادیں تھیں جن میں سب سے بڑی ہمشیرہ اور سب سے چھوٹا میں ہوں۔ سب سے بڑے بھائی محمد شفیع صاحب ڈاکٹر ہیں اور مدینہ منورہ (سعودی عرب) میں ڈیڑھ دہائی تک نوکری کر کے اب فراغت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دوسرے برادر غلام محی الدین صاحب کا انتقال فروری ۲۰۰۸ء میں ہوا۔ ان کے بعد دوسری ہمشیرہ ہیں۔ تیسرے برادر ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ جیالوجی اینڈ جیوفزیکس کے پروفیسر اور سربراہ کی حیثیت

سے فروری ۲۰۱۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ وہ طبقات الارض کے مقتدر سائنسدان ہیں۔

تعلیمی ریکارڈ کے مطابق میری پیدائش 20 فروری 1954ء کو ہوئی ہے۔ ان دونوں فروری کے مہینہ میں شدید سردی اور برفباری کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔۔ اگر برفباری شام کو شروع ہوتی تو صبح تک برف کی کئی فٹ اونچی تہہ جمع ہو جاتی اور بازار سے ناشتے کی روٹی لانے کے لئے پہلے برف ہٹا کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ اس طرح جو تنگ راستہ بن جاتا تھا اس کے دونوں طرف برف کے پہاڑ جمع ہو جاتے جو اکثر سات آٹھ سال کے بچے کے قد سے بلند ہوتے۔ برف کے ساتھ پیدائشی قربت کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مجھے گرتے ہوئے برف کے گولے اور گھٹنوں تک اونچی برف کیوں پسند ہے۔ بچپن میں برف سے کھیلنا محبوب مشغلہ تھا۔ صاف و شفاف سفید برف کی موٹی تہہ پر چل کر اپنے جوتوں کے نشان چھوڑنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پاؤں کے نیچے دبنے والی برف کی چرمراتی آواز طربیہ سنگیت سے زیادہ مزہ دیتی۔ ایسا ہی مزہ موسم خزاں میں گرے ہوئے چنار کے سرخی مائل پتوں پر چلنے میں آتا۔ ہم عمر بچوں کے ساتھ برف کے انسان بنانا بھی بے حد اچھا لگتا تھا گو کہ اس کھیل میں انگلیوں کے پورسن ہو جاتے۔

جب میری سرکاری ملازمت کی ابتدا ہوئی تو برفباری کے دوران اکثر امیرا کدل میں واقع اپنے دفتر سے دریائے جہلم کے کنارے کنارے پیدل چل کر گھر جاتا اور چھتری کے بغیر گرتی ہوئی برف کا مزہ لیتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے اردو کے نامور شاعر مظہر امام، جو ان دونوں دوردرشن کی ملازمت کے سلسلے میں سرینگر میں مقیم تھے، کو اچانک رک کر اپنے ساتھی سے کہتے سنا کہ "دنیا میں برفباری کا ایسا خوبصورت منظر کہیں نہیں دیکھا ہے۔" آج بھی جب برف گرتی ہے تو میں اس کا مزہ لینے کے لئے کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور اگر گھر سے باہر ہوں تو میرے دوست برف کے ساتھ میرے وارفتگی کو دیکھتے ہوئے ٹیلی فون کے ذریعے برفباری کی نوید دیتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ کہ برف کے ساتھ اس وارفتگی کے باوجود میری شاعری میں شاید اس ایک شعر کے سوا برف کہیں بھی موجود نہیں۔

کہہ دے ورنہ لب پر بول اٹک جائیں گے
بھاری برف میں گھر، آنگن سب ڈھک جائیں گے

بچپن کی یادوں میں جو بات اب تک ذہن میں تازہ ہے، وہ بڑی بے فکری کے دن تھے۔ ایسا معاملہ شاید سب کے ساتھ ہوتا ہوگا، لیکن میں آج بھی وہ دن جینا چاہتا ہوں اور کئی بار تصوّر میں ایک ایسی کیفیت سے گزرتا ہوں جس میں اُن دنوں کے مناظر اور آوازیں دکھائی اور سنائی دیتی ہیں۔ سونہ وار میں جہاں ہم رہتے تھے، وہ دریائے جہلم اور شاہراہ کے درمیان واقع ایک چھوٹا سا محلّہ ہے جس کی انفرادیت اس بات میں تھی کہ وہاں سب گھر ایک ہی بڑے خاندان کی منقسم اور پھیلی ہوئی اکائیاں تھے۔ یوں جو ہمارے ہمسایے تھے، وہی رشتہ دار بھی تھے۔ اس ماحول میں جن بچوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھیلنا، کودنا تھا، وہ سب میرے کزن تھے۔

والد صاحب کا نام محمد احسن بٹ تھا جو ہر اچھے والد کی طرح بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ علاقہ کے اصحابِ عزت وتوقیر میں تھے۔ شرافت اور دیانت ان کا خاصہ تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ وہ جب بھی محلّہ یا بازار سے نکلتے تو لوگ ان کی تعظیم کرتے۔ گھر کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور اس پر چھ اولادوں کو پالنا پوسنا اور تعلیم دلانا، دو دو بیٹیوں کی شادی کرنا، نیا مکان تعمیر کرنا اور بڑے بیٹے کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانا واقعی کارے دارد والا معاملہ تھا لیکن انہوں نے اپنے جیتے جی یہ ذمہ داری اپنے اسم گرامی کی طرح احسن طریقے سے نبھائی۔ اس کار سخت میں انہیں قرض بھی لینا پڑا اور پشتینی زمین بیچنے کا دل شکن فیصلہ بھی کرنا پڑا۔ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں والدین کا چہیتا تھا۔ 7 جولائی 1969ء کو جب میں نے نویں جماعت کا امتحان پاس کر کے دسویں میں داخلہ لیا ہی تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ان کے سنگ مزار پر اس نسبت سے علامہ اقبال کا یہ شعر کندہ ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم　　چوں مرگ آید تبسم بر لب اُوست

والد صاحب کے انتقال سے قبل بڑے بھائی صاحب ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹر کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہو گئے تھے اور عمر میں ان سے چھوٹے بھائی صاحب غلام محی الدین بھی محکمہ میکینکل اینڈ اسٹورز میں ایک نچلی اسامی پر تعینات تھے۔

والدہ محترمہ ایک باہمت، غیرت منداور ہٹ کی پکی خاتون تھیں۔ وہ ان پڑھ تھیں لیکن معاملات کو سمجھنے اور سلجھانے میں ان کی ذہانت کا جواب نہیں تھا۔ محلے کی اکثر خواتین ان سے کئی

معاملات میں مشورہ لیتیں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد انہوں نے گھر کو سنبھالا۔ صحت کے معاملے میں وہ دھان پان سی خاتون اور بلڈ پریشر کی دائمی مریضہ تھیں۔ ان کی صحت اکثر خراب رہتی لیکن انہوں نے خرابی صحت کو کبھی بھی اپنے اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا۔ زندگی کے آخری ایام تک کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور گھر کی صاف صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ میں اپنی والدہ کے بہت قریب رہا اور اس وجہ سے ان کی عنایت اور محبت کو بطور خاص بٹورتا رہا۔ بڑے بھائی صاحب نوکری کے سلسلے میں گھر سے باہر ہی رہے اور دوسرے بھائی صاحب علی گڑھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد دہرہ دون کے انسٹیٹیوٹ آف ہمالین جیالوجی میں بطور سائنسدان تعینات ہو کر وہیں منتقل ہوئے۔ ہمشیرہ کی شادی والد صاحب کی حیات میں ہی ہوئی تھی۔ اس طرح برادر محمد اسمٰعیل بھی دہرہ دون سے منتقل ہو کر کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر اور شعبۂ جیالوجی اینڈ جیوفزیکس کے سربراہ کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ میں جب بھی بیمار رہا یا پریشان ہوتا تو والدہ محترمہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا۔ ایسے میں وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتیں جس سے سارے درد اور پریشانیاں دور ہوتیں۔ ایسا ان کی زندگی کے آخری ایام تک رہا۔

دنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں
ان کے دست شفقت گویا ایک دعا ہوتے ہیں
جن کے لمس سے سارے درد ہوا ہوتے ہیں
اولادوں کے حق میں سچی ہوتی ہیں
دنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں

عمر کے آخری برسوں میں والدہ محترمہ عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئیں جو بالآخر 8 نومبر 2003ء کو ان کی جان لے بیٹھا۔ آخر چند مہینوں میں جب وہ بسترِ مرگ پر تھیں، میں تقریباً ہر لمحہ ان کے ساتھ رہا۔ ان کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر پا رہا تھا اور اکثر اللہ سے دعا کرتا کہ ہم دونوں کا اختتام بالخیر ایک ساتھ ہوتا کہ ایک کو دوسرے کی جدائی کا غم برداشت نہ کرنا پڑے۔ مگر اللہ کے فیصلوں کے آگے کس کی چلتی ہے؟ والدہ محترمہ کا انتقال میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس سانحہ نے اچانک جیسے مجھے بے سہارا اور تنہا کر دیا۔ اگر چہ وہ مجھ سے بہت خوش تھیں لیکن

شادی نہ کر کے میں نے انہیں بڑی ذہنی تکلیف پہنچائی تھی جس کا ذکر وہ اگر چہ مجھ سے نہیں کرتیں لیکن ان کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔ میرے دوستوں سے البتہ وہ اس دکھ کا اظہار کرتیں۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

گھر کا ماحول سخت نظم وضبط والا تھا۔ اگر چہ والد صاحب اپنے شانت سوبھاو کی وجہ سے بچوں پر غصہ نہیں کرتے تھے تاہم بڑے بھائی صاحب چھوٹی سی چھوٹی غلطی پر بھی نہ صرف جھاڑ پلاتے بلکہ مار پیٹ بھی کرتے تھے۔ دو واقعات کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ بچپن میں ایک دن شام سے پہلے میں محلّہ کے دیگر بچوں کے ساتھ گھر سے لگتی ہوئی شاہراہ کے پار کھلے میدان، جسے لولی باغ کہتے تھے اور جو بعد میں بھارتیہ فوج نے اپنی تحویل میں لیا، میں کھیل رہا تھا۔ اچانک بادل زور کی گرج کے ساتھ پھٹ گئے۔ ہم سب گھبرا گئے۔ سارے بچے گھر لوٹے لیکن اس شام جو میری پٹائی ہوئی وہ آج تک حافظے میں محفوظ ہے۔ بھائی صاحب نے بڑی فراخدلی سے ہاتھ چلایا اور بچھو بوٹی سے میری پٹائی کی۔ اس شام امرناتھ یاترا کی چھڑی روانہ ہونے والی تھی اور سارا سونہ وار یہ منظر دیکھنے کے لیے شاہراہ پر امڈ آیا تھا۔ میں بدن پر مٹی کا لیپ لگا کر گھر کے برآمدے میں درد سہلا رہا تھا۔ ایسے ہی نوجوانی کے ایام میں ایک مرتبہ میں گھر کے باہر شاہراہ کے کنارے کھڑا تھا کہ مجھے بھائی صاحب بس سے اترتے ہوئے دکھائی دئے۔ چنانچہ میں جلدی سے بھاگ کر گھر پہنچا۔ اس پر بھی زبردست پٹائی ہوئی اور وجہ ان کے اس سوال میں موجود تھی کہ تمہیں کیا لگا میں نے تمہیں سڑک پر نہیں دیکھا تھا؟ ایسے ماحول میں آوارہ گردی یا خرمستی، جو عام طور پر بچوں اور نوجوانوں کا معمول ہے، کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ سختی فائدہ مند رہی۔ میں کم وبیش کتابی کیڑا بن گیا اور اوّل جماعت سے لے کر ایم اے تک میں نے ہر امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا گھر کا ماحول نظم وضبط اور نگرانی والا تھا جہاں حصولِ علم کے علاوہ کسی اور سرگرمی کی گنجائش بہت کم تھی۔ سنیما بینی اور سگریٹ نوشی شجر ممنوعہ تھے۔ سگریٹ نوشی نہ صرف یہ کہ میں نے کبھی نہیں کی بلکہ اسے نفرت کی حد تک ناپسند کرتا ہوں۔ مجھے سگریٹ کے دھوئیں سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔ سولہ سال کی عمر تک میں نے سینما کا دروازہ نہیں دیکھا تھا۔

ہائی اسکول باد امی باغ بٹہ وارہ میں واقع تھا۔ گھر اور اسکول کے درمیان براڈوے سنیما واقع تھا لیکن اسکول جاتے ہوئے یا واپسی پر میں کبھی بھی سڑک کے اس طرف نہیں چلتا تھا جہاں سنیما موجود تھا اور ارادتاً کبھی اس طرف نہیں دیکھا۔ پہلی فلم میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد دیکھی۔ یہ جیمس بانڈ سیریز کی انگریزی فلم you only live twice تھی جس میں مشہور اداکار شان کانری نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ میرے لیے داخلے کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے بٹہ وارہ کے میرے ایک ہم جماعت بشیر احمد کو پولیس والوں کے ڈنڈے کھانے پڑے جس سے ان کے چہرے سے خون بھی نکل آیا۔ موصوف نے میرے لیے یہ سزا خوشی خوشی سہہ لی۔ معلوم نہیں آجکل وہ کہاں ہیں۔ بہر حال جہاں بھی ہوں اللہ انہیں خوش رکھے کہ میرے لئے انہوں نے اپنا خون بہایا ہے۔ یہاں یہ اعتراف کرنا مناسب ہوگا فلم دیکھ کر میرے پلے کچھ نہیں پڑا جبکہ سنیما ہال میں موجود اکثر ظاہراً ان پڑھ لوگ فلم کے ہر مکالمے کا بھر پور لطف لے رہے تھے۔ اس سے قبل بچپن میں جب بھائی محمد اسمعیل صاحب نے فلم ''ماں کے آنسوں'' دیکھی تھی تو انہوں نے فلم کی کہانی سنائی جس میں ایک سین اس طرح کا تھا کہ ایک کردار دوسرے کردار سے اپنا پیسہ وصول کرنے کے لیے ایک سال بعد اس کے پاس جاتا ہے۔ ایک لمبے عرصہ تک میں اس شش و پنج میں تھا کہ بھائی صاحب تو تین گھنٹوں میں ہی فلم دیکھ کر واپس آگئے تو اس دوران ایک سال کیسے گزر گیا۔ میرے کزن نیاز احمد خوب فلمیں دیکھتے تھے اور ہر نئی فلم دیکھ کر اس کی کہانی اور مکالمے ایک ہفتے تک چٹخارے لے لے کے سناتے تا ایں کہ دوسری فلم دیکھ کر نہ آتے جس کے بعد سلسلہ پھر شروع ہوتا۔ میرے ہم عمر کزن میں محمد رفیع نے سب سے پہلے فلمیں دیکھنی شروع کی۔ ان کے ماموں زاد بھائی فاروق احمد پرانے شہر میں واقع اپنے گھر سے ہر جمعہ کو فلم دیکھنے سونہ وار آتے اور انہیں ساتھ لے کر سنیما جاتے۔ ان دنوں براڈوے سنیما نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ اکثر فلم بین سڑک کے کنارے کھڑے لوگوں سے پوچھتے براڈوے کو کونسا راستہ جاتا ہے؟ نہ جانے مجھے کیوں یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگ اس طرح جوق در جوق سنیما دیکھنے آتے ہیں۔ میں اگلی بار پوچھنے والے کو غلط راستے پر ڈالنے کی سوچتا لیکن ہر مرتبہ صحیح راستہ ہی بتا دیتا۔ خود میں نے کالج میں پڑھائی کے دوران ہی فلمیں دیکھنی شروع کیں جس میں محمد رفیع ہمیشہ ساتھ ہوتے۔ دراصل ہمارے ایک مشترکہ دوست اور ہم جماعتی

عبدالسلام، جن کا ہاتھ کشادہ تھا، ہمیں فلمیں دکھانے لے جاتے اور ساتھ ہی سٹیفڈ پف کے ساتھ چائے بھی پلاتے۔ ان دنوں میں نے ان تمام فلموں کی فہرست تیار کی تھی جو میں نے دیکھی تھیں۔ یونیورسٹی اور ملازمت کے ابتدائی برسوں میں یہ شوق باقی رہا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس میں کمی آگئی اور آج کئی برس ہوئے ہیں کوئی فلم دیکھے ہوئے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ آخری مرتبہ سنیما کب گیا تھا۔ ایسی ایک فلم ہے جو میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ یعنی چار دفعہ دیکھی ہے اور وہ ہے ''امراؤ جان''۔

اسکول میں داخلے کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ اکثر بچوں کی طرح میں نے بھی پہلے پہل اسکول جانے میں آنا کانی کی۔ گھر والوں کی کوششیں رنگ لاتے ہوئے نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ ایک دن والد صاحب نے تنگ آکر ایک چھڑی اور مٹی کا ایک برتن میرے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ اگر اسکول نہیں جانا ہے تو یہ پکڑ و اور جا کر مویشی چراؤ۔ اس ایک جملے نے صورت حال ہی بدل دی اور مجھے اتنا جھنجھوڑ دیا کہ میں اسکول جانے پر راضی ہو گیا۔ ہمشیرائیں کہتی ہیں کہ والد صاحب کے اس طنزیہ جملے نے میرے حساس ذہن پر کچوکے لگا دئے۔ آج تک یہ حساس طبیعت میرا سرمایہ بھی ہے اور کمزوری بھی۔ اسکول میں داخلہ کے لیے چچا کے ساتھ بھیجا گیا۔ ان کے فرزند جو عمر میں مجھ سے ایک دو سال بڑے ہیں، بھی اپنے داخلہ کے لیے ساتھ تھے۔ مجھے چھوٹا اوّل میں جبکہ اسے بڑا اوّل میں داخل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں بچوں کو پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کیا جاتا تھا۔ اسکول ریکارڈ میں دونوں کے ایام پیدائش میں صرف ایک ماہ کا فرق رکھا گیا۔ میں اساتذہ کا پسندیدہ طالب علم تھا اور کئی اساتذہ کے ساتھ مجھے بھی عقیدت کی حد تک محبت تھی۔ ان میں سب سے پہلے نمبر پر ہیڈ ماسٹر غلام حسن گیلانی صاحب تھے، جنہوں نے پورے علاقے میں ایک اساطیری کردار کا درجہ حاصل کیا تھا۔ وہ اساتذہ کے لیے ایک بہترین نمونہ تھے اور انہیں صدر ہند نے حسن کارکردگی پر انعام سے بھی نوازا تھا۔ ان کا دبدبہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔ سارا علاقہ انہیں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ سالانہ رزلٹ کے دن وہ اسکول کے آنگن میں وقفے وقفے سے پانی پی کر انفرادی طور پر ہر جماعت کے ایک ایک بچے کا رزلٹ پڑھ کر خود سناتے۔ اس دن سارا علاقہ اسکول میں اُمڈ آتا۔ اگر چہ میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا لیکن رزلٹ کے دن جیسے دل

کی دھڑکنیں رک ہی جاتیں۔ان کا رزلٹ سنانے کا انداز نرالا تھا۔

بڑے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ گورنمنٹ لوور ہائی اسکول سونہ وار پہلے گیلانیہ مڈل اسکول کے نام سے ایک پرائیوٹ اسکول تھا جہاں انہی ہیڈ ماسٹر صاحب کی وجہ سے تعلیم کا معیار اتنا بلند تھا کہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے بچے مشنری اسکولوں کے بچوں کے ساتھ انگریزی زبان میں ڈراموں کے مقابلوں میں حصہ لیتے اور اعزاز حاصل کرتے۔اسکول میں ایک بلیک بورڈ تھا جس پر مڈل کا امتحان، جو ان دنوں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی طرف سے لیا جاتا تھا، میں امتیاز کے ساتھ پاس کرنے والے طلباء کے نام درج تھے۔ان میں بھائی صاحب کا نام بھی تھا۔جب میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھا تو ہیڈ ماسٹر صاحب کا پانپور کے اسکول میں تبادلہ کردیا گیا جس پر سونہ وار، درگجن، گگری بل، بٹہ وارہ اور شیو پورہ کے لوگوں نے احتجاج کیا اور ایک بہت بڑا جلوس نکال کر اس وقت کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کی رہائش گاہ واقع گگری بل گئے اور تبادلہ کے حکم کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔بدقسمتی سے صادق صاحب کو ہیڈ ماسٹر صاحب کی یہ مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے نخوت سے کہا کہ جو طلباء ان سے پڑھنا چاہتے ہیں وہ اس اسکول میں داخلہ لیں جہاں ان کا تبادلہ ہوا ہے۔اس دن سارے علاقے پر مایوسی چھائی رہی۔

اسکول میں میرے پسندیدہ اساتذہ میں غلام احمد راتھر صاحب، عادل بشیر صاحب، غلام سرور صاحب اور سید صاحب تھے۔ماسٹر غلام محمد صاحب اور رفیق علی صاحب غلطی پکڑنے پر طلباء کی خوب مرمت کرتے اور اکثر بچے ان کے تبادلے کی دعائیں کرتے۔ماسٹر مکھن لال جی کلاس میں بچوں سے کہتے کہ آنکھیں بند کرو اور خواب دیکھ کر بتاؤ کہ کیا دیکھا۔یہ کہہ کر وہ خود کرسی پر بیٹھے سو جاتے۔جب کلاس ختم ہونے کو آتا تو وہ آنکھیں موندتے ہوئے جاگ جاتے اور ہر بچے سے پوچھتے بتاؤ کیا خواب دیکھا؟ بچارے بچے جاگتے کیا خواب دیکھتے مگر ماسٹر جی کے سوال کا جواب تو دینا ہی ہوتا تھا۔چنانچہ بچے سانپ، گھوڑا وغیرہ دیکھنے کا سوانگ بھرتے اور ماسٹر جی کا پیریڈ ختم ہوتا۔ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں کلاس میں سوتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا اور خوب کھری کھری سنائی۔ہائی اسکول بادامی باغ میں ہیڈ ماسٹر غلام علی شہید سلمانی صاحب، علی خان صاحب، اشوک کمار جی اور عبدالغنی مسعودی میرے پسندیدہ اساتذہ تھے۔عادل بشیر صاحب آٹھویں

جماعت میں میرے فارم ماسٹر تھے۔ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مارکس کارڈ آج بھی میری متاع عزیز ہے جس میں انہوں نے میرے بارے میں لکھا تھا ''the boy is a shining star'' شہید سلمانی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ رقعہ بھی میرے پاس قیمتی اثاثہ کی صورت میں محفوظ ہے جس میں انہوں نے میٹرک کے میرے مارکس کارڈ میں انگریزی زبان میں ۱۵۰ نمبرات میں سے صرف ۸۸ نمبرات دیکھ کر بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے سیکریڑی سے میرے نمبرات دوبارہ چیک کرانے کی گزارش کی تھی۔ان کے لکھے ہوئے یہ الفاظ میرے لیے کسی بڑے انعام واکرام سے کم نہ تھے۔ He is no case deserves 88 marks only in english as he is the best boy of the school مارکس کارڈ میں اگر چہ مجموعی نمبرات برابر ۵۵۳ درج تھے لیکن انفرادی مضامین کے مارکس جمع کر کے نمبرات کا حاصل کم آتا تھا۔میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی چٹھی لے کر سائیکل پر سوار بورڈ کے دفتر واقع لال منڈی گیا جہاں سیکریڑی ،جن کا نام غالباً یوسف صاحب تھا، نے متعلقہ ملازم کو طلب کر کے فوری جانچ کرنے کا حکم صادر کیا۔پتہ چلا کہ انگریزی کے مضمون میں ۱۲۶ نمبرات کے بجائے غلطی سے میرے مارکس کارڈ میں صرف ۸۸ نمبرات درج کئے گئے تھے جو دراصل میرے ہی ہم جماعت کے اس مضمون میں حاصل کردہ نمبرات تھے۔

میرے کزن محمد رفیع اسکول اور کالج میں میرے ہم جماعت تھے۔ہم دونوں اکھٹے اسکول جاتے اگر چہ یہ مرحلہ میرے لیے ہمیشہ صبر آزما ہوتا۔میں ہر صبح وقت پر تیار ہو کر، وردی پہن کر اور کتابوں کا بستہ کمر میں لٹکائے ان کے گھر جاتا لیکن ہر بار پتہ چلتا کہ وہ ابھی تیار ہی نہیں ہوئے ہیں۔تیار ہونے میں انہیں کافی وقت لگتا اور بالآخر جب ان کی اماں انہیں تیار کرتی ،غسل خانے میں دیوار میں لگے آئینے میں دیکھ کر پانی سے بالوں کو سنوارنے میں اچھا خاصا وقت صرف کرتے۔میری حالت پطرس بخاری کے مشہور مزاحیہ انشائیہ ''سنیما کا عشق'' کے میر صاحب ایسی ہوتی جو ہر جمعرات کو فلم دیکھنے کی غرض سے اپنے دوست میرزا صاحب کے گھر جاتے اور بڑے جتن کے بعد انہیں ساتھ لے کر جب سنیما کی طرف نکلتے تو راستے میں ہر چار قدم پر میرزا صاحب رک رک کر لوگوں سے حال احوال پوچھتے اور میر صاحب فلم کا وقت نکلتے ہوئے دیکھ کر ہر بار قسم کھاتے کہ اگلی مرتبہ اکیلے سنیما دیکھنے جائیں گے۔اگلی صبح میں بھی پھر اسی مرحلے سے گزرنے کے

لیے اپنے کزن کے گھر جاتا۔اسکول میں داخلے کے ابتدائی دنوں میں اپنی جماعت کے بجائے برادر محمد اسماعیل جو مجھ سے دو تین جماعتیں آگے تھے ،کی جماعت میں بیٹھتا تھا۔ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے وہاں پا کر ٹوکتے ہوئے بھائی صاحب سے پوچھا اس سہروردی کو کہاں سے لائے ہو؟ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھے سہروردی کیوں کہا۔ میں نے واسکٹ پہنا تھا شاید اس وجہ سے انہوں نے مذاق کیا۔ان دنوں پاکستان کے وزیر اعظم حسن شہید سہروردی تھے۔اس سرزنش کے اگلے روز سے میں اپنی کلاس میں بیٹھنے لگا۔

میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں اور اسکول میں اوّل آ کر پاس کرنے کے بعد میں نے وادی کے قدیم ترین کالج ''ایس پی کالج'' میں داخلہ لیا جہاں میرے مضامین انگریزی، تاریخ اور سیاسیات رہے۔ 5791ئمیں بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد میں نے کشمیر یونیورسٹی میں دخلہ لیا اور 1977ء میں سیاسیات کے مضمون میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے قبل میں نے ۱۹۷۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم اے سوشیالوجی میں داخلہ لیا تھا اور قریبا ڈیڑھ ماہ تک وہاں زیر تعلیم رہا۔ادھر ساتھ ہی میں نے کشمیر یونیورسٹی میں بیک وقت اردو، قانون اور سیاسیات کے شعبوں میں داخلے کی عرضیاں بھی داخل کی تھیں اور تینوں شعبوں میں منتخب امیدواروں میں میرا پہلا نام نکلا۔علی گڑھ میں قیام کے دوران میں سخت بیمار ہوا۔شاید ملیریا کا حملہ تھا اور ایک رات اسپتال میں بھی زیر علاج رہا۔ان ایام میں برادر محمد اسماعیل صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جیالوجی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے مگر جب میں علی گڑھ میں تھا تو وہ گھر آ چکے تھے۔میں نے ایک خط میں اپنے کزن نیاز احمد کو اپنی علالت کی خبر دی اور تاکید کی کہ وہ گھر میں نہ بتائیں۔ان سے یہ خبر چھپائے نہ بنی۔انہوں نے گھر میں خبر کر دی جس پر گھر کے سبھی افراد، خصوصا والدہ محترمہ، سخت پریشان ہوئیں۔چنانچہ مجھے بڑے بھائی صاحب کی طرف سے ایک تار ملا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ فورا گھر واپس آ ؤ۔اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔میں جیسے اسی کے انتظار میں تھا۔اکتوبر کا مہینہ تھا۔یونیورسٹی میں پوجا کی چھٹیاں تھیں اور میں ٹرین میں سوار ہو کر ناکام سپاہی کی طرح واپس لوٹا۔تب سے آج تک گھر میں برابر یہ طعنہ سنتا آ رہا ہوں کہ معمولی سی بیماری کی وجہ سے علی گڑھ چھوڑ کر آ گیا۔مقابلے میں خود برادر محمد اسمٰعیل صاحب کی

مثال موجود تھی۔ جو تعلیم کے دوران ایک مرتبہ وہاں بے حد علیل ہوئے اور یونیورسٹی انتظامیہ نے تار کے ذریعہ ہمیں خبر کر دی۔ ایم اے کا امتحان فسٹ کلاس میں پاس کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کر کے جیالوجی کے مضمون میں جموں و کشمیر کے پہلے مسلم ڈاکٹریٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ میں ایسی قوت برداشت کا مالک نہیں ہوں اور ذرا سی تکلیف اور مشکل مجھے بے حد پریشان کر دیتی ہے۔علی گڑھ سے واپسی کے بعد میں نے کشمیر یونیورسٹی میں قانون اور اردو کے بجائے سیاسیات کے شعبے میں داخلہ لیا جہاں نیاز احمد آخری سال کے طالب علم تھے۔ان کی موجودگی سے میں ریگنگ جیسے عذاب سے بچ گیا جبکہ میرے ہم جماعتوں کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ میرا تعلیمی ریکارڈ اس لحاظ سے اچھا رہا کہ چھٹی جماعت سے جب سے میرے مارکس کارڈ میرے پاس موجود ہیں، میں نے ہر امتحان امتیازی نمبرات سے اسکول اور کالج میں اوّل رہ کر پاس کیا۔ایم اے کے امتحان میں البتہ یہ امتیاز برقرار نہ رکھ سکا اور یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم کے علاوہ میرا کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا۔ البتہ لڑکپن اور نوجوانی میں محلّہ کے دیگر لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا۔ گھر کے نزدیک واقع ریڈنگ روم کے پچھواڑے خالی زمین پر میں نے لڑکپن میں بہت کرکٹ کھیلی ہے جہاں ہماری وکٹ بجلی کا کھمبا ہوتا تھا۔ مجھے بیٹنگ کرنے کا شوق تھا اور اڑوس پڑوس کے معیار کے مطابق فاسٹ باولر تھا۔ ایک بار کالج میں ہم جماعتوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے سات وکٹیں لیں۔ میرے ہم جماعت جو مجھے صرف بحیثیت ''پڑھاکو' جانتے تھے، اس کارنامہ پر حیران ہوئے۔ خورشید شیر خان نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ارے یار تم تو چھپے رستم نکلے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی کوئی کھیل کھلاڑی بننے کی نیت سے نہیں کھیلا۔ کرکٹ کے کھیل سے البتہ ہمیشہ دلچسپی رہی خصوصاً دیکھنے کی حد تک۔

میرے لڑکپن کے دنوں میں سونہ وار میں کرکٹ کے میدان میں سالانہ رانجی ٹرافی چمپین شپ کے میچ منعقد ہوتے تھے، جہاں بھارت کی مختلف ریاستوں کی کرکٹ ٹیمیں جموں و کشمیر کی ٹیم کے ساتھ کھیلنے آتی تھیں۔ ان میں سابق اور موجودہ ٹیسٹ کھلاڑی بھی ہوتے۔ ایسے ہی کھلاڑیوں میں کے ایچ۔ ٹی۔ وانی بھی تھے جنہوں نے 1960ء کی دہائی میں پاکستان کے خلاف

کھیلا تھا اور اس نسبت سے ان کی اوپری جیب پر ایک بیج لگا رہتا تھا۔ دیگر نامور کھلاڑیوں میں کامیاب اسپن باولر بشن سنگھ بیدی اور میڈیم پیس باولر مدن لال تھے۔ ایک میچ کے دوران جموں وکشمیر ٹیم کے کپتان عبدالرؤف نے بیدی کی باولنگ کی کرکری کر دی اور چوکوں اور چھکوں کی بارش کر کے 96 رن بنائے۔ عبدالروف کشمیر کے سب سے معروف آل راونڈر اور تماشائیوں کے محبوب کھلاڑی تھے۔ ان کو کھیلتے دیکھنے کے لیے دور دراز سے لوگ آتے اور جتنی دیر وہ بیٹنگ یا باولنگ کرتے لوگوں کی دلچسپی قائم رہتی۔ اس کے بعد اکثر اٹھ کر چلے جاتے۔ عبدالرؤف لمبے قد کے خوبرو نوجوان تھے، جن کے مدحواں میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص بھی تھا، جو پاکستان کے مشہور ''چاچا کرکٹ'' کی طرح ہر دن ان کا کھیل دیکھنے آتا اور انہیں buck up کرتا۔ کرکٹ کے ان مقابلوں کے دوران میں اور میرے بعض کزن سارا دن کرکٹ میدان میں گزارتے۔ جب ایمپائر لنچ کا اعلان کرتا تو ہم بھی کھانا کھانے گھر آتے۔ اسی طرح چائے کے وقفے میں ہم جلدی جلدی گھر سے چائے پی کر میدان میں لوٹ آتے۔ بچپن میں، میں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہوئی کرکٹ سیریز کا تصویری البم بنایا تھا جس میں حنیف محمد، محمد حسین، امتیاز احمد، انتخاب عالم ایسے کھلاڑیوں کی کئی تصویریں موجود تھیں۔ ایسا ہی ایک اور البم ان تصاویر پر مبنی تھا جو امریکہ کے خلائی شٹل اپالو، کے کئی بار چاند پر اترنے سے متعلق تھیں۔ یہ دونوں البم بہت دنوں تک میرے پاس تھے لیکن ۲۰۰۳ء میں نقل مکانی کے وقت کہیں کھو گئے، تسخیر قمر کے فوٹو میں نے ریڈنگ روم کے اخباروں سے نظریں بچا کر جمع کیے تھے۔

کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد میرے لیے ابھی روزگار کا وسیلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ 1979ء کا سال تھا کالم نویس جی ایم زاہد، ان دنوں محکمہ اطلاعات میں ملازم تھے۔ وہ میرے پھوپھی زاد بھائی شیخ منظور احمد کے دوست ہیں اور اس ناطے میرے بھی ان سے مراسم تھے۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ روزنامہ ''افتاب'' کو ادارتی عملے کے لیے ایک نوجوان کی تلاش ہے جسے اردو زبان سے اچھی خاصی واقفیت ہو اور صلاح دی کہ مجھے وہاں جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے ان صاحب سے ملوائیں گے جنہیں مدیر آفتاب نے ایسا کوئی نوجوان تلاش کرنے کو کہا تھا۔ میں نے حامی بھر لی۔ چنانچہ میں ان کے دفتر گیا جہاں سے ان کے افسر مظفر احمد خان

مجھے ادارہ ''آفتاب'' میں لے گئے اور مدیرِ آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ سے متعارف کرایا۔

خواجہ صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی حالانکہ روزنامہ آفتاب کے قارئین کے لیے میں غیر معروف نہ تھا۔ میرا اور آفتاب کا رشتہ سات سال قبل جڑا تھا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۲ء کو جب میں ایس پی کالج کا طالب علم تھا، میری پہلی کہانی ''انوکھا ملن'' روزنامہ آفتاب میں شائع ہوئی تھی۔ وہ لمحہ آج بھی میرے حافظے میں تازہ ہے۔ ان دنوں ہمارے یہاں اخبار یا تو دوستہ خالق مرحوم کے سیلون میں آتا تھا یا پھر مرحوم کمال صوفی کی دکان پر۔ سیلون میں جا کر اخبار پڑھنا میری ہمت سے باہر تھا کیونکہ وہاں محلّہ کے تمام بڑے اور بزرگ حقّے کے کش لے لے کر آفتاب کا پرچہ باری باری پڑھتے اور چٹخارے لے لے کر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہتے۔ اس محفل میں ایسے نوجوان کا جانا اور اخبار مانگ لینا حدِ ادب سے باہر تھا۔ میں حسبِ معمول صبح سویرے روٹیاں لینے بازار گیا اور نانبائی کی دکان پر اپنی باری کا انتظام کر رہا تھا۔ اخبار کا ہاکر آفتاب کا پرچہ دکان پر چھوڑ گیا تھا اور مرحوم کمال صوفی کے فرزند مرحوم فاروق احمد اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کب وہ مطالعہ ختم کریں اور میں ان سے اخبار مانگ کر پڑھ لوں۔ کچھ دن قبل میں نے ایک کہانی لکھ کر آفتاب میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی اور اب مجھے بے چینی سے انتظار تھا کہ کب کہانی اخبار میں شائع ہو۔ جب آفتاب میرے ہاتھوں میں آیا اور پہلے صفحے پر سرسری نظر ڈال کر میں نے اخبار کا ورق الٹا تو نہ صرف یہ کہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا بلکہ پورے جسم پر عجیب قسم کی کپکپی چھا گئی۔ یہ خوشی کا کیسا احساس تھا مجھے آج تک معلوم نہیں۔ ان دنوں آفتاب چار صفحات پر شائع ہوتا اور دوسرے صفحہ کے دو تہائی حصے پر میری کہانی چھپی تھی ''انوکھا ملن'' تحریر خالد بشیر سونہ وار سرینگر۔ یہ ادبی دنیا سے میرا پہلا تعارف تھا۔ اس کے بعد میری کہانیاں متواتر آفتاب میں چھپیں اور پھر جب میرا میلان شاعری کی طرف بڑھا تو میری غزلیں اور نظمیں بھی پہلے آفتاب کی وساطت سے ہی سامنے آئیں۔ ان دنوں کے یہ اشعار میرے حافظے میں اب بھی تازہ ہیں۔

سسکتی رہی ہیں، تڑپتی رہیں ۔۔۔ مگر آرزوئیں مچلتی رہیں
مجھے لے کے تنہائیاں مچلتی رہیں ۔۔۔ یہ کن راستوں پر بھٹکتی رہیں

یہ وہ زمانہ تھا جب ''آفتاب'' نے کشمیر کی ادبی دنیا سے کئی نئے نام متعارف کرائے

تھے۔ان دنوں جو اصحاب تواتر سے چھپتے تھے ان میں عمر مجید، م۔م۔صدیق اور ایس ایم قمر تینوں میرے ہم محلّہ تھے۔ان کے مقابلے میں، میں نو آموز تھا۔بشیر گاش، شمس الدین شمیم، محمد یعقوب بافندہ، یٰسین فردوسی، نذیر مشتاق بڑی باقاعدگی کے ساتھ چھپتے تھے۔ان کے علاوہ بھی کئی نام تھے جنہیں اس وقت میں بھول رہا ہوں۔امید ہے میرے وہ دوست مجھے معاف فرمائیں گے۔

بہر حال مجھے ادارہ آفتاب میں رکھا گیا اور اولاً خبر رساں ایجنسیوں یو این آئی اور پی ٹی آئی کی کچھ خبریں ترجمہ کرنے کو دی گئیں۔میں نے فوراً ترجمہ خواجہ صاحب کے پاس بھجوادیا۔خواجہ صاحب نے سرخیاں جمادیں اور خبریں اخبار میں چھپ گئیں۔ان دنوں بڈشاہ چوک میں اخبار کا دفتر جیسا کہ شاید آج بھی ہے، تین کمروں اور ایک راہداری پر مشتمل تھا۔پہلے کمرے میں ادارے کا منیجر اور دیگر اسٹاف، دوسرے میں مدیر آفتاب اور تیسرے میں اخبار کے خوش نویس حضرات بیٹھتے تھے۔ ادارتی عملے میں طاہر محی الدین اور یوسف جمیل مستقل رکن تھے۔یوسف جمیل، خواجہ صاحب کے بالمقابل بیٹھتے تھے اور خبروں اور دیگر کالموں کے لیے خواجہ صاحب سے ڈکٹیشن بھی لیتے اور خود بھی خبریں تیار کرتے تھے۔طاہر محی الدین راہداری میں براجمان تھے اور میری نشست بھی وہیں مقرر ہوئی۔یوسف جمیل ان دنوں خواجہ صاحب کے خالص الخاص تھے۔ان کی بات کا پاس رکھا جاتا تھا۔اس سے قبل طاہر محی الدین کو یہ مرتبہ حاصل تھا جبکہ ان سے قبل غلام نبی رتن پوری اس منصب پر فائز تھے۔رتن پوری میرے ادارہ جوائن کرنے سے قبل ہی وہاں سے جاچکے تھے۔چنانچہ طاہر محی الدین کہا کرتے تھے کہ اگر یوسف جمیل خواجہ صاحب سے کہے کہ کل چھٹی کریں گے تو سمجھو کل چھٹی ہے۔بہر حال، مجھے آفتاب میں ایک اچھا اور دوستانہ ماحول میسر آیا۔طاہر محی الدین اور یوسف جمیل دونوں شفقت کی حد تک مجھ سے مانوس ہوئے تھے۔یوسف جمیل کی شرافت اور قابلیت دونوں مسلم تھیں۔اول الذکر سیاست پر خامہ فرسائی کرتے تھے جبکہ آخر الذکر زیادہ تر اسلامی اور فلمی صفحات ترتیب دیتے تھے۔جمیل صاحب کے ذمہ اتوار کو شائع ہونے والا بارہ صفحات Tabliod سائز ہفتہ وار شمارہ بھی تھا۔میں بھی اس کے لیے خبروں کے علاوہ مضامین اور فیچر لکھتا تھا۔

میرے ادارہ آفتاب میں آنے کے تیسرے یا چوتھے روز خواجہ صاحب نے مجھے طلب کیا۔میں راہداری میں نکلنے والے دروازے سے ان کے کمرے میں داخل ہوا۔غالباً وہ اس وقت

اکیلے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مجھ سے یوں مخاطب ہوئے میں نے تمہارا کام دیکھا۔ دو تین دن میں ہی تم نے اچھی طرح سے Pick up کیا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرو کہ آیا تم یہاں کام کرو گے۔ میرے لیے یہ الفاظ بے حد حوصلہ افزا تھے۔ چنانچہ مجھ میں اعتماد ظاہر کرنے پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جواباً عرض کیا کہ میں کام کرنے کی غرض سے ہی آیا ہوں۔ یہ کہہ کر میں واپس اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں لیکن شاید جون کا مہینہ تھا جب میں ادارہ آفتاب کے ساتھ وابستہ ہوا تھا۔ یہ غالباً وسط ماہ تھا۔ اختتام ماہ پر جب عملے کو اپنے کام کا محنتانہ دیا گیا تو میں ان خوش نصیبوں میں شامل نہیں تھا۔ میں نے کسی سے پوچھا بھی نہیں کہ کیوں؟ البتہ اگلے ماہ کے اختتام پر مجھے دو سو روپے تنخواہ دی گئی۔ میرے حساب سے یہ ایک قلیل رقم تھی لیکن میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور ادارے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

بچپن سے ہی کہ جب سے میں روزنامہ آفتاب پڑھتا تھا خواجہ ثناء اللہ بٹ کی شخصیت کا ایک اسطوری خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ آفتاب محلّہ محلّہ قصبہ قصبہ پڑھا جاتا تھا اور سرینگر شہر میں تو ان لوگوں کے لیے جنہیں اخبار خریدنے کے لئے استطاعت تھی۔ یہ ناشتے کا ایک اہم جز تھا۔ دیگر لوگ اکثر حجاموں کے دکانوں پر لگنے والی بیٹھکوں میں یا ریستورانوں میں اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ شہر میں خال ہی نائی کی دکان ہوگی جہاں آفتاب نہ آتا ہو اور یوں یہ دکانیں کیمونٹی ریڈنگ روم کے طور پر استعمال ہوتیں۔ آفتاب میں چھپنے والی خبروں اور مضامین کو لوگ اعتبار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' ایسے مزاحیہ کالم کو بھی حقیقت تسلیم کر لیتے۔

''آفتاب'' میں میرے قیام کا وقت افغانستان میں سوویت یونین کی جارحیت اور قبضے کا دور تھا۔ سوویت استبداد اور ظلم و جبر کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے قصّے یا تو بی بی سی کے ذریعہ یا مغربی اخباروں اور جرائد کی وساطت سے لوگوں تک پہنچتے تھے۔ روزنامہ ''آفتاب'' افغان مجاہدین کی جرأت اور جواں مردی کے قصّے بڑے چاؤ اور کسی حد تک عقیدت مندانہ طریقے پر شائع کرتا تھا۔ اس کے پیچھے طاہر محی الدین کی کاوش تھی جو اخبارات اور بی بی سی کے سیربین پروگرام سے خبریں اکٹھا کر کے قارئین کو سوویت یونین کی پسپائی کی نوید دے

رہے تھے۔ اِنہی دنوں جو کہ 'آفتاب' میں میرے ابتدائی ایام تھے امریکی جریدے 'ٹائم' میں افغانستان پر سوویت حملے اور سرخ فوج کی عسکری قوت کے بارے میں ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا۔ خواجہ صاحب اس مضمون کو اخبار میں نقل کرنا چاہتے تھے چنانچہ ترجمے کا کام مجھے سونپا گیا جسے میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل کر دیا۔ اس ترجمے نے اُن کی نظروں میں وقعت بڑھا دی۔ دوسرے روز یہ مضمون اخبار کے صفحہ اول پر شائع ہوا لیکن ترجمہ نگار کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بہر حال مجھے یہ تسلی رہی کہ یہ کام میں نے ہی کیا ہے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے مجھے اپنی زیرِ ترتیب کتاب 'کشمیر 1947ء سے 1977ء تک کے دو تین ابواب انگریزی میں ترجمہ کرنے کو دِیے۔ وہ کتاب کا انگریزی پرنٹ شائع کرنا چاہتے تھے۔ ترجمے کا کام صحافی ایم ایل کاک کر رہے تھے اور خواجہ صاحب کی نظر میں یہ دو تین ابواب بڑے دھماکہ خیز تھے جنہیں وہ کاک صاحب کو دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ ان میں ایک باب پرمیشوری کے قبولِ اسلام اور پنڈت ایجی ٹیشن اور دوسرا موئے مقدس تحریک کے بارے میں تھا۔ خواجہ صاحب پہلے کتاب کا عنوان 'کشمیر شعلوں کی لپیٹ میں' رکھنا چاہتے تھے لیکن بعد میں اسے بدل دیا۔ اُن کے خیال میں اس طرح کا عنوان آتش گیر مادہ تھا۔

میرے اوقاتِ کار صبح دس بجے سے رات کو نو بجے تک تھے۔ دن بھر طاہر محی الدین، یوسف جمیل اور میں ٹیلی پرنٹر روم سے اہم خبریں منتخب کر کے اُن کا ترجمہ کرتے اور وادی کے مختلف حصوں سے حاصل ہونے والی رپورٹوں اور پریس نوٹس سے خبریں تراش کر مدیرِ آفتاب کی میز تک پہنچاتے جو حسبِ ضرورت ایڈیٹنگ کر کے سرخیاں جما کر خوشنویسوں تک پہنچوا دیتے۔ دن بھر کی مشقت کے باوجود تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا کیونکہ پورا عملہ ایک دوستانہ ماحول میں کام کرتا تھا۔

میری پہلی Outdoor Assignment ایک پریس کانفرنس تھی جس سے گورنر جموں وکشمیر، ایل کے جھا، راج بھون چشمہ شاہی میں خطاب کرنے والے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ صحافیوں کو محکمہ اطلاعات کی طرف سے گورنمنٹ پریس بلڈنگ سے راج بھون تک لے جایا جائے گا۔ محکمہ اطلاعات کے صوبائی دفتر میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بتایا گیا کہ مجوزہ پریس کانفرنس

ملتوی کی گئی ہے۔اس کے بعد پہلی بار کسی واقعہ کی رپورٹنگ کرنے کا موقعہ مجھے اُس وقت ملا جب حکمران نیشنل کانفرنس آنے والے پارلیمانی ضمنی انتخابات کے لیے اپنے اُمیدواروں کا عوامی اجتماع میں اعلان کرنے والی تھی۔ یہ اجتماع مجاہد منزل میں تھا اور ناموں کا اعلان سہ پہر کو خود وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کرنے والے تھے۔ایک بڑا اسٹیج تیار کیا گیا تھا جس پر شیخ صاحب کے علاوہ پارٹی کے دیگر زعماء براجمان تھے۔ مجھے بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ اسٹیج پر ہی جگہ ملی۔ شیخ صاحب کو اتنا قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور اُن کے عقب میں، میں بیٹھا، جلسہ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔اُن کے چہرے اور جسم پر عمر رسیدگی کے اثرات نمایاں طور پر اُبھرے تھے اور لگ رہا تھا کہ کشمیر کی وادیوں میں دھاڑنے والا شیر اب بوڑھا ہو چکا ہے۔

میں اس خیال سے کہ جلسے کی کاروائی کا کوئی حصہ نہ چھوٹے، بہت پہلے ہی مجاہد منزل پہنچ گیا تھا اور جب تک کہ جلسہ اختتام پذیر ہوا اور شیخ صاحب نے پارٹی کے امیدواروں کو عوام سے متعارف کرا کے اپنی تقریر ختم کر دی، شام رات کی دہلیز پر دستک دے چکی تھی۔ میں جلدی جلدی واپس دفتر پہنچا، شیخ صاحب کی تقریر اور جلسے کی کاروائی پر خبر تیار کی جو نسبتاً طویل تھی اور خواجہ صاحب تک پہنچا کر گھر لوٹا۔صبح جب اخبار دیکھا تو میری تحریر کردہ خبر ''آفتاب'' کی شہ سرخی تھی اور اس سے زیادہ حیرت اور مسرت کی بات یہ تھی کہ خبر کے ساتھ بائی لائن بھی شائع ہوئی تھی۔خالد بشیر، نمائندہ خصوصی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اس طرح ''آفتاب'' میں کسی رپورٹر کی بائی لائن شائع ہوئی ہو۔وادی سے چھپنے والے دیگر اخباروں کی تو بات ہی نہیں۔اب تک صرف مضامین، تبصروں، تجزیاتی رپورٹوں یا مستقل کالموں کے ساتھ ہی کالم نگار کا نام آتا تھا۔نامہ نگار کی حیثیت سے یہ افتخار میرے حصے میں تھا۔خواجہ صاحب میرے کام سے خوش تھے۔اس کا احساس مجھے تھا اور یہ بات بھی صاف تھی کہ مجھ پر اُن کا اعتماد بڑھ گیا تھا۔

سرینگر میں ریاستی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ پہلے ہی دن ایوان میں دھینگا مشتی اور ہاتھا پائی ہوئی۔ جنتا پارٹی کے رہنما عبدالغنی لون کو نیشنل کانفرنس کے ارکانِ اسمبلی نے زدوکوب کیا اور کہا گیا کہ یہ سب کچھ شیخ صاحب کی ایما پر ہوا۔اخبار کے دفتر میں یہ خبر پہنچ چکی

تھی اور میں تقریباً فراغت میں تھا۔ میں نے قلم اٹھایا اور یہ قطعہ تحریر کیا۔

شروع جب ہوگئی قانون سازی　　بڑی اُدھم مچائی ممبروں نے
جناب شیخ بھی برہم ہوئے جب　　لتاڑا لون کو کچھ دلبروں نے

یہ اشعار لکھ کر میں نے طاہر محی الدین کو دِکھائے جو انہیں لے کر خواجہ صاحب کے پاس گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بلاوہ آیا۔ میں کمرے میں گیا تو اُنہوں نے بڑے تپاک کا مظاہرہ کیا اور شاباشی دے کر کہا کہ یہ ''real contribution'' ہے۔ خبریں وغیرہ تو معمول کی چیزیں ہیں۔ یہ سن کر میرا حوصلہ ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ صبح کے اخبار میں یہ قطعہ صفحہ اوّل پر میرے نام کے ساتھ زرّیں بکس (box) میں شائع ہوا اور یوں کشمیر کی صحافت میں روز مرہ کے حالات و واقعات پر مبنی شعری کارٹون کی ابتداء ہوئی جس کی بعد میں کئی اخبارات نے تقلید کی۔ شعری کارٹون سے آفتاب کی مقبولیت میں کوئی اضافہ ہوا یا نہیں لیکن مجھے اچھی خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ قارئین کی پسندیدگی کا feedback کسی نہ کسی طرح تو ملتا ہی تھا۔ اس سلسلے میں ایک دل کو چھونے والا اور بڑے دنوں تک میرے احساس پر چھائے رہنے والا واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دن میں حسب معمول دفتر میں اپنے کام میں مشغول تھا کہ کسی نے، غالباً عبدالسلام تھے، اطلاع دی کہ کوئی خاتون باہر تمہیں پوچھ رہی ہیں۔ میں حیرت اور اشتیاق کے تاثرات لے کر باہر والے کمرے میں گیا تو وہاں ایک پنجابی مسلم بزرگ خاتون، جو لاٹھی ٹیک کر آئی تھی، منتظر تھی۔ عمر رسیدہ، چہرے پر جھریاں اور آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی محبت جو صرف ماؤں کا حصہ ہے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ میں ہی خالد بشیر ہوں جنہیں تلاش کرتے ہوئے وہ یہاں آئی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی وہ خاتون والہانہ طور پر مجھ سے ملیں، میرا ماتھا چوما اور مجھے ڈھیروں دعائیں دینے لگیں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ اُنہوں نے کیا الفاظ کہے تھے لیکن وہ مجھے دعائیں اور شاباشی دے رہی تھیں، یہ کہہ کر کہ میں یونہی لکھتا رہوں۔ میرے لیے وہ لمحات نہایت انمول تھے اور یہ ایسی حوصلہ افزائی تھی جو میرے وہم و گماں سے بھی زیادہ تھی اور جس کا اثر بڑے دنوں تک باقی رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ خاتون کون تھیں لیکن جس شفقت اور محبت کا انہوں نے اظہار کیا تھا وہ یقیناً کسی بڑے

سے بڑے انعام سے بھی فزوں تھا۔

بہر حال شعری کارٹونوں کو بے حد سراہا گیا، اگر چہ خواجہ صاحب نے قارئین کی پسندیدگی کا مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا سوائے اُس دن جب شیخ صاحب کے اس اعلان کے بعد کہ وہ اپنی کابینہ میں وزراء کی تعداد کم کر رہے ہیں، اُنہوں نے اس کے برعکس ایک وزیر کا اضافہ کر دیا۔ اس سے قبل کابینہ میں وزراء کی متوقع کمی سے جونیئر وزراء تذبذب کی حالت میں تھے اور افواہوں کا بازار گرم تھا کہ فلاں وزیر گیا، فلاں کا پتہ کٹا۔ میں نے اس واقع پر یہ شعری کارٹون تحریر کیا۔

شیخ صاحب کے اشاروں کو سمجھنا چاہئے
خوامخواہ چھوٹے وزیر اُن کے بیان سے ڈر گئے
کر رہے تھے گرچہ وہ تخفیف کابینہ کی بات
کرتے کرتے اِک منسٹر کا اضافہ کر گئے

اُس روز دفتر پہنچتے ہی خواجہ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ قطعہ پسند کیا گیا اور مجھے آفتاب کے محبّ حاجی محمد جمال صاحب نے کہا ہے کہ تمہیں اس کے لئے مبارکباد دوں۔

کچھ دنوں سے خواجہ صاحب، طاہر محی الدین کو اتنی اہمیت نہیں دے رہے تھے جتنی کہ اُنہیں پہلے ملا کرتی تھی۔ دفتر میں دیگر کارکن خصوصاً خوشنویس حضرات اس بات کا برملا ذکر کر رہے تھے کہ طاہر صاحب پر خواجہ صاحب کہ وہ پہلی والی نظرِ عنایت نہیں ہے۔ اِدھر یوسف جمیل کے معاملے میں بھی شفقت و محبت میں کچھ نہ کچھ کمی واقع ہو رہی تھی۔ تب میں نے سنا کہ عنایات و التفات کا ''ابھی ہے اور ابھی نہیں'' والا سلسلہ اس سے قبل غلام نبی رتن پوری کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ اُن کے رہتے ہی طاہر محی الدین ادارہ ''آفتاب'' کے ساتھ وابستہ ہوئے تھے اور عنایات و توجہ کا مرکز دھیرے دھیرے طاہر محی الدین کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ یہی معاملہ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کے بارے میں رہا اور جب میں ادارہ ''آفتاب'' میں داخل ہوا تب، جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا، یوسف جمیل کا وہاں طوطی بولتا تھا۔ میرے ابتدائی ایام میں ہی ادارے میں بعض کرم فرماؤں نے مجھے خواجہ صاحب کے التفات کی

ناپائیداری کے بارے میں بتایا تھا اور یوں بھی میری فطرت کے پیش نظر میں اُن کے پاس بلاضرورت نہیں جاتا تھا۔ میں نے خود ہی ایک آڑ قائم کی تھی جس کی وجہ سے اُن کی شاباشیوں اور حوصلہ افزائیوں کا مجھ پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔

ایک دن خواجہ صاحب نے مجھے بلایا۔ جب میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اکیلے تھے۔ مجھ سے یوں مخاطب ہوئے 'تم سارا دن یہاں کام کرتے ہو جب کہ اور لوگ بھی ہیں۔ تم باہر جایا کرو فنکشن وغیرہ Cover کیا کرو۔' اشارہ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کی طرف تھا۔ اس سے قبل وہ میری تنخواہ دوگنی کر کے چار سو روپے ماہوار کر چکے تھے۔ اگر چہ مجھے یک گونہ خوشی ہوئی اور میرا حوصلہ بڑھا کہ میرے کام کا نوٹس لیا جا رہا ہے تاہم اس سے میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔ مجھے پہلے ہی 'ناپائیداری التفات' کی گھنٹی سنائی گئی تھی۔

1980ء کے ابتدائی مہینے تھے ایک روز میں اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں رات کو ٹھہرا تھا۔ اُن دونوں ہفتے میں ایک مرتبہ دُور درشن سرینگر سے روزگار بلیٹن ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ اُس روز کے بلیٹن میں انفارمیشن آفیسروں کی اسامیوں کے لیے درخواستیں دینے کی پہلے ہی نشر شدہ ''آخری تاریخ'' بڑھائے جانے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے پہلے میں نے اس بارے میں نہیں سنا تھا۔ چنانچہ اسامیوں کے لیے قابلیت کا جو معیار مقرر تھا، میں اس پر پورا اُترتا تھا۔ اگلے دن میں نے مقررہ فارم وصول کر کے درخواست دی۔ اس کے بعد انٹرویو کے لیے بلاوہ آ گیا۔ میں نے نوکری کے لیے درخواست دینے کی بات طاہر محی الدین اور یوسف جمیل سے کی لیکن خواجہ صاحب سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ دراصل مجھے اس بات کا احساس کرایا گیا تھا کہ خواجہ صاحب مجھے نوکری کے لیے ادارہ سے جانے نہیں دیں گے اور اس کے لیے اگر ضرورت پڑی تو وہ انٹرویو پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اپنے برادر، جو ایک ماہ قبل ہی دہرہ دُون کے واڈیا انسٹیچیوٹ آف ہمالین جیالوجی میں بطور سائنٹسٹ مامور ہوئے تھے، سے ملنے کے بہانے کچھ دن کی چھٹی پر چلا گیا۔ اس طرح کی رخصت پر جانے کی ادارہ میں کوئی روایت نہیں تھی۔ بہر حال انٹرویو 13 / مارچ کو جموں میں ہونا تھا۔ میں اپنے بچپن کے دوست محمد شفیع، جن کی خود حال ہی بنک میں نوکری لگی تھی، کو ساتھ لیکر جموں چلا گیا جہاں میرا

انٹرویو ہوا اور میں مطمئن ہو کر دلی سے ہوتا ہوا دہرہ دون چلا گیا۔ اس سے پہلے میں نے ریڈیو کشمیر میں ٹرانسمشن ایکزیکیٹو کی اسامی کے لیے بھی انٹرویو دیا تھا لیکن اس کا نتیجہ ابھی نہیں آیا تھا۔ بعد میں اس اسامی پر بھی میری تقرری کا حکم نامہ آیا لیکن اس سے قبل میں محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گیا تھا۔ دہرہ دون سے واپسی پر میں نے 'آفتاب' میں اپنا کام دوبارہ شروع کیا۔

16 / اپریل 1980ء کی سہ پہر کو دفتر میں میرے لیے فون آ گیا۔ دوسری طرف جی۔ ایم زاہد تھے جنہوں نے مجھے اطلاع دی کہ انفارمیشن افسر کے طور میری تقرری کا حکم جاری ہوا ہے اور میں آ کر نوکری جوائن کرلوں۔ اُنہوں نے اپنے ڈپٹی ڈائرکٹر مرحوم محمد امین پنڈت کو فون دیا جنہوں نے مجھے مبارکباد دی اور پوچھا کہ کیا میں نوکری کا پروانہ لینے اُن کے دفتر آؤں یا کہ وہ یہ پروانہ میرے پاس بھیج دیں گے؟ پھر کہا کہ اگر میں اُدھر ہی آؤں تو ایک پیالی قہوہ میرے انتظار میں ہے۔ یہ انتہائی پر خلوص اور مشفقانہ دعوت جسے رد کرنا نہ صرف دائرہ اخلاق کے باہر تھا بلکہ ایک سینئر افسر کا اپنے ہونے والے ماتحت ملازم کو اس طرح بلانا اپنے آپ میں شرافت کی ایک مثال تھی۔ چنانچہ میں یوسف جمیل اور طاہر محی الدین سے اس خوشخبری کا تذکرہ کر کے محکمہ اطلاعات کے لیے نکل پڑا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ خواجہ صاحب کو اس کی اطلاع دیں۔ میں خود اس طرح اچانک یہ بات اُنہیں نہیں کہہ پا رہا تھا۔ میں محکمۂ اطلاعات میں نوکری کا حکم نامہ لینے جوائن کرنے کے لیے کہا گیا۔ میری جوائننگ رپورٹ پر امین صاحب نے Wel Come (خوش آمدید) لکھا۔ اس کے بعد میں خواجہ صاحب اور ''آفتاب'' میں اپنے رفقاء سے رسمی رخصت لینے کے لیے واپس گیا۔ اس دوران مجھے بتایا گیا کہ خواجہ صاحب ناراض ہیں۔ بہر حال! شام کو جب وہ صورہ میں اپنی رہائش گاہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ میں طاہر محی الدین کے ساتھ اُن کے کمرے میں گیا۔ یوسف جمیل پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ طاہر محی الدین نے اُن سے کہا، خالد صاحب کی انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں نوکری لگ گئی ہے اور یہ رخصت چاہتے ہیں، خواجہ صاحب جو گھر جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے، نے ایک ترچھی نظر مجھ پر ڈالی اور کہا i am happy but i will not congratulate you (میں خوش ہوں لیکن تمہیں مبارکباد نہیں دوں گا)۔ الفاظ میں جو غصہ تھا وہ

عیاں تھا۔ایک اور بات جو اُنہوں نے لِکھی وہ یہ تھی کہ چونکہ تم حال ہی میں کئی دونوں کی چھٹی پر تھے اس لئے اس مہینے کے 16 دونوں کی تنخواہ تمہیں دی جائے گی۔تنخواہ کی بات کس نے کی تھی اور دونوں کا کس نے حساب رکھا تھا؟ اُلٹا مجھے ایسا لگا کہ میں نے جو خواجہ صاحب سے سرکاری ملازمت کا ذکر نہیں کیا تھا تو ان کے فیصلے سے اس گناہ کا گویا کفار ادا ہو گیا۔اس واقعے سے پہلے جو حضرات وہاں سے رُخصت ہوئے وہ فارغ کیے گئے تھے۔میں پہلا شخص تھا جو خود رخصت ہو رہا تھا۔اس بات کی تلخی رہی ہوگی۔''آفتاب'' میں کام کرنے والے کل وقتی صحافیوں میں سے، میں نے سب سے کم یعنی کوئی نو، دس مہینے ہی وہاں کام کیا۔میرے ہم عصر طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کئی برس تک ٹکے رہے۔وہ مجھ سے پہلے آئے تھے اور میرے بعد وہاں سے رخصت ہوئے۔بہر حال، میں خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کرکے نکل آیا۔اپنی حساس طبیعت کے باعث میں نے پھر کبھی مڑ کر اُس طرف نہیں دیکھا۔اُن کے انتقال سے قبل البتہ جب 2008ء میں، میں نے محکمہ اطلاعات کے ناظم کا عہدہ سنبھالا تو دو مرتبہ اُن سے ملنے گیا۔ایک مرتبہ سرینگر میں اور دوسری مرتبہ جموں میں۔یہ 28 سال کے بعد ہماری پہلی ملاقات تھی۔وہ علیل تھے اور اُنہوں نے کسی قسم کی رنجش کا احساس نہیں دلایا۔

روزنامہ ''آفتاب'' کے ساتھ مختصر وابستگی کے بعد اپریل 1980ء میں میرا تقرر حکومت جموں وکشمیر کے محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ میں بطور انفارمیشن افسر ہوا۔یہاں میں نے ماہنامہ ''تعمیر'' اور پندرہ روزہ ''مکتوب'' کی ادارات سنبھالی۔اس دوران 'تعمیر' کے کئی خصوصی نمبر شائع کیے جن میں ''جموں وکشمیر میں اُردو ادب نمبر''، ''پریم چند نمبر'' اور ''مہجور نمبر'' کی خاصی پذیرائی ہوئی۔محکمہ اطلاعات میں پبلک ریلیشنز، ایڈورٹائزنگ اور پبلی کیشنز کے شعبوں کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد جولائی 2008ء میں ناظمِ اطلاعات کی حیثیت سے اسی محکمہ کے سربراہ کا عہدہ سنبھالا۔جن دیگر عہدوں پر کام کیا اُن میں ڈائریکٹر لائبریریز اینڈ ریسرچ، ڈائریکٹر آرکائیوز، آرکیالوجی اینڈ میوزیمز، سپیشل سیکریٹری محکمہ ہاوسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ، ایڈیشنل ٹو سیکریٹری ٹو چیف منسٹر اور جوائنٹ ڈائیرکٹر انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ اینڈ رورل ڈیولپمنٹ شامل ہیں۔پھر سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف

آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

اُردو ادب سے بچپن سے ہی شغف رہا گو کہ ہمارے خاندان میں شعر گوئی کا شوق رکھنے والا میں پہلا اور اب تک واحد فرد ہوں۔ ادب کے تئیں میرے شوق کو سونہ وار میں ہمارے آبائی گھر کے سامنے واقع پبلک ریڈنگ روم نے خوب اُبھارا جہاں جانا میرا روز کا معمول تھا۔ یہاں انگریزی اور اردو اخبارات کے علاوہ کچھ ادبی رسالے بھی آتے تھے جن کے مطالعہ نے مجھے لکھنے پر اُکسایا۔ ابتداءً طور پر افسانے لکھے جو مقامی اخباروں میں شائع ہوئے۔ میرا پہلا افسانہ ''انوکھا ملن'' کے عنوان سے 15۔جنوری 1976ء کو روزنامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کئی افسانے لکھے جو زیادہ تر اسی اخبار میں شائع ہوئے۔ اس دوران میری توجہ اُردو شاعری کی طرف گئی اور میری غزلیں ''آفتاب'' میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ ''آفتاب'' اُن دونوں کشمیر کے لکھنے والوں خصوصاً نوآموز قلمکاروں کے لیے ایک اہم پلیٹ فارم تھا۔ یہاں سے کئی معروف ادبی شخصیات منظر عام پر آئیں۔ اُردو شاعری سے میرا میلان اس حد تک بڑھ گیا کہ میں نے افسانوں سے اپنی توجہ یکسر ہٹا کر شعر گوئی کی جانب مبذول کی۔ ایس پی کالج میں دوران تعلیم میں کالج کی میگزین ''پرتاپ'' کے اُردو سیکشن کا ایڈیٹر رہا اور 2005ء میں کالج کے صد سالہ جشن کے موقعہ پر میرا تحریر کردہ ''کالج ترانہ'' ایک پروقار تقریب میں جاری کیا گیا۔

1983ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے نیم شب'' منظرِ عام پر آیا جسے جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز کی جانب سے سال 1984ء کی بہترین اردو تصنیف کا ایوارڈ حاصل ہوا۔ اُس وقت یہ انعام دو ہزار روپیوں پر مشتمل ہوتا تھا جسے عطا کرنے کے لیے کوئی تقریب منعقد نہیں کی جاتی تھی بلکہ انعام کی رقم کا چیک انعام پانے والے کے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔ اب تو نہ صرف انعام کی رقم 51 ہزار روپے تک بڑھائی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ انعام یافتہ ادیب وشاعر کو ایک شال بھی پیش کی جاتی ہے جس کے لیے ایک بڑی محفل کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس مجموعے پر برصغیر کے ادبی جرائد میں بڑے اچھے تبصرے آئے اور یوں یہ نام وسیع تر اُردو شعر وادب کی دنیا میں متعارف ہوا۔ 2008ء میں میرا دوسرا

شعری مجموعہ ''خواب پارہ'' شائع ہوا۔ پہلے اور دوسرے شعری مجموعے کے منظرِ عام پر آنے کے درمیان طویل وقفہ کا موجب میری دفتری مصروفیات بھی تھیں اور اس دوران میری توجہ کشمیر کے حوالے سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے پر مرکوز رہی۔ یہ مضامین ریاست اور ریاست سے باہر کے انگریزی اور اُردو اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ اسی دوران میں نے دریائے جہلم کے حوالے سے کشمیر کی ثقافت، ادب، اساطیر، تاریخ اور معیشت پر Jhelum-The River Through My Backyard کے نام سے انگریزی زبان میں کتاب لکھی جو 2001ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جسے بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی۔ 2008ء میں اس کتاب کا اضافے کے ساتھ ''دیدۂ آبِ رواں'' کے نام سے اُردو ایڈیشن شائع ہوا جس پر مقدر مصنفوں اور کالم نگاروں نے بڑے اچھے تبصرے لکھے۔ اس کتاب کو جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز کی جانب سے سال 2010ء کی ترین اُردو تصنیف کا ایوارڈ ملا۔

مذکورہ کتاب کے لئے تحقیق کے دوران کشمیر کی تاریخ سے میری خاص دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں نے سنجیدگی کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کشمیر کو اگرچہ پانچ ہزار برس کی تاریخ تحریری صورت میں موجود ہونے کا اعزاز حاصل ہے مگر ایک ایسی تاریخ اب تک لکھی نہیں گئی ہے جو شواہد اور حقائق کے حوالے سے علمی جانچ پر کھری اُترے۔ خاص طور پر قدیم اور وسطی دور کی تاریخ کئی لحاظ سے ناقص اور بعض اوقات بعید از حقائق ہے۔ چنانچہ کئی مافوق بڑھاتے رہے ہیں یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ تاریخ کشمیر کے معتبر نمونوں کی اس لحاظ سے اعتباریت مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ ان میں بہت زیادہ مقدار میں دیومالا، افسانہ، تعصب، حقائق سے پردہ پوشی اور مبالغہ جیسی خامیاں موجود ہیں۔ قدیم کشمیر کی تاریخ نویسی میں دیومالا کا بڑا دخل ہے۔ وسطی دور کی تاریخ میں ذاتی تعصب نے بڑی جگہ پالی ہے جبکہ جدید دور کی تاریخ نویسی یا واقعہ نگاری میں مبالغہ آمیزی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا معمول کی بات ہے۔ اِس صورت حال میں ایک صحیح اور شواہد پر پورا اُترنے والی تاریخ کا سامنے آنا ضروری ہے۔

کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے تاریخ دانوں نے اب تک اس طرف توجہ نہیں کی ہے اور کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے ایک مستند مطالعہ ابھی تک پیش نہیں ہوا ہے۔ میری کتاب ''کشمیر متھ آف اے نریٹیو'' (kashmir myth of a narrative) اسی سمت میں ایک کوشش ہے جس کا مقصد کشمیر کی تاریخ پر پڑی گرد صاف کر کے بعض تاریخی واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کرنا ہے۔ یہ کتاب تاریخی کشمیر کے حوالے سے 'تسلیم شدہ' اور مقبول عام بیانیہ کو چیلنج کرتی ہے اور ایسے حقائق کو سامنے لاتی ہے جنہیں یا تو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے یا جن پر تاریخ دانوں کی نظر نہیں پڑی ہے۔ کتاب کشمیر کی تاریخ سے متعلق ایک مستند بیانیہ کی ضرورت اُجاگر کرتی ہے۔

اِس کتاب کے علاوہ کشمیر کی تاریخ کے بعض دلچسپ واقعات پر مشتمل میری ایک اور کتاب 'اے واک تھرو کشمیر ہسٹری (A WALK THROUGH KASHMIR HISTORY) زیرِ ترتیب ہے۔

اُردو میں اگر چہ میں نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن اصل میں میرا امیلان غزل کی طرف ہے اور شاعری میں اِسی صنف کو اپنا وسیلۂ اظہار بناتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی ہے اور شاعری میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ مشاعروں میں شامل نہیں ہوتا ہوں اگر چہ ابتدائی ایام میں کئی آل انڈیا مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ ادبی محفلوں سے کم و بیش دُور رہا ہوں۔ اس دور میں زندگی کے ہر شعبے میں نام نہاد افراد اور انجمنوں نے جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا ہے اور اُنہوں نے ادب کو بھی جس بری لپیٹ لیا ہے اُس سے افسوس ہوتا ہے۔

1980ء کے آس پاس سرینگر میں بعض پرخلوص احباب نے رائیٹرس کلب کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی جس کے ساتھ میں بھی سرگرمی سے وابستہ رہا۔ اس تنظیم نے سرکردہ ادیبوں اور قلمکارں کے ساتھ کئی ادبی مجالس کا اہتمام کیا۔ تنظیم سے وابستہ رفقاء اپنی جیبوں سے اخراجات برداشت کر کے محافل کا انعقاد کرتے تھے۔ بدقسمتی سے احباب کی انفرادی مصروفیات کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

میرا قریبی حلقہ احباب مختصر ہے اگر چہ جان پہچان اور محبت رکھنے والے اصحاب کا دائرہ وسیع تر ہے۔ میرے قریبی دوستوں میں کم و بیش سب نوکری پیشہ ہیں اور اکثر شعر و ادب سے شغف رکھنے والے حضرات ہیں۔ میں جب کوئی نیا شعر یا غزل کہتا ہوں تو اکثر پہلے اُنہیں سناتا ہوں۔ میری غزلیں برصغیر کے اُردو جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اگر چہ میں اپنا کلام کم ہی اشاعت کے لیے بھیجتا ہوں۔

طبیعتاً میں ایک کم گو شخص ہوں اور محفلوں سے کتراتا ہوں۔ میری زندگی کے اِس پہلو سے میرے اکثر دوست نالاں ہیں۔ میں فطرتاً شور شرابہ اور ہاؤ ہو سے دور بھاگتا ہوں۔ میں کوئی متحرک قسم کا Activist نہیں ہوں۔ مختلف موضوعات اور مسائل پر میں اپنے خیالات کا اظہار اپنی تحریروں کے ذریعہ کرتا ہوں جن میں میرے اشعار بھی شامل ہیں۔ میں کسی تنظیم یا تحریک کے ساتھ وابستہ نہیں ہوں۔ مسائل یا موضوعات پر اپنے دوستوں یا ہم خیال اصحاب کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا ہوں یا نظم و نثر کی صورت میں قارئین کے ساتھ۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ خالی اوقات میں اخبارات پڑھتا ہوں، کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں یا ٹیلی ویژن دیکھتا ہوں۔ انٹرنیٹ پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور Surfing بھی میرا شوق ہے۔ فرصت کے لمحات گھر میں گزارنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ خوبصورت مقامات کی سیر کا البتہ بہت شوق ہے اور ایسا کوئی لمحہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ہوں جہاں کسی پُر کشش جگہ جانے کا موقع فراہم ہو۔ اپنے مادرِ وطن کشمیر سے بے پناہ محبت ہے اور اس کی تاریخ کا ایک طالب علم ہوں۔

☆☆

سفرنامہ

☆............ایاز رسول نازکی

# ایران دوست دارم

## (۱)

چوتھے عالمی عرسِ بیدل میں شرکت کرنے کے لئے ایران سے اطلاع موصول ہوئی تو طبیعت خوش ہو اُٹھی۔

چھ سال قبل مارچ 2011ء میں پہلی بار ایران جانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ موقع تھا جشنِ جہانِ نوروز کی تقریبات میں شرکت کا اور اس دورے میں نہایت ہی خوشگوار ساعتیں گزارنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ وہ خوشگوار یادیں سمیٹے کب سے اس انتظار میں تھا کہ پھر وہاں جانا ممکن ہو۔ ایران جس کے بارے میں بزرگوں سے سنا تھا، کتابوں میں پڑھا تھا، خبروں میں آمنا سامنا ہوا تھا۔ پہلی بار قریب سے دیکھنے، ہاتھ بڑھا کر چھونے اور محسوس کرنے کی نوبت آئی تو واقعی ایک تہذیبی اور تمدنی شناخت نے کہیں اندرون میں ایک انگڑائی لی۔ وہاں پہونچنے پر وہی کیفیت کہ کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ۔ اور اپنے بزرگوں کے قدموں کے نشان ڈھونڈھ اور ان گلیوں میں سربسجود گزر کہ جن میں کسی زمانے میں اُن کا گذر ہوا کرتا ہوگا۔ ہم تہذیبی اور تمدنی سطح پر کئی صدیوں تک ایرانِ کبیر سے منسلک رہے، حتی کہ کشمیر کی حسین و جمیل وادی ایرانِ صغیر کے نام سے جانی پہچانی جانے لگی۔ یہاں کی تہذیب و تمدن، ثقافت، روزمرّہ، زبان و ادب، اُٹھنا بیٹھنا، نشست و برخاست، رسوم و رواج، دین، عقیدہ، مذہب، غرض کون سا شعبہ ہے جس پر آج بھی ایرانی تہذیب و تمدن کی چھاپ نہیں؟ ذہنی اور قلبی طور پر کشمیر اور اہلِ کشمیر بڑی دیر تک اور بڑی

دیر سے اسی تہذیب وتمدن کا حصّہ رہے ہیں۔ زمانے نے کروٹ لی اور ایرانِ صغیر اور ایرانِ کبیر کے درمیان ہمارے رشتے کمزور ہوتے چلے گئے اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ ایران کے ساتھ ہماری سب سے مضبوط کڑی یعنی فارسی زبان بھی ہمارے روزمرّہ سے خارج ہوتی گئی اور اس کی جگہ ایک نو آموز، نوعمر زبان یعنی اردو نے لی۔ فارسی تہذیب کی سب سے بڑی سب سے معتبر اور سب سے خوبصورت علامت فارسی زبان ہے۔ یہ زبان اپنی شناخت اور اپنی ہیئت کی بنا پر شاعری اور موسیقی کے لئے دنیا کی سب سے زیادہ موزون زبان ہونے کا دعویٰ پیش کر سکتی ہے۔ اس زبان اور اس کے شعر وادب سے کشمیر میں رہنے والا علمی طبقہ ہر دور میں نہ صرف آشنا رہا بلکہ اس میں اپنی ذہنی اور فکری استعداد کے مطابق کشمیری جامہ وار کی طرز پر گُل بوٹے بھی کاڑھتا رہا۔ شیخ یعقوب صرفی رحمتہ اللہ علیہ، بابا داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ، ملا محسن فانی رحمتہ اللہ علیہ، حبیب اللہ حبی نوشہری اور سب سے بڑھ کے معتبر نام طاہر غنی کشمیری نے فارسی شعر وسخن کا دامن کشمیر کے مہکتے پھولوں سے بھر دیا اور اپنی کاوشوں کی داد بھی پائی۔ کئی صدیوں پر پھیلے ہوئے اس سرمائے نے فارسی کشمیر کا ایک الگ دبستان ترتیب دیا۔ مگر یہ سب داستان پارینہ ہے۔

بات شروع ہوئی میرے سفرِ ایران سے۔ ہمارے ایک عزیز ہیں بے حد ہونہار، نہایت ہی مخلص اور فارسی زبان وادب کے گوہر شناس، ایسے ماہر کہ جنہوں نے اپنی کم عمری میں ہی اس زبان کی تمام باریکیوں پر استادانہ دسترس حاصل کی۔ اہلِ فارس کی مادری زبان فارسی سے بھی شاید بہتر فارسی بولتے لکھتے ہیں۔ یہ نوجوان ہمارے عزیز القدر ڈاکٹر سید اکبر علی شاہ جعفری ہیں۔ ضلع پونچھ اُن کا آبائی وطن ہے، دہلی یونیورسٹی میں فارسی شعبے میں اُستاد ہیں۔ اُن ہی کی وساطت سے مجھے پہلی بار جشنِ جہانِ نوروز میں شرکت کا موقعہ ملا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ جشن کے دوران جو علمی مباحثے ہوں گے اُن میں کشمیر میں نوروز کے عنوان پر بات کروں۔ اس موضوع پر مواد تلاش کرتے کرتے یہ خوش کن بات سامنے آئی کہ ایرانیوں کے ہفت سین اور ہمارے ہاں کشمیری پنڈتوں کے ''نوریہہ'' تقریبات میں ''تھال بُرن'' میں لگ بھگ سو فیصدی مماثلت ہے۔ نوروز اور ہمارے ''نوریہہ'' دونوں روایتیں کسی ایک ہی مشترک روایت سے ارتقاء پذیر ہوئی ہیں۔ جشن میں دنیا کے کونے کونے سے مندوبین مدعو کئے گئے تھے۔ سرکاری وفود کے ساتھ ساتھ عالموں

شاعروں اور فنکاروں کی ایک کہکشاں جمع تھی اور اُن سب میں قدرِ مشترک فارسی زبان اور ایرانی تہذیب وتمدن تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو اُن ملکوں اور علاقوں سے آئے تھے جن ملکوں اور علاقوں میں ایرانی تہذیب وتمدن، فارسی زبان وادب کا دور دورہ رہا تھا یا جہاں آج بھی یہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

دہلی کے ہوائی اڈّے پر دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر رمیش سے ملاقات ہوئی یہ بھی میری طرح عازمِ سفر تھے اور جشنِ نوروز میں شریک ہونے جارہے تھے، دوحہ کے ہوائی اڈّے پر خاصا قیام تھا۔ وہاں سے دوسری فلائٹ میں تہران کے لئے روانہ ہوئے اور شام ہوتے خمینی انٹرنیشنل ہوائی اڈّے پر اُترے۔ جشن کے منتظمین نے ہوائی اڈّے پر باضابطہ استقبال کا اہتمام کیا تھا۔ ایران کی مہکتی چائے کے ساتھ پہلا سابقہ یہاں ایرپورٹ پر ہی پڑا۔ اور یہ سلسلہ پورے قیام کے دوران جاری رہا۔ ایران میں چائے کا رواج عام ہے، آپ جہاں جایئے چائے پایئے۔ کسی دفتر میں وارد ہوں، کسی بڑے شوروم میں داخل ہوں۔ آپ گرما گرم چائے سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں، چائے پھیکی، شکر اور دودھ کے بغیر۔ ایران میں لگ بھگ ہر قسم کی چائے کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایران میں خود چائے کی کاشت بھی خاصے پیمانے پر کی جاتی ہے۔ بزرگوں سے اصفہانی چائے کے بارے سنا تھا۔ کہتے ہیں کہ کشمیر میں 1947ء سے پہلے جو چائے درآمد ہوتی تھی اس میں ایک مقبول برانڈ ''اصفہانی چائے'' کے نام سے مشہور تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ یہ ایران سے آتی تھی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اس زمانے کے مشرقی بنگال (بعد کے مشرقی پاکستان اور حال کے بنگلہ دیش) سے آتی تھی اور آج بھی وہاں ''اسپہانی'' گروپ چائے اور دیگر اشیائے کا کاروبار کرتا ہے۔ بحر حال بات ایران کی چائے کی ہے تو یہ بھی سُن لیں کہ پندرھویں صدی عیسوی تک ایران میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ کافی کا استعمال ہوتا تھا جو دور دراز کے ملکوں سے درآمد کیئے جانے کی وجہ سے کافی مہنگی ہوتی تھی اور عوام الناس کی دسترس سے باہر تھی۔ پندرھویں، سولہویں صدی میں چین نے ایران میں چائے کی برآمدات شروع کیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چائے ایرانیوں کی مقبول ترین مشروبات میں شامل ہوگئی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ایرانیوں نے چائے کی کاشت کے لئے اقدامات اُٹھائے جو بارآور ثابت نہیں ہوئے۔ بالآخر لاہیجان کے شہزادہ محمد رضا نے 1899ء میں چائے کے بارے

میں ایک نہایت ہی دل چسپ اور اہم کارنامہ انجام دیا۔ وہ ایک فرانسیسی مزدور کے بھیس میں کانگڑہ ہندوستان پہونچا۔ ایک چائے کے باغ میں ملازم ہوگیا۔ یہاں وہ چائے کی کاشت اور اس کی پیداوار کے دیگر مراحل سے آگاہ ہوا۔ اُسے معلوم تھا کہ انگریز حکمران کبھی بھی ایران میں چائے کی پیداوار کی حمایت نہیں کریں گے کیوں کہ اس زمانے میں چائے کی بین الاقوامی تجارت پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ شہزادے نے واپس ایران لوٹتے ہوئے تین ہزار ننھے ننھے چائے کے پودے کانگڑہ سے سمگل کیے اور پہلی بار ایران کے علاقے گیلان میں چائے کی باضابطہ کاشت شروع کروادی۔ لاہیجان میں اس چائے کے عاشق شہزادے کا مقبرہ قومی چائے میوزیم کا حصہ ہے۔

ایرانی چائے کی لذیذ چسکیاں لینے کے بعد ہمارا قافلہ ہوٹل کی جانب روانہ ہوا۔ ایرپورٹ شہر سے خاصا دوری پر واقع ہے۔ ایرپورٹ جدید ترین آسائشوں سے لیس ہے۔ راستے میں امام خمینی کی آخری آرام گاہ کی جگمگ کرتی روشنیاں دور سے نظر آتی ہیں۔ شام کا وقت ہونے کی وجہ سے زیادہ تفصیل سے کچھ دیکھنے کی صورت نہ تھی۔ ہاں سارا شہر جگمگاتا نظر آیا۔ جو بھی عمارت دیکھی خوبصورت دیکھی۔ ہوٹل ''ہما'' کے کمرے کی کھڑکی کے باہر کا نظارہ دیکھا تو تہران شہر کے شمالی علاقے میں کوہِ البرز کی ''توچھال'' چوٹی کو برف سے ڈھکا پایا۔ یہ کوہِ تہران شہر کے جیسے نگران کی حیثیت میں قرنوں سے کھڑا ہے۔ کوہِ ''دماوند'' اسی کوہستانی سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ ''البرز'' پہ اپنا ''برزہ'' یاد آجانا لازمی ہے۔ ''برزہ'' یعنی بھوج پتر Papayras جو کشمیر کے بالائی کوہستانوں میں بکثرت پایا جاتا تھا۔ اب شاید دوسری کئی اچھی چیزوں کی طرح یہ بھی معدوم ہے۔ یہ ہمارے ہاں کاغذ کی جگہ استعمال ہوتا تھا اور آج بھی ہمارے ہاں سینکڑوں مخطوطات موجود ہیں جو ''برزے'' پر لکھے گئے تھے۔ ''برزہ'' اس کے علاوہ مکانوں کی چھتیں بنانے کے کام آتا تھا۔ اس کی تہہ بہ تہہ بٹھادی جاتی تھی اور اس پر مٹی اور گارے کی پرتیں بارشوں سے محفوظ رکھنے میں مددگار ثابت ہوتیں۔ آج بھی کہیں کہیں کم کم ایسی پرانی عمارتیں شاید نظر آئیں جن پر ''بُرزہ پش'' یا بُرزے کی چھت موجود ہو۔ ان چھتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بہار آتے ہی اس مٹی کے چھت پر گلِ لالہ کھِل اُٹھتا اور شہر میں وارد ہونے والے اجنبی چھتوں پر آتشِ گل دیکھ کر واقعی آگ سمجھ کر پریشان ہو اُٹھتا۔ بحرکیف کیا ہمارا ''برزہ'' اور ''البرز'' کا کوہستانی سلسلہ کہیں نہ کہیں آپس میں ملے

ہوئے ہیں۔ ''برز'' لفظ کے ڈانڈے سنسکرت کے ''بریت'' سے بھی ملتے ہیں اور ہو نہ ہو دونوں یعنی ''البرز'' اور کشمیری ''برزہ'' ایک ہی بنیادی روایت کے حامل ہوں۔

جشنِ جہانِ نوروز کی افتتاحی تقریب کوئی گیارہ بجے طے تھی اور اس میں شرکت کے لئے ہمیں ہوٹل سے ''بُنیا دِرُدکی'' پہونچایا گیا۔ اس مختصر سے سفر کے دوران تہران کی سڑکوں پر دائیں بائیں عظیم الشان عمارتیں دیکھنے کا موقع ملا۔ پہلی ہی نظر میں اس شہر سے عشق ہو گیا۔ یہ شہر شہرِ جمال ہے۔ ہر طرف خوبصورت منقش درو دیوار ہیں، ہر ایک ذرے پر فارسی تہذیب اپنی تمام تر جمال آرائیوں کے ساتھ جلوہ ساماں ہے۔ یہ مانی کی مصوّری کا شہکار ہے۔ یہ بہزاد کے مؤقلم کا اعجاز ہے، یہ خیام کی رباعی کی مسحور کن فضا ہے، یہ سعدیؔ، رومیؔ، حافظؔ، ردکیؔ، فردوسیؔ کے نطق بے بہا کا کرشمہ ہے۔ تہران ایک غزل ہے یا مثنوی، یہ فارسی شاعری کا مجسم ہے۔ یہ فارسی موسیقی کی متکلم ہے۔ کسی نے پوچھا آپ کو تہران کیسا لگا؟ پہلے دن کے مشاہدات کی بنا پر میں نے کہا تھا ''تہران تہذیب ہے''۔ دوسرے دن کے تجربات کی بنا پر میں نے اپنے کہے میں ترمیم کی تھی۔ ''تہران شاعری ہے'' اور واقعی تہران سرتاپا شعر ہے۔ خوبصورت مرصع، مرقع۔

افتتاحی تقریب کے لئے ایک عظیم الشان ہال سجا سجایا ہوا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ انتظامات بے حد معقول تھے۔ اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد میں نے ہال کا جائزہ لیا تو سٹیج کے دائیں بائیں امام خمینی اور اُن کے جانشین خامنائی کی تصویریں نمایاں نظر آئیں۔ میرے بغل میں ایک نہایت ہی خوبصورت ایرانی نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ ایرانی واقعی بے حد خوبصورت لوگ ہیں اور اُن کی کشمیریوں کے ساتھی یہ بات مشترک ہے۔ نوجوان نے سلام کہہ کر گفتگو کا آغاز کیا۔ میں نے جواب دیا اس کے ساتھ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے اور آج ایم ڈی کر رہا ہے۔ ایران میں سلام کا رواج عام ہے۔ آپ لفٹ میں ہوں ہر نیا مسافر سلام کرے گا۔ شناشا ہو، اجنبی ہو سلام کی کوئی قید نہیں۔ سلام کے ساتھ ہونٹوں پر ایک تبسم۔ اسے تمدن کہتے ہیں اور ہر تہذیب یافتہ قوم میں ایسی باتیں عام ہوتی ہین۔ میں نوجوان سے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں گفتگو جاری رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میری پریشانی دور کرتے ہوئے کہا وہ انگریزی جانتا ہے۔ اور اس طرح ہم انگریزی میں گفتگو کرنے لگے۔ اسٹیج سے اعلان ہوا کہ صدرِ

مملکت ڈاکٹر احمدی نژاد تشریف لا رہے ہیں۔ لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ صدر صاحب اپنی نشست پر پہونچ گئے اور ایران کا قومی ترانہ شروع ہوا۔ ترانہ مکمل ہوا۔ سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور کاروائی آگے بڑھی۔ ایران میں ہر تقریب کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہوتا ہے۔ ہر موقع پر قرآن مجید کا نسخہ موجود رہتا ہے۔ آپ مقالہ پیش کر رہے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ڈائس پر پہلے ہی آپ کے سامنے قرآن مجید کا نسخہ موجود ہے۔ قرآن پاک کو ہر سعی میں شاملِ حال رکھنا ظاہر ہے باعثِ خیر و برکت ہے اور ساتھ ہی مانع کذب و افترا بھی۔

قرآنِ پاک کی تلاوت کے بعد تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا، آخر کار صدرِ ایران کو قریب سے دیکھنے سننے کی نوبت آ گئی۔ اُنہوں نے کوئی بیس پچیس منٹ تک نہایت ہی موثر انداز میں تقریر کی، اُن کی تقریر کا انداز بے حد خوبصورت تھا۔ وہ وقفے وقفے سے فارسی زبان کے اشعار برمحل استعمال کر رہے تھے۔ اُن کے سامنے کوئی متن نہیں تھا۔ ان کی تقریر کا جو میں لبِ لباب سمجھ پایا وہ یہی تھا کہ ثقافت اور تمدن کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں۔ تمام دُنیا کے لئے مناسب یہی ہے کہ اختلافات کو ختم کیا جائے اور انسانی اقدار کی مشترکہ وراثت کو عام کیا جائے۔

پروگرام کے اگلے حصّے میں ایک رنگا رنگ تمدنی پروگرام پیش کیا گیا۔ اس میں تمام ایرانِ کبیر سے آئے ہوئے موسیقاروں نے اپنے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ ایران، افغانستان، آذر بائیجان، قزاقستان، تاجکستان، پاکستان، ہندوستان وغیرہ ممالک کی موسیقی کے شاندار نمونے پیش ہوئے۔ کئی ممالک کے روایتی رقص بھی شامل تھے۔ تہران کی اپنی آرکسٹرا نے سماں باندھا۔ یہ بین المملکی رقص و نغمہ کا مظاہرہ دیکھنے سُننے کئی بار احساس ہوا کہ جیسے میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرانے والی موسیقی کی لہریں اس قدر جانی پہچانی تھیں کہ ''چھکر'' کا گمان ہونے لگا۔ یا اسی طرح کئی بار کسی سُر اور تال میں اپنی صوفیانہ موسیقی کی جڑیں پیوست نظر آئیں۔ کشمیر کی موسیقی بنیادی طور پر ایک شاندار امتزاج کی مرہونِ منت ہے۔ اس میں خود اپنی قدیم مقامی موسیقی کی روایتیں موجود ہیں اور پھر وسطِ ایشیا سے آنے والی موسیقی کی لہریں اس میں شامل ہوتی گئیں۔ اور نتیجتاً ہمارے پاس جو روایتی موسیقی کا دبستان ہے وہ ہزار بلبلوں کے چہکنے پر مشتمل گلستان ہے اور اس سارے عظیم ترخطے کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پل بھر کو اپنے اجنبی ہونے کا احساس

جاتا رہا۔ اس موسیقی میں اپنا ماضی گنگناتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ الگ بات کہ اس تہذیب کے ساتھ جوڑنے والی سب سے مضبوط کڑی فارسی زبان اب ہماری دسترس میں نہیں تھی۔ پھر بھی موسیقی چونکہ سماعتوں سے زیادہ دلوں کی زبان ہے اس لئے وہ رشتہ ابھی محفوظ دکھائی دیا۔ اس جشنِ جہان نوروز کے دیگر پروگراموں میں اس عظیم تر ایران کی ثقافت کراجاگر کرنے کے لئے ایک نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس میں تمام ملکوں کے تہذیبی اور تمدنی علامات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ منتظمین نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں کشمیر کے روایتی لباس کے چند نمونے ساتھ لاؤں اور میں کشمیری پھیرن کے کچھ نمونے، کچھ شال، کچھ پیپر ماشی وغیرہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان تمام نمونہ جات کو نمایاں طور پر نمایش میں رکھا گیا۔ اس نمائش کو دیکھ کر پھر وہی احساس ہوا کہ ثقافتیں ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک قوم سے دوسری قوم تک منتقل ہوتی رہتی ہیں اور اپنی ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہوئی نشوونما پا لیتی ہیں۔ انسانی سماج بنیادی طور پر ایک ہی اکائی ہے اور اسے خانوں میں بانٹنا بے سود ہی نہیں ضرر رساں بھی ہے۔ اور اگر ان ثقافتوں کی وحدت کا اندازہ کرنا ہو تو مختلف ملکوں اور ان میں بود و باش کرنے والے انسانی سماجوں کی ثقافتوں کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے اور باہمی مشترکہ علامتوں کی نشاندہی کرنی چاہیے۔

جشن کے دوسرے روز پہلی نشست علمی اور ادبی نشست تھی۔ اس میں مختلف ملکوں سے آئے ہوئے عالم، فاضل، شاعر حضرات اپنے اپنے مقالات اور اشعار پیش کرنے والے تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ خالص علمی اور ادبی بحث و تمحیص ہوگی اور ظاہر ہے کہ اس نشست میں زیادہ لوگوں کی آمد بھی متوقع نہیں تھی۔ VVIP کی آمد کی توقع بھی نہیں تھی۔ سیکورٹی کے انتظامات بھی خاص نہیں تھے۔ پہلے روز افتتاحی تقریب میں کیمرے وغیرہ لینے کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ دس بارہ ملکوں کے سربراہانِ مملکت یا اُن کے نمائندے اس میں شریک تھے۔ ان میں حکومتِ ہند کی نمائندگی مرکزی کابینہ وزیر غلام نبی آزاد کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے روز ماحول Relaxed تھا۔ ہم ''بنیاد ردکی'' کے ہال میں وارد ہوئے۔ میرے ہمراہ پاکستان سے ''فردوسی نشست'' کے پروفیسر آفتاب اور کیرالہ سے آئے پروفیسر علی تھے۔ آفتاب صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک، پنجابی الاصل ہونے کے باوجود بے حد شستہ اردو اور فارسی بولتے تھے۔ نہایت ہی خوش اخلاق، وجیہ

اور خوبصورت انسان میرے اور اُن کے درمیان نہایت ہی گرم جوشی کی فضا قائم ہوئی۔ ہم ہال میں پہونچے تو ہم تیسری قطار میں جا کے بیٹھ گئے اگر چہ ہمارے سامنے والی نشستیں ابھی خالی پڑی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں دیگر احباب بھی آ گئے اور ہال بھرنے لگا، ہم آپس میں محو گفتگو تھے کہ دو افراد ہمارے پاس آئے اور ہم تینوں سے گذارش کی کہ ہم پہلی صف میں خالی نشستوں پر منتقل ہو جائیں۔ ہم نے معذرت کی تو اُنھوں نے پھر درخواست کی۔ بحر کیف ہم تینوں اشخاص اُٹھے اور اُن کے پیچھے چل دیئے۔ اُنھوں نے ہمیں پہلی صف میں لگ بھگ درمیان میں بٹھا دیا۔ ساتھ والی دو خالی نشستوں پر وہ خود بیٹھ گئے۔ پروگرام شروع ہونے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر اپنے بائیں گئی۔ ایک لمحے کے لئے یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ جو شخص ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہماری جانب آ رہا تھا۔ بنا کسی پروٹوکول، بنا کسی تام جام اور کروفر اپنے مست مولا انداز میں کوئی اور نہیں بلکہ صدرِ ایران ڈاکٹر احمدی نژاد تھا۔ اُن کے ساتھ صرف ایک اور ساتھی تھا۔ آن کی آن میں وہ ہمارے پاس پہونچ گئے۔ ہم جھٹ سے کھڑے ہو گئے وہ آگے بڑھے، اُنھوں نے یکے بعد دیگرے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا۔ میری باری آئی تو میں نے سلام کے بعد کہہ دیا کہ میں کشمیر سے آیا ہوں۔ اُنھوں نے بھرپور مسکراہٹ سے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ گلے لگایا اور کہا:

"شما درقلبِ ما ہستین"

(آپ ہمارے دل میں رہتے ہیں)

یہ ایک انمول لمحہ تھا۔ خیر اس کے ساتھ ہی قومی ترانہ شروع ہوا۔ ہم سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اب صدر احمدی نژاد اور میرے درمیان صرف دو نشستوں کا فاصلہ تھا اور اُن پر صدر صاحب کے ساتھ پروفیسر علی اور پھر پروفیسر آفتاب تھے۔ میرے ہاتھ میں میرا موبائل تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اُن کی تصویر اُتارنے کی کوشش کی، اُنھوں نے دیکھا ہاتھ اُٹھایا اور سیلوٹ کے انداز میں میری طرف دیکھ کر انتظار کیا کہ میں آرام سے تصویر لوں۔ میں نے تصویر لی اور یہ اس یادگار لمحے کو کیمرے میں قید کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ اُن کے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح ہے اور وہ اس پر ورد کئے جا رہے ہیں۔ میں نے اُن کی تسبیح کے ساتھ تصویر لینے کی ٹھان لی، وہ بھانپ گئے۔ جونہی تصویر لینے کی کوشش کرتا وہ تسبیح کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتے۔ بحر حال یہ آنکھ مچولی جاری

رہی اور بالآخر میں اُن کی تسبیح کی تصویر لینے میں کامیاب ہوا۔ وہ یہ بھی بھانپ گئے اور ایک بھرپور مسکراہٹ سے میری کاوشوں کی داد دی۔

جشنِ جہان نوروز کی آخری تقریب میں کچھ مخصوص مندوبین سے گزارش کی گئی کہ وہ جشن کے بارے میں اپنے دورۂ تہران کے بارے میں یا اپنے ملک کے بارے میں کسی بھی متعلقہ موضوع کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ آپ فارسی میں بول سکتے تو ٹھیک ورنہ آپ انگریزی میں بول لیں اور اس کا ترجمہ ہونے کی سہولت بھی دستیاب تھی۔ اب جب میری باری آئی تو میں نے انگریزی زبان میں نہایت مختصر الفاظ میں منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے بعد کشمیر کی فارسی تہذیبی روایت کے ثبوت پیش کیے جس سے فارسی دُنیا واقف نہیں۔ اس ضمن میں میں نے والد محترم غلام رسول نازکی کی وہ غزل جو سوویت روس کے فارسی شاعری کے عالمی انتخاب میں شامل ہوئی تھی، پڑھ کر سنائی۔

از تو قائم گرمیٔ ہنگامۂ بود و نبود — خیز و کم کن شکوہ ہائے گردشِ چرخِ کبود
روزگارے در خم ابروئے دلبر باختم — زاں سبب پیش خداوندے نیاوردم سجود
مرغکے دیشب بگلزارے بشاخے می سرود — شاہدِ گل را ثباتے نیست دل دادن چہ سود
ہر کہ را حُسنے عطا کردند او قانش کم است — بُلبل از گل گل ز شبنم، شبنم از انجم شنود
جنتِ کشمیر را نازم کہ حسنِ ایں دیار — عشوہ کرد و دلِ ایرانیان باخود ربود

(میر غلام رسول نازکی)

جمالِ یار را دیدم درین گلزار می رقصم — چہ باشد گل کہ از مستی سرِ ہر خار می رقصم
خریدارِ غمِ عشقم سرِ سودائے او دارم — گرفتہ نقد برکف برسرِ بازار می رقصم
سماع غیر رقصاند مرا اے بینوا ہر دم — نہ از چنگ و نہ از بربط نہ موسیقار می رقصم

(عبدالرشید بینوا کشمیری)

دونوں غزلوں پر نہایت داد و تحسین ملی، ہاں میرے دوست پروفیسر آفتاب نے کہا کہ یہ جو آپ نے بے نوا کشمیری کو اشعار منسوب کر رہے ہیں وہ عثمانِ ہارونی کے ہیں۔ میں اس سے پہلے سے واقف تھا اور کچھ عرصہ پیشتر بے نوا کشمیری کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے یہ

مسئلہ سامنے آیا تھا۔ میں نے دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ میں حضرت عثمانی ہارونی کے دیوار پر کندہ اشعار کی نقل حاصل کی تھی اور پھر اُن کے اشعار اور بے نوا کے اشعار کا مقابلہ کیا تھا۔ اور صاف ظاہر تھا کہ گو دونوں غزلیں ایک ہی بحر، ردیف، قافیے میں ہیں مگر اشعار بالکل جدا ہیں۔ میں نے آفتاب صاحب کو عثمان ہارونی کے اشعار بھی سنائے اور اس طرح وہ قایل ہو گئے۔ حضرت عثمان ہارونی کے اشعار یہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم | مگر نازم باین ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم |
| تو ہر دم می سرائی نغمہ و ہر بار می رقصم | بہر طرزِ کہ رقصانی منم اے یار می رقصم |
| سراپا برسراپائے خودم از بے خودی قربان | بگردِ مرکز خود صورتِ پرکار می رقصم |
| خوشا رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را | زہے تقویٰ کہ من باجبّہ و دستار می رقصم |
| مرا طعنہ مزن اے مدعی طرزِ ادائیم بین | منم رندی خراباتی سرِ بازار می رقصم |
| تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خونِ من ریزی | من آن بسمل کہ زیرِ خنجر خونخوار می رقصم |
| بیا جانان تماشا کن کہ درانبوہِ جانبازان | بہ صد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم |
| اگر چہ قطرہ شبنم نپوئید برسرِ خارے | منم آں قطرۂ شبنم بنوکِ خار می رقصم |
| کہ عشقِ دوست ہر ساعت دروں نار می رقصم | گہے برخاک می غلتم، گہے برخار می رقصم |
| منم عثمانِ ہارونی کہ یارے شیخ منصورم | ملامت می کند خلقے و من، بردار می رقصم |

تہران میں پانچ روزہ قیام کے دوران ہم نے کئی اہم مقامات کا دورہ کیا۔ تہران میں نوروز کی تقریبات کا نزدیک سے مشاہدہ کیا۔ ہر چوراہے پر، ہر احاطے میں، ہر عمارت کے اندر ''ہفت سین'' سجا دیکھا، اور اس سجاوٹ میں نت نئے طریقے نظر آئے۔ سات اشیاء ایسی ہیں کہ جن کے نام ''س'' سے شروع ہوتے ہیں، نوروز کی روایات میں شامل ہیں۔ اُن سات اشیاء جن میں عام طور پر سیب، سبز گھاس، سرکہ، سمنو (گندم سے تیار کی ہوئی غذا)، سنجد، سکہ اور سماق شامل ہیں۔ یہ دراصل آنے والے سال میں نیک بختی اور خوش حالی کی نوید کے طور پر شامل کی جاتی ہیں اور یہ علامتیں ہیں سچ کی، انصاف کی، مثبت سوچ کی، خوش قسمتی، خوش حالی، سخاوت اور بقا کی۔ ان تمام اشیاء کو ایک میز پر سجایا جاتا ہے جسے ''سوفرے'' کہتے ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ شمعیں، آئینہ اور

قرآن پاک بھی اس میز کی زینت بنتے ہیں۔ میں نے کئی جگہوں پر مثنوی مولانا رومی، گلستانِ سعدی جیسی کتابیں بھی ''ہفت سین'' کے ساتھ دیکھیں۔ جیسا کہ آغاز میں بیان ہوا، ایرانی نوروز کی بازگشت کشمیر نوریہہ تقریبات کے انعقاد میں ملتی ہے۔ سوفرے ''ہفت سین'' اگر چہ بڑے پیمانے پر ایک بڑی میز پر سجایا جاتا ہے۔ نوریہہ کے دوران کشمیری پنڈتوں کے ہاں ایک تھال سجایا جاتا ہے جو عموماً پیتل کا ہوتا ہے۔ اس میں دھان کے چند دانے، روٹی کا ٹکڑا، ایک پیالی دہی، تھوڑا نمک، تھوڑی چینی، چند اخروٹ، چاندی کا ایک سکہ، قلم، آئینہ پھول، نئے سال کی جنتری رکھ دیئے جاتے ہیں۔

ایران کے معزول شُدہ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے شاہی محلات سعد آباد ایک خوبصورت علاقے میں واقع ہیں۔ اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کے نتیجے میں ایران کے شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا تھا اور شہنشاہِ ایران ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اُن کے ذاتی محلات کے ساتھ کسی قسم کی دست درازی نہیں کی گئی۔ ملک میں حالات نارمل ہوتے ہی ان محلات کو میوزیم کا درجہ دیا گیا اور انہیں عوام الناس کے لئے کھول دیا گیا۔ محلات کو جوں کی توں حالت کو قائم رکھا گیا ہے۔ شاہِ ایران کے ذاتی محل میں اُن کے تمام کمرے استعمال کی چیزیں اپنی اصلی حالت میں موجود پاکر کچھ کچھ حیرت ہوئی ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ نئی حکومتیں پرانی سلطنتوں کے تمام نشانات اور آثار مٹا دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہیں۔ لیکن یہاں غالب عنصر ایرانی تہذیب وتمدن اور تاریخ سے وابستہ علامتوں کا تحفظ دکھائی دیا۔

معزول شاہ کی سٹیڈی میں ایک کونے میں لگی میز پر شاہ کی کئی محبوب ہستیوں کی تصاویر فریموں میں سجی ہیں۔ ان میں پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو اور چین کے ماؤزی تنگ بھی شامل ہیں۔ شاہ محل کی دیواروں پر دنیا بھر کے نامی گرامی مصوروں کی بیش قیمت تصویریں آویزاں ہیں۔ ایرانی ریشمی قالینوں کے اعلیٰ نمونے فرش پر بچھے ہوئے ہیں۔ محل کے باہر شاہ کے استعمال کی گاڑیاں، موٹر بائیک، اُن کے بچوں کی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں اپنی اصل حالت میں گیرج میں چمکتی دمکتی نظر آتی ہیں۔ یہ وسیع وعریض احاطہ شہر سے تھوڑی دوری پر ایک بالائی علاقے میں واقع گھنے درختوں کی وجہ سے گھنے جنگل کا تاثر دیتا ہے۔ یہاں شاہ کے اپنے محل کے علاوہ اُن کی بہن شہزادی کا محل بھی ہے۔ اُن محلات کی ایک بات یہ بھی ہے کہ باہر سے یہ کسی شان وشوکت کا خاص مظاہرہ

نہیں کرتے ۔زیادہ تر مغربی طرزِ تعمیر کے تابع دکھائی دیتے ہیں ۔ان میں مشرقی طرز کے منقش درو دیوار، بام ومحراب نظر نہیں آتے ۔

صحن میں کئی جگہ قدیم طرز کی لائٹنگ کے نمونے بکھرے پڑے ہیں کل ملا کر ان محلات کا دورہ کرنے کے بعد اس بات کا احساس اور شدید ہوتا ہے کہ جب وقت اپنی چال بدلتا ہے، آنکھیں پھیرتا ہے تو طاقتور سے طاقتور سلطنتیں تاش کے پتوں کی طرح بکھر جاتی ہیں ۔خود کو عظیم ترین شہنشاہ کہلانے والا شاہِ ایران جو اپنے آپ کو پانچ ہزار سالہ آریائی تہذیب کا نگران اور وارث اعلیٰ گردانتا تھا اور ''آریہ مہر'' کے عالمی لقب کو اپنے لئے پسند کرتا تھا آنِ واحد میں دُنیا کی بساط پر ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح بے دخل ہو گیا۔شاہ نے انقلابِ ایران سے قبل اپنے جاہ وجلال کے دور میں ''آریامہر'' کے حوالے سے پانچ ہزار سالہ تقریبات نہایت ہی وسیع ،نہایت ہی شاندار پیمانے پر منائی تھیں ۔اسی دوران ایک تقریب داریوش کے مقبرے پر ہوئی ۔ایران میں ایک لطیفہ اس سلسلے میں عام ہے کہ داریوش کے مقبرے کے سامنے ہزاروں لوگوں کے ساتھ جب شہنشاہِ ایران حاضر ہوا تو اس نے قبر میں سوئے داریوش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''داریوش خوش رہو کہ تمہاری سلطنت اور تمہاری قوم محفوظ ہے''

اور اس کے جواب میں داریوش اپنی قبر میں کھڑا ہو گیا اور شہنشاہِ ایران کے حضور کورنش بجا کر کہا ''متشکرم'' اور کہہ کر واپس اپنی قبر میں لیٹ گیا۔

----------

ایک دن ہم یعنی پروفیسر آفتاب ، پروفیسر علی اور میں ایک ''ماشین'' یعنی گاڑی لے کر تہران کی سیر کو نکل گئے ۔

آفتاب کافی عرصے تک تہران میں رہے تھے اور اس لئے وہ شہر کے جغرافیہ سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ڈرائیور کو راستہ سمجھاتے رہے اور تہران کے مختلف لینڈ مارکس کی جانکاری دیتے رہے۔ایک بات جو میں پہلے بھی محسوس کر چکا تھا وہ شہر کے اس دورے کے دوران اور زیادہ کھل کر سامنے آئی ۔وہ یہ کہ ایرانیوں نے اپنی ثقافت ،اپنے تمدن سے ایک بے حد مضبوط رشتہ بنائے رکھا ہے اور اس کی سب سے بڑی اور واضع علامت زبان ہے ۔اپنی خوبصورت زبان کی دو ذیلی علامتیں

ہیں جو وہ سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ ایک فارسی شاعری اور دوسرے فارسی خطاطی، یہ وہ دوفنونِ لطیفہ ہیں کہ جن کے بغیر ایران کی سماجی اور ثقافتی شخصیت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آپ اگر بات کرتے کرتے اپنے ٹیکسی ڈرائیور سے شیخ سعدی، حافظ یا رُدکی کے اشعار سنیں تو حیران نہ ہوں ۔ یہ تمام شعرا ایران کے روزمرہ میں رچ بس گئے ہیں۔ ان کے قدِ آدم سے دس گنا اونچے مجسمے جابجا چوراہوں پر اور پبلک پارکوں میں نظر آتے ہیں۔ ان شخصیات کا احترام کیا جاتا ہے۔ ان کی عزت کی جاتی ہے۔ شاعر معزز ہے، خطاط محترم ہے اور اسی لئے ہر نقش بر دیوار شعر فارسی ہے۔ استاد خطاط آقائی غلام حسین امیر خانی کو لگ بھگ کابینہ وزیر کا درجہ حاصل ہے اور وہ کوئی سرکاری تقریب نہیں کہ جس کی تزئین کاری میں اُن کے ہاتھوں کے خطاطی کے نمونے شامل نہ ہوں۔ اسی طرح شاعروں کی پذیرائی ہوتی ہے۔ ملک الشعرا، سید الشعراء ورئیس الشعراء جیسے القاب آج بھی رائج ہیں۔

اپنے پہلے سفرِ ایران کا ذکر کرتے ہوئے دو اور باتوں کا تذکرہ ضروری ہے اوّل یہ کہ جشنِ جہانِ نوروز میں مختلف ملکوں سے آئے ہوئے مندوب حضرات کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور اُن ملکوں کے علمی اور ثقافتی امور پر تبصرے ہوئے۔ ان میں خاص طور پر ماسکو کی اکادمی آف سائنسز میں کام کرنے والے ڈاکٹر رستم شکوراوٗ قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر رستم وسطِ ایشیاء کی تہذیبوں، ثقافتوں اور تاریخ کے نامور ماہر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ تاریخ کے حوالے سے باریک سے باریک اطلاع سے باخبر ہیں اور ان جملہ امور میں ایک اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہماری پہلی ہی ملاقاتوں میں ایک قربت اور انس کا احساس ہوا۔ آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رستم روسی نہیں ہیں بلکہ بخارا شریف سے ہیں۔ ان کے والد محترم ڈاکٹر جان شکوری اس زمانے میں خود تاجکستان دوشنبہ میں رہتے تھے۔ ایک اعلیٰ درجے کے عالم فاضل تھے اور کئی کتابوں کے مصنف، استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر رستم نے اپنے خاندانی پسِ منظر کا ذکر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ اُن کے دادا ''صدر ضیا'' اماراتِ بخارا کے آخری قاضی القضاۃ تھے۔ روسی انقلاب سے قبل بخارا ایک آزاد اور خود مختار امارات کا درجہ رکھتا تھا اور یہاں کی حکومت کا سربراہ ''امیر'' کہلاتا تھا۔ سربراہِ مملکت کے ہم پلہ ''قاضی'' کا عہدہ ہوتا تھا جسے ''صدر'' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رستم کے دادا محمد شریف ''صدر ضیا'' روسی انقلاب کے دنوں میں قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ انقلاب کے

دوران بخارا تاخت وتاراج ہوا۔ ملک لُٹ گیا۔ ''صدر ضیا'' کو کچھ دنوں تک اپنے عہدے پر برقرار رکھا گیا۔ پھر ہٹایا گیا۔ وہ گرفتار کئے گئے، اُن کے رہائشی مکانات بشمولہ ان کی عظیم الشان لائبریری میں آگ لگا دی گئی۔ ''صدر ضیا'' زندان خانے میں اپنی زندگی کے آخری دن گذارنے پر مجبور ہوگئے۔ اُنہوں نے انقلاب سے پہلے ایک یادداشت ''روز نامہ'' کے عنوان سے قلمبند کی تھی۔ اس میں اپنی زندگی، اپنے خاندانی حالات وواقعات اور امارات میں ہونے والے سیاسی نشیب وفراز نیز دیگر سماجی امور کا تفصیلی تذکرہ تھا۔ یہ مسودہ بھی باقی کتابوں کی طرح نذرِ آتش ہوگیا۔ صدر ضیا کو اس بات سے بے حد دُکھ ہوا۔ اُنہوں نے اپنی یادداشت کے بل پر زندان خانے میں بیٹھے بیٹھے اس ''روز نامے'' کو از سرِ نو تحریر کیا۔ وہ کسی طرح اس نئے مسودے کو قید خانے کے باہر کسی مداح تک پہونچانے میں کامیاب ہوگئے۔ ڈاکٹر رستم شکوراؤ نے اس نسخے کا انگریزی ترجمہ کیا اور ''ڈائری آف بخارا انٹلکچول'' کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی اور اس دور کی تاریخ کے حوالے سے ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل کر گئی۔

ایک شام ہوٹل کی لابی میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ڈاکٹر رستم نے کہا کہ اُن کے پاس ایک کشمیری پیپر ماشی کا قلمدان موجود ہے۔ میں نے تفصیلات پوچھیں تو انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر رستم کے دادا یعنی قاضی القضاۃ ''صدر ضیا'' کو ان کے والد جو خود بھی قاضی کے عہدے پر رہے تھے، نے ایک کشمیری قلمدان تحفے میں دیا تھا۔ صدر ضیا اس قلمدان کو اپنے والد کی نشانی کے طور پر اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ انقلاب روس کے دوران جب صدر ضیا سے سب کچھ چھن گیا وہ یہ قلمدان ضائع ہونے سے بچانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس افراتفری کے عالم میں ان کا خاندان جس میں اُن کا اکلوتا فرزند (ڈاکٹر جان محمد شکوری) اُن سے بچھڑ گیا تھا۔ ملنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کوئی بچ بھی پایا یا نہیں۔ بحر حال انہوں نے قید خانے میں اپنی وفات سے پہلے یہ قلمدان اپنے ایک مداح کے حوالے کیا اس وصیت کے ساتھ کہ وہ اسے سنبھال کر رکھے اور جب بھی ممکن ہوا اس کے فرزند محمد جان شکوری تک پہونچا دے۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھئیے کہ اماراتِ بخارا کے سیاہ وسفید کے مالک صدر ضیا کی وفات جیل خانے میں Typhus کی بیماری سے ہوئی۔ اور انہیں جیل میں ہی سپردِ خاک کیا گیا۔

صدر ضیا کی وفات کے بعد کئی دہائیاں گذر گئیں۔ ایک روز تاجک محکمۂ ثقافت کے کچھ کارندے بخارا کے دیہات میں آثارِ قدیمہ کی کھوج میں مصروف تھے۔ ان کے ایک فیلڈ وزٹ کے دوران ایک بزرگ اُن کے پاس آیا اور اُن سے محمد جان شکوری کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ خوش قسمتی سے اس ٹیم کے افراد محمد جان شکوری سے واقف تھے کیوں کہ محمد جان شکوری اب تاجکستان کے جانے پہچانے محقق اور ادیب بن چکے تھے۔ بزرگ نے ان سے التجاء کی کہ محمد جان تک ان کے والد کی امانت پہونچائی جائے۔ ٹیم لیڈر نے حامی بھری، بزرگ واپس اپنے گھر گئے اور وہاں سے سات پردوں میں لپٹا لپٹایا قلمدان لے کر لوٹے اور اُن کے حوالے کر گئے۔ یہ قلمدان اس طرح اپنے اصلی وارث ڈاکٹر محمد جان شکوری کے پاس پہونچ گیا اور آج کل ڈاکٹر محمد جان شکوری کے دوسرے صاحبزادے جو انگلینڈ میں رہتے ہیں، کے پاس موجود ہے۔ میں نے ڈاکٹر رستم شکوراؤ سے درخواست کی کہ وہ اس قلمدان کی چند تصاویر منگوانے کا انتظام کریں۔ کچھ مدت کے بعد اُنہوں نے ازراہِ کرم اس قلمدان کی کئی تصاویر مجھے بھجوائیں۔ ان کو دیکھ کر قلمدان کے بارے میں اور بھی تفصیلات سامنے آئیں، قلمدان کے کشمیری کاریگر نے یہ خوبصورت شعر بھی قلمدان کے ماتھے پر کندہ کیا تھا۔ اور ساتھ ہی قلمدان بنانے کی تاریخ بھی ثبت کر دی۔

قلم بر کفِ مردِ نیکو خصال
کلیدیست بر فتح بابِ کمال

ڈاکٹر رستم نے اطلاع دی کہ 1276ھ کا سال 31/جولائی 1859ء 19/جولائی 1860ء کے مطابق تھا۔ محمد شریف صدر ضیا کی پیدائش 1865ء عیسوی میں ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کی پیدائش سے پانچ سال قبل یہ قلمدان بنایا گیا۔ یہ کب اور کیسے اُن کے والد نے حاصل کیا اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا مگر یہ بات بھی دھیان میں رکھی جانی چاہیے کہ اس دور میں کشمیر اور بخارا شریف کے درمیان تجارتی روابط استوار تھے۔ عین ممکن ہے کہ یہ قلمدان کشمیر کے دیگر مصنوعات کے ساتھ بخارا درآمد کیا گیا تھا جہاں صدر ضیا کے والد نے اُسے خرید لیا اور وقت آنے پر اپنے فرزند کو تحفے میں دے دیا۔

ڈاکٹر رستم شکوراو سے میں نے کہا کہ ہمارے آباؤاجداد بھی بخارا شریف سے تھے اور

سلطان زین العابدین بڈشاہ 1420ء تا 1470ء عیسوی کے دورِ حکومت میں کشمیر میں ہمارے مورث اعلیٰ حضرت سید علی بخاری تشریف لائے تھے اور بڈشاہ کی حکومت میں قاضی القضاء کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کئی پیڑیوں تک قاضی کا منصب ہمارے خاندان میں رہا۔ ڈاکٹر یہ سُن کر چونک اُٹھے۔ اُنہوں نے کہا بخارا میں قاضی کا منصب اُن کے خاندان میں نسل در نسل چلا آرہا تھا اور اغلب امکان یہی ہے کہ سید علی بخاری ان ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا کہ روسی انقلاب کے دوران جو تباہی اور بربادی مسلط کی گئی اس کی زد میں بخارا کے تمام کتب خانے آگئے تھے۔ اور اس طرح ذاتی اور خاندانی تواریخ حرفِ غلط کی طرح مٹا دی گئی تھیں۔ آج چاہیں بھی تو کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔ بہرحال ڈاکٹر رستم شکورا و میری حضرت سید علی بخاری کے بارے میں اطلاعات جاننے کے بعد مجھے بھائی کہہ کر پکارنے لگے۔

قیامِ تہران کے دوران ایک اور بات کا انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ مغربی ذرائع ابلاغ نے ایرانی عورتوں کی مبینہ اور اُن پر ہونے والے ظلم و جبر کی جو تصویریں کھینچیں ہیں وہ سراسر بے بنیاد ہیں۔ ہم نے ایرانی خواتین کو زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ پایا۔ ایرانی لڑکیاں ہر جگہ نظر آئیں۔ آپ ہوٹل دیکھیں، بڑے بڑے سٹور دیکھیں، دفتر دیکھیں، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں پائیں گے جو عورتوں پر بند ہو۔ کئی بار اپنے ہوٹل میں دیکھنے میں آیا کہ ہوٹل کے ملازمین کی اکثریت خواتین پر مشتمل تھی۔ اسی طرح پردے کے بارے میں جو مبالغہ آمیزیاں پھیلائی گئی ہیں ان کی بھی کوئی بنیاد نہیں۔ آپ اوسط ایرانی خاتون کو پتلون، جیکٹ اور سر پر ایک رومال کے سٹینڈاڈ لباس میں دیکھیں گے۔ چادر کا استعمال عموماً بزرگ خواتین تک ہی محدود ہے۔ عورتیں سڑکوں، شاہراہوں، بازاروں، تفریح گاہوں میں خود کو محفوظ پاتی ہیں۔ کئی بار رات کے وقت مشاہدہ ہوا کہ تنہا لڑکیاں بلاخوف و خطر سڑکوں پر سفر کرتی ہیں۔ 2011ء عیسوی کے تہران میں اشیائے ضروریہ کی قیمتیں ہندوستان میں قیمتوں سے لگ بھگ 20 رفیصدی کم پائیں۔ اگرچہ نوروز کے باعث بیشتر بازار اور کاروباری ادارے بند تھے مگر جہاں بھی دکانیں کھلی ملیں وہاں دیکھا کہ کوالٹی کے پیمانے کافی بلند ہیں لوگ عموماً بہتر اشیا پسند کرتے ہیں۔ ایران میں کتابوں کی بے شمار دکانیں نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں کتابیں چھپوانے کی زبردست مہارت ہے اور ہر کتاب طباعت کتابت کا بہترین

نمونہ لگتی ہے۔ اسی طرح پھول والوں کی دکانیں عام ہیں اور نہایت ہی خوبصورت انداز میں ان دکانوں پر عموماً شیشے کے دروازے پر صرف ''گُل'' لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ کتابوں کا ذکر چلا تو یہ بھی کہتا چلوں کہ اس دورے کے اختتام پر ہمیں صدرِ ایران کی جانب سے کئی تحائف پیش کئے گئے۔ ان میں بالخصوص دیوانِ حافظ کے نسخے کا تذکرہ کرنا لازم ہے۔ یہ نسخہ جشنِ جہانِ نوروز کے لئے خصوصی طور پر شائع کروایا گیا تھا۔ مرصع کاری کا یہ نمونہ جس کا کل وزن لگ بھگ ۱۲ رکلوگرام ہے۔ ایک ڈبے میں بند ہے۔ یہ خوشنما نسخہ بخطِ غلام حسین امیر خانی ہے اور کی مصوری یعنی ''نگارگری''، علمی رضا آقا میری، امیر طماسبی، سیلینا پوریا کے موقلم کی مرہونِ منت ہے۔ اس نسخے کی ایک اور خاص بات اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہے۔ یہ ترجمہ ایم، ایلکزنڈر ریان نے کیا ہے اور کل نسخے کی تصحیح وترتیب محمد قزوینی اور قاسم غنی کے ہاتوں ہوئی ہے۔ کتاب کل ملا کر ساڑھے چھ سو صفحات (25x35cm) پر پھیلی ہوئی ہے جن میں درجنوں تصاویر شامل ہیں۔

(2)

لگ بھگ چھ سال کے بعد پھر تہران جانے کا اتفاق ہوا۔ مرزا عبدالقادر بیدل دہلوی جو سترویں صدی عیسوی کے اہم ترین فارسی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، اپنے منفرد انداز بیان اور شعری مکتب جسے عرف عام میں ''سبک ہندی'' سے موسوم کیا گیا ہے کے شاید سب سے زیادہ سربرآوردہ شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ بیدل دہلوی کے اعزاز میں ایران میں ایک ''بنیاد بیدل'' کے نام سے ادارہ قائم ہے جو بیدل شناسی میں ایک اہم کردار کر رہا ہے۔ اس ادارے کے اہتمام سے ہر سال عالمی پیمانے پر ایک عرس بیدل منایا جاتا ہے۔ ''بنیادِ بیدل'' ادارے کے روح رواں آقائی سیدی ھادی کیاسری ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات جشنِ جہانِ نوروز کے دوران تہران میں چھ سال قبل ہوئی تھی۔ اُن تقریبات کے روحِ روان بھی یہی صاحب تھے اور آج پھر اُن کی ذرہ نوازی کے طفیل مجھے بیدل جیسے عظیم المرتبت شاعر جیسے ابو المعانی کہا گیا ہے، کے عرس میں شامل ہونے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ ہمارے عزیز ڈاکٹر سید اکبر شاہ جعفری نے یہ مژدہ جانفزا سنایا اور حکم دیا کہ میں بیدل کے حوالے سے مقالہ تحریر کروں۔ اب کہاں بیدلؔ اور کہاں یہ ناچیز۔ جی میں آیا کہ معذرت کا اظہار کروں۔ جانا چاہتا تھا کیوں کہ ایران

سے پہلی ہی نظر میں عشق جو ہو گیا تھا۔اور کون عاشق نامراد ایسا ہو جو اپنے معشوق کو دیکھنے اور بار بار دیکھنے سے جی چرائے ؟ بہر حال کئی دنوں کے سوچ وچار کے بعد دل نے عقل پہ سبقت لی اور بے دل کا دامن تھامنے میں ہی شوقِ وصال کی آرزو پھر آنے کی امید بندھائی ۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ایک تو کشمیر میں فارسی شاعری کی تاریخ کے بارے میں مختصر بات کی جائے اور بیدل کے تاریخی پیشرو لگ بھگ ہم عصر غنی کشمیری کے بارے میں مقالہ ضبط تحریر میں لایا جائے اور اس طرح مقالے کا عنوان ''غنی کشمیری سلفِ بے واسطہ ''میرزا بیدل'' قرار دیا۔مقالہ اردو میں لکھا گیا اور ''بنیاد بیدل'' نے اس کا فارسی ترجمہ تیار کروایا۔

17/جنوری 2017ء کو ممبئی کے ہوائی اڈے سے میں تہران کے لئے روانہ ہوا۔مسقط میں ایک وقفے کے بعد شام گئے تہران کے امام خمینی بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اُترا۔پچھلی بار جب آیا تھا تو ایران میں بہار آئی ہوئی تھی ۔اب کی بار جنوری کا مہینہ تھا، سردی کا موسم، ہوا میں کاٹ محسوس ہوئی۔ہوائی اڈے سے باہر آیا۔ منتظمین نے کسی کارندے کو لینے بھیجا تھا۔وہ مجھے ڈھونڈتا رہا اور میں اُسے ۔خاصی جھنجھلاہٹ ہوئی کہ اسی دوران ایک صاحب نے سلام کیا۔میں نے جواباً سلام کہہ دیا۔اس نے فارسی میں پوچھا کیا آپ کو ٹیکسی چاہیے؟۔میں نے کہا ''نہیں مجھے کوئی لینے آنے والا ہے۔''اس نے دریافت کیا کہ کیا آپ کے پاس اس شخص کا فون نمبر ہے؟ میں نے کہا ہاں ہے۔اس نے مجھ سے نمبر لیا۔اپنے فون سے فون ملایا اور میری بات کروائی۔بہر حال مجھ سے کہا گیا کہ میں وہیں ٹھہر کر انتظار کروں ۔آپ کو لینے والا آپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔آپ وہیں ٹھہریئے۔اب یہ شخص جس نے ازراہِ مروت میری مدد فرمائی تھی ۔میں نے ازراہِ تشکر چند کلمات کہے۔اس نے جواباً کہا کہ آپ کے لئے تو میں نے فون بھی استعمال کیا۔اس میں میرا خرچہ بھی ہو گیا۔میں نے کہا ٹھیک ہے۔کتنے روپے دوں؟ اس نے کہا ''ڈالر''۔میں نے کہا میرے پاس ڈالر نہیں ہیں ہاں کچھ ہندوستانی کرنسی ہے۔بہر حال اس نے مجھ سے کچھ روپے لے لئے اور اپنی راہ چل دیا۔اتنی دیر میں مجھے ڈھونڈتا ہوا کارندہ بھی پہنچ گیا، اور مجھے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔وہاں گاڑی کھڑی تھی، اور اس میں ایک محترمہ پہلے سے بیٹھی تھیں۔میں بھی سوار ہوا۔محترمہ کو سلام کیا اُنہوں نے بڑی خوش اخلاقی سے جواب دیا تعارف ہوا یہ تھیں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کی

پروفیسر فائزے۔ ایئر پورٹ سے ہوٹل تک کے سفر کے دوران اُن سے کافی مفید باتیں ہوئیں۔ بیدل کے حوالے سے پھر غنی اور پھر کشمیر۔ بہر حال ان کے ساتھ اگلے پانچ چھ روز لگ بھگ روزانہ ملاقاتیں رہیں۔ نہایت ہی سلجھی ہوئی خاتون اور اپنے شعبے میں نہایت لائق وفائق۔

ہوٹل پہونچے اور دیگر مندوبین سے تعارف ہوتا گیا۔ قدرے تھکاوٹ بھی تھی اور آرام کو ہی ترجیح دی۔ ویسے بھی باہر کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ لفٹ میں اوپر اپنے کمرے کو جاتے اپنے عزیز ڈاکٹر سید اکبر شاہ جعفری سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میاں کب آئے۔؟ بس ابھی......اور ہاں آپ کا فارسی مقالہ یہ لیجیئے۔ دیکھیں کیا آپ فارسی میں پڑھیں گے؟ کب ہے میرا مقالہ؟ میں نے پوچھا۔

شاید کل ہی ہے۔! اُنہوں نے کہا..........رات کو دیکھ لیجئے۔

ٹوٹی پھوٹی اٹک اٹک کے فارسی پڑھنا ایک بات ہے اور ایک بین الاقوامی سیمینار میں جہاں فارسی زبان وادب کے بہترین ماہر موجود ہیں مقالہ پڑھنا دوسری بات ہے۔ خیر فارسی ترجمے کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پڑھا، پھر دیکھا، پھر پڑھا، یہاں تک کہ نیند کا غلبہ ہوگیا اور سو گیا۔

دوسرے روز صبح عرسِ بیدل کا افتتاحیہ تھا۔ بریک فاسٹ کے دوران دور سے نظر پڑی، پاکستان سے تشریف لائے نامور شاعر افتخار عارف تھے۔ اُن کے دائیں بائیں کافی ہجوم تھا۔ میں نے ملنا مناسب نہ جان کر ملتوی کر دیا۔ آڈیٹوریم میں پہونچے، پروگرام شروع ہوگیا۔ آقای سیدی ھادی کیاسری نے عرس بیدل کے حوالے سے اغراض ومقاصد بیان کئے۔ مہمانوں کا استقبال کیا۔ کئی اور حضرات نے تقریریں کیں۔ یہ سب کی سب فارسی زبان میں تھیں۔ افتخار عارف صاحب نے اردو میں خطاب کیا۔ جس کا فی البدیہہ فارسی ترجمہ ڈاکٹر سید اکبر شاہ جعفری نے کیا۔ ڈاکٹر جعفری کی فارسی زبان پر عبور کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب وزیرِ اعظم ہندوستان ایران کے دورے پر گئے تو اُن کے ساتھ ڈاکٹر جعفری بحیثیت سرکاری Interpretor تھے۔

پروگرام میں بیدل کے کلام کو افغانستان سے آئے ہوئے وہاں کے مشہور ومعروف گلوکار محمد شریف نے پیش کیا اور دادِ تحسین حاصل کی۔ محمد شریف افغانستان کے مشہور معروف فنکار سارنگ مرحوم کے شاگردِ رشید ہیں۔ ان سے میرے پہلے دورے کے دوران بھی ملاقات رہی تھی اور اب کی بار بھی ملنا جلنا ہوا۔

پروگرام کی تفصیل دیکھ کر معلوم ہوا کہ میرا مقالہ پہلے نہیں بلکہ دوسرے روز ہے اور لطف بالائے لطف یہ کہ اسی نشست کی صدارت میں بھی میرا نام ہے۔ افتتاحی نشست کے بعد مقالات پیش ہوئے اور بیدلؔ کے فکروفن پر کافی بحث و تمحیص ہوئی۔ پہلے دن کے پروگرام مکمل ہوئے اور شرکا کو واپس ہوٹل پہونچایا گا۔

ہاں افتخار عارف سے ملاقات کا ذکر رہ گیا۔ افتتاحیہ سیشن کے دوران ہی خوش قسمتی سے میرا اُن سے تعارف ہو گیا۔ میں نے علیک سلیک کے بعد انہیں یاد دلایا کہ آپ ایک بار میرے والد مرحوم میر غلام رسول نازکی سے لندن میں ملے تھے۔ انہوں نے جواباً کہا۔ جب شرکاء میں آپ کا نام لیا گیا تو مجھے نام کی نسبت سے وہ یاد آئے۔ میں نے کہا آپ نے انہیں اپنی کتاب ''مہر دونیم'' بھی دی تھی ۔.......... ہاں وہ ان ہی دنوں آئی تھی............

اس طرح ہم کچھ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ دوسرے روز اُن سے پھر مڈبھیڑ ہوئی۔ میں نے پوچھا حضور کشمیر کب آیئے گا؟ وہاں آپ کے کافی مداح ہیں۔

اُنہوں نے جواب دیا: ابھی تو ناممکن لگتا ہے۔ ہاں شاید کشمیر کی آزادی کے بعد!۔ بہرحال انہوں نے اپنے نانا جان کا ذکر کیا جو آخری لمحے تک اپنے نام کے ساتھ کشمیری لکھوانے پر بضد رہتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے رشتہ دار ڈاکٹر یاسین کا ذکر کیا جو کشمیر یونیورسٹی میں مدرس تھے۔

پہلے روز کی شام کو اطلاع ملی کہ ڈنر کے بعد ہوٹل کے ہال میں ایک غیر رسمی نشست کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تشریف لائیے۔ بحر کیف رات کے کوئی دس ساڑھے دس بجے اس ہال میں وارد ہوئے۔ وہاں سب ہی شرکاء پہونچ چکے تھے۔ ڈاکٹر ھادی نے مطلع کیا کہ اس غیر رسمی نشست میں جو کچھ بھی سنانا چاہیں سنا سکتے ہیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم کئی لوگ ایسے بھی تھے جو فارسی سے آشنا ہوں تو ہوں مگر کچھ سنانے کی حالت میں نہ تھے۔

میرے دائیں جانب افغانستان سے آئے بزرگ شاعر علامہ مہجور تھے۔ نہایت ہی سنجیدہ، باریش، معتبر اور معزز شخصیت۔ اُن کے ساتھ دن میں میری ملاقات ہوئی تھی اور اُنہوں نے بالخصوص میرے شجرۂ نسب کے بارے میں دریافت کیا تھا! اور تفصیلات جاننے کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ مجھے آپ سے قادری خوشبو آرہی تھی! محفل کا آغاز ان ہی سے ہوا۔ انہوں نے اپنی کئی غزلیں

سنائیں۔اس کے بعد ھادی کیا سری نے میرے نام کا اعلان کیا۔اور ساتھ میں میرے والد محترم کا ایک نہایت ہی جامع تعارف بھی پیش کیا۔اور انہیں کشمیر کے آخری فارسی شعرا میں ایک ممتاز مقام پر فائز کر دیا۔وہ ایک بار جموں آئے تھے اور اُن سے میری اور برادرِ مکرم فاروق نازکی صاحب کی ملاقات ہوئی تھی۔اس ملاقات کے دوران کشمیر میں فارسی اور پھر والد صاحب کی فارسی شاعری کا ذکر ہوا تھا۔انہیں نازکی صاحب کے کئی فارسی اشعار اسی ملاقات میں یاد ہو گئے تھے اور اب اتنے سال گزر جانے کے بعد وہ اپنے حافظے کے بل بوتے پر انہیں دہرا رہے تھے۔میرے سامنے دو راستے تھے۔ایک یہ کہ میں اپنی کوئی اردو غزل پیش کروں اور عزیزی اکبر جعفری اس کا سلیس فارسی ترجمہ سنائیں۔دوسری صورت یہ تھی کہ آزمائش کی اس گھڑی میں بھی والدِ محترم کا ہی دامن پکڑوں اور اس مرحلے سے گذر جاؤں۔میرے موبائل فون میں نازکی صاحب کی نعت جسے مرحوم اُستاد غلام محمد ساز نواز نے صوفیانہ میں گایا ہے کی ریکارڈنگ موجود تھی۔میں نے اتنا کہا کہ میرے لئے فارس دانوں کی اس محفل میں کچھ کہنا بے ادبی ہوگی۔ہاں میرے والد جن کا حوالہ ابھی دیا گیا ہے اُن کی فارسی نعت خالص کشمیری صوفیانہ موسیقی کے پیرائے میں میرے پاس ہے جسے میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔اس کے ساتھ ہی میں نے مائیک کے سامنے اپنا فون رکھ دیا اور ساز نواز کی محسور کن آواز میں یہ نعت شروع ہوئی۔

نازہا دارم کہ دلدارم توئی — یا رسول اللہ مددگارم توئی
از غمِ دنیا و از فکرِ معاد — غافلم دانم کہ غم خوارم توئی
خفتہ ام درسایۂ دیوارِ تُو — یا محمدؐ بخت بیدارم توئی
چوں کنم اندیشۂ سود و زیاں — اندکم شادم کہ بسیارم توئی
منت ساحل کشیدن ابلہی است — کشتی و دریائے ذخارم توئی
از نگاہم لرزہ گیرد آفتاب — جلوہ فرما در شب تارم توئی
کعبۂ تعمیر کُن از خاکِ من — پورِ ابراہیم ! معمارم توئی

ہال میں یہ سرمدی نغمہ گونجتا رہا۔مکمل خاموشی، لگتا تھا کہ حاضرین سانس لینے سے بھی ہچکچا رہے تھے۔جوں ہی یہ نعت مکمل ہوئی ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔کئی آنکھیں تھیں کہ جو اشکبار

تھیں۔ ھادی کیاسری نے مائیک سنبھالی نازکی صاحب کی شان میں بے شمار کلمات ادا کئے۔ اور آخر یہ تجویز پیش کی کہ آقائی سیدی میر غلام رسول نازکی کی روح کے ایصالِ ثواب کی خاطر فاتحہ پڑھی جائے۔ یہ ایک وجدانی لمحہ تھا۔ جب لگ بھگ بائیس مما لک سے آئے ہوئے عالم، فاضل، شاعر، دانشور، طالب علم، والدمحترم کے لئے اللہ کے حضور دعا گو تھے۔

فاتحہ کے بعد فارسی زبان کے سب سے مقبول نوجوان شاعر محمد رضا محمدی جو اصل میں افغانستان سے ہیں لیکن لندن میں رہتے ہیں۔ اُن سے میری ملاقات 2011ء میں ہوئی تھی۔ نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ نازکی صاحب کی فارسی شاعری کے مجموعے کو شائع کروانا اپنی نیک بختی سمجھیں گے۔

دوسرے دن جس نشست میں مجھے مقالہ پڑھنا تھا اور جس کے ایوانِ صدارت میں میں بھی شامل تھا۔ ازبکستان سے آئے ہوئے مشہور معروف شاعر اور ادیب صفر عبداللہ بھی موجود تھے۔ اب ہوا یوں کہ میرا مقالہ اس نشست کا آخری مقالہ تھا۔ وقت کی قید تھی، جو مقالہ پڑھنے میں مجھے کم سے کم پچیس منٹ درکار تھے وہ دس منٹ میں نمٹا لینا مشکل تھا۔ بحر حال میں نے آغاز کے چند اقتباسات پڑھے۔ اور ڈاکٹر عبداللہ مجھے وقت کی پابندی پر الرٹ کرتے رہے، پھر اختتام کے چند اقتباسات پڑھے اور اس طرح یہ مقالہ بہر حال ادا ہو گیا یہ بات بھی اپنی جگہ کہ کئی حضرات نے جنہیں اس بات کا علم تھا کہ میں شاید زندگی میں پہلی بار فارسی پڑھ رہا ہوں مجھے آکر مبارک باد بھی دی!

عرس کا اختتامی جلسہ بھی قابلِ دید تھا۔ بہترین موسیقی اور اس میں یہ التزام برتا گیا تھا کہ صرف کلامِ بیدل ہی پیش کیا جائے۔ بیدل کے مصرعوں کی طرح پر کئی مقامی فارسی شعرا نے غزلیں پڑھیں، تقاریر ہوئیں۔ انعامات و اکرامات سے نوازا گیا۔ اور اس طرح دو دن کا یہ چہار مین ''عرسِ بیدل'' اپنے نہایت ہی خوشگوار اور یادگار انجام کو پہونچ گیا۔

شام کو تہران کے شہر کے میئر نے ایک نہایت شاندار عصرانے کا اہتمام کیا تھا۔ وہ فرداً فرداً ہر ایک مہمان سے ملے۔ میرے پاس آئے تو ڈاکٹر ھادی کیاسری نے انہیں کشمیر اور فارسی شاعری کے حوالے سے کئی باتوں سے روشناس کرایا۔ ایرانی مہمان نوازی اپنی مثال آپ ہے' شاندار دعوت تھی اور دیر گئے تک جاری رہی۔

قیامِ تہران کے بقیہ روز تہران کے کئی ادارے دیکھنے میں صرف ہوئے۔ ان میں وہ دو

میوزیم جن میں ایک قبل از اسلام ایران کی تاریخ کا عکاس ہے اور دوسرا بعد از اسلام دور کا میوزیم شامل تھے۔ دونوں میں بے شمار نوادرات موجود ہیں۔ آرکیالوجی، آرکیٹکچر، مخطوطات، پارچہ جات، دیہی زندگی، غرض ہر شعبے سے متعلق بھرپور معلومات اور موجودات ان عجائب گھروں میں پورے اہتمام اور سلیقے سے سجائی گئی ہیں۔ ماہرین کی خدمات بھی دستیاب ہیں جو ہر نمونے کے بارے میں تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ قبل از اسلام میوزیم میں جس شے نے ہم سب کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ ''دخترِ ایران'' کے عنوان سے ایک انسانی ڈھانچہ ہے جسے کئی سال پہلے تہران کی ایک گلی کے نیچے کھدائی کے دوران دریافت کیا گیا تھا۔ یہ نسوانی ڈھانچہ کم از کم سات ہزار برس پرانا ہے۔ اس دریافت سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ایران میں انسانی بستی کی تاریخ کم سے کم سات ہزار بس پرانی ہے اور اس سلسلے میں اب تک کے سارے تخمینے درست کرنے پڑے۔ اس ڈھانچے کو ایک کمرے میں شیشے کے ایک ڈبے میں رکھا گیا ہے اور سائنسدانوں نے ڈھانچے کی بنیاد پر ایک لڑکی کا مجسمہ بھی تخلیق کیا ہے جو امکانی طور پر ۹۵ فیصدی حد تک ہو بہو اسی لڑکی کا ہوسکتا ہے جو سات ہزار سال پہلے اس دیار میں بود باش کرتی تھی۔ اس مجسمے کے دریافت ہونے سے اس بات کا انکشاف بھی ہوا کہ تہران کا شہر ''رَے'' نامی بستی کو اپنے اندر سمودیا ہوگا۔ یہ بستی لگ بھگ پانچ ہزار برس پہلے اس علاقے میں مکین انسانوں پر مشتمل تھی۔ یہ جنگجو قسم کے لوگ تھے اور زمین دوز رہتے تھے۔ مجھے یہ جانکاری حاصل ہوئی تو اپنے برزہامہ کے قدیم ترین باشندے یاد آگئے۔ وہ بھی زیرِ زمین اقامت گاہوں میں رہتے تھے اور وہ بھی آج سے لگ بھگ پانچ ہزار برس پہلے اس دنیا میں بود و باش کرتے تھے۔ کیا ''رَے'' اور ''برزہامہ'' کے لوگوں کا آپس میں کوئی رشتہ تھا۔؟

میوزیم کے دورے کے دوران ایک اور بات جو نمایاں طور پر سامنے آئی وہ کشمیر اور ایران کے ثقافتی تعلقات کے بارے میں تھی۔ تہران کے آمدِ اسلام کے بعد کے ادوار پر مشتمل میوزیم میں جہاں فنِ خطاطی، قلمکاری، لکڑی پر نقاشی، کے نمونے وافر تعداد میں موجود ہیں وہاں میں ایک مسجد کا منبر جس پر امام صاحب خطبہ دیا کرتے ہوں گے، کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ پورے کا پورا لکڑی کا بنا ہوا ہے اور وہ بھی ہمارے آج کے ''ختم بند'' طرز پر بنا ہوا جو نقشے ہمارے ہاں آج بھی ''ختم بند'' میں استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ ایران میں کم سے کم تین سو سال پرانے ہیں۔ آج اُن

کے ہاں لکڑی میں جو خاکے اور ڈزائن استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ بالکل مختلف ہیں، نئے نئے ڈیزائن، نئے نئے سٹائل معرضِ وجود میں آئے ہیں اور یہ فن اپنی پوری قوت سے ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

ہمارا اگلا پڑاؤ ''برجِ میلا دتہران'' تھا۔ 435 میٹر اونچا یہ مینار ساری دنیا میں اپنی اونچائی کے اعتبار سے چھٹے نمبر پر ہے۔ یہ مینار صرف مینار ہی نہیں رہا کہ جس کو ٹیلی ویژن اور رسل ورسائل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک ثقافتی اور سماجی مرکز بن کر اُبھر رہا ہے۔ اس کی مختلف منزلوں پر ایرانی تہذیب وتمدن، تاریخ، اور دیگر شعبوں سے متعلق جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ایران کی نامور ادبی، علمی اور دانش وبینش سے متعلق شخصیات کے قد آدم مجسمے اس طرح کھڑے ہیں کہ ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ان میں قدیم دور کے شعرا سے لے کر آج کل کے نامور فنکار، عالم اور دانشور شامل ہیں۔ یہاں کئی دلچسپ مخطوطات، دستاویز اور دیگر نوادرات سنبھال کر رکھی گئی ہیں۔ ان سے ایران کی تاریخ کے بارے میں نہایت اہم معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہاں ہر وقت سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مینار کے بالائی مدارج سے سارے تہران شہر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ تہران کے شمال میں واقع کوہستانی سلسلہ ''البرز'' بالکل ایسے سامنے لگتا ہے کہ ہاتھ بڑھا کر چھونے کو جی کرتا ہے۔ یہ مینار ماڈرن ٹیکنالوجی کا ایک شاہکار ہے اور تہران کے باشندے اس پر ناز کرتے ہیں۔ اس مینار کا کل وزن لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ ٹن ہے۔ 280 میٹر کی بلندی پر اس کا گھیر 601 میٹر ہے۔ کل ملا کر جو کنکریٹ اس میں استعمال ہوا اس کا حجم 63 ہزار کیوبک میٹر ہے۔ اس میں سترہ ہزار مربع میٹر کانچ نصب ہے۔ اس کے اندر معلوماتی اور علمی تنصیبات کے علاوہ تفریح کے بھی کئی کئی سامان موجود ہیں۔ جن میں بہترین ریستوران بھی شامل ہیں۔

وقت گزرتا ہے۔ تہران میں یہ ایک ہفتے کا قیام بھی اپنے اختتام کو پہونچا اور اپنے ایرانی میزبانوں اور دیگر ممالک سے آئے دوستوں سے رخصت کا وقت آن پہونچا۔ اور ہم نے تہران کو ایک آخری نظر جی بھر کے دیکھا اور رخصت ہوئے۔ ایران دوست دارم اگلی بار پھر ملاقات۔

یار زندہ صحبت باقی

☆☆

افسانے

☆............عبدالغنی شیخ لداخی

# کرید

''نہیں مالو پاپا، امی کو نہیں مالو۔''

وہ روتا ہوا پاپا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا لیکن پاپا نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ پاپا جو کام اپنے ہاتھوں سے لے رہے تھے، امی زبان سے لے رہی تھیں۔ پھر پاپا کے دونوں ہاتھ تیز تیز چلنے لگے اور امی رونے لگیں۔

جب پاپا نے اپنے ہاتھ روک لیے تو ان کی مٹھی میں امی کے سر کے کچھ بال تھے اور امی کے چہرے پر کئی جگہ خراشیں تھیں۔ کمرے کا سارا سامان تتر بتر تھا۔ صبح سے چولھا ٹھنڈا پڑا تھا۔ امی کمرے کے ایک کونے میں جا کر رونے لگیں۔ وہ امی کی گود میں چلا گیا اور اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

کمرے میں جھانکا، خاموشی طاری تھی اور ایک ایک لمحہ مشکل سے گزر رہا تھا۔ پاپا کا غصے سے آگ بگولا چہرہ لمحہ بہ لمحہ شانت پڑنے لگا اور اس پر پشیمانی کی ہلکی سی غیر مرئی لکیریں تننے لگیں۔

پاپا کے مدھم ہوتے تیور دیکھ کر وہ توتلی زبان میں بولا۔

''اگر تم پھیل مالو گے تو میں تم کو مال ڈالوں گا۔''

پاپا کے گمبھیر چہرے پر ایک لمحے مسکراہٹ آئی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

''امی جب میں بالا ہو جاؤں گا تو میں تم کو پاپا کے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔ اس کا ننھا سا وجود امی کو تسلی دینے لگا۔''

پاپا کے جانے کے کچھ دیر بعد انکل جمیل دروازے پر نمودار ہوا۔اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک تھیلا تھا جس میں اس کے لیے پھل تھے۔انکل کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ انکل نے پھلوں کا تھیلا اس کے ہاتھ میں دیا اور خود امی کی جانب بڑھا۔امی کا چہرہ دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹک گیا۔

''کیا آج پھر اس نے ہاتھ اٹھایا؟'' انکل جمیل نے پوچھا۔

امی نے جواب نہیں دیا اور چپکے سے آنسو بہانے لگیں۔

انکل امی کو دلاسا دینے لگا۔

ننھے نے جب سے آنکھیں کھولیں تو گھر میں یہی ہنگامہ دیکھا۔پہلے پاپا اور امی کے درمیان کچھ تو تو میں میں ہوتی جو فوراً گرما گرمی کی صورت اختیار کرتی۔تب پاپا کا ہاتھ اٹھتا تھا۔امی روتی چلاتی تھیں۔پھر کئی روز تک گھر کی چار دیواری میں ایک تکلیف دہ کھچاؤ رہتا تھا۔شروع شروع میں جب کبھی جھگڑا ہوتا، پڑوس کی آنٹی سنیتا، چچی جمیلہ اور ان کا شوہر صادق آجاتے تھے۔ وہ بیچ بچاؤ کر کے اور سمجھا بجھا کر چلے جاتے تھے لیکن روز روز کے جھگڑوں کے بعد انہوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔

پاپا اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر سے اکثر باہر رہتے تھے۔وہ عام طور پر ہفتے عشرے کے بعد گھر لوٹتے۔کبھی کبھی مہینہ یا اس سے زیادہ مدت لگا دیتے تھے۔

ایک دفعہ پاپا دو دن کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے۔پاپا نے اس کو پیار کرتے ہوئے پوچھا کہ اس کے لیے کیا تحفہ لائے۔اس نے پاپا کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر کہا۔''پاپا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔تم امی کو کبھی نہیں مالنا''۔

''کبھی نہیں ماروں گا''۔پاپا نے اس کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

لیکن دو روز بعد جب پاپا گھر لوٹے تو امی کو پھر مارا تھا۔

پاپا نے ایسے کئی وعدے کیے تھے لیکن یہ سارے وعدے عارضی ثابت ہوئے۔وہ آہستہ آہستہ اس ماحول کا عادی ہو گیا۔اس کے دل میں پاپا کے خلاف گہری نفرت پلنے لگی اور امی کے لئے اس کے روئیں روئیں میں ہمدردی جاگ اٹھی۔

جب وہ پانچ برس کا ہوا تو پاپا نے اس کو نرسری میں داخل کیا۔ اور وہ اپنا زیادہ وقت بچوں کے ساتھ نرسری اور کھیل کود میں گزارنے لگا۔

ایک روز وہ جلدی گھر لوٹا۔ جب سیڑھیاں پھلانگ کر وہ صحن میں آیا تو اندر کمرے سے پاپا کی گرجناک آواز آئی۔ اس کا دل ایک لمحے کے لیے دھک سے رہ گیا۔ وہ دروازے کی آڑ میں دیوار سے ٹیک لگائے سننے لگا۔

''تم کیوں میری غیر موجودگی میں اس بدمعاش کو گھر آنے دیتی ہو؟'' پاپا زور زور سے کہہ رہے تھے۔ ''کب تک تم اس طرح میری زندگی میں زہر گھولتی رہوگی؟''

پھر اس کے کانوں میں امی کی سسکیوں کی آواز آئی۔

پاپا کہہ رہے تھے۔ ''تم نے میری زندگی کو اجیرن کر دیا ہے رضیہ۔ مجھے معصوم بچے پر ترس آتا ہے ورنہ میں نے تم کو کب کا چھوڑ دیا ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ کبھی تمہاری شکل نہ دیکھوں۔''

وہ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوا۔

''پاپا! تم نے امی کو کیوں مارا؟ بتاؤ پاپا!'' وہ روہانسا ہو کر بولا۔

''تم نہیں سمجھو گے بیٹا۔ تم نہیں سمجھو گے!'' پاپا جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ اس نے پہلی بار پاپا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

وہ حیران ہوا۔ پاپا مارتے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں۔

''تم کیوں رو رہے ہو پاپا؟''

''کچھ نہیں بیٹا، کچھ نہیں۔'' پاپا نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھ لیے۔

چند روز کے بعد پاپا پھر سفر پر روانہ ہوئے اور انکل جمیل روز گھر آنے لگا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے پھل اور مٹھائیاں لاتا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ پاپا گھر نہیں لوٹے۔ ایک روز ڈاکیہ آیا اور اس نے پاپا کی طرف سے اس کے نام ایک خط اور تین سو روپے کا منی آرڈر دیا۔

وہ اب نرسری سے اسکول میں آ گیا تھا۔

دوسرے ماہ ڈاکیہ دوبارہ آیا اور اس کو پاپا کے بھیجے ہوئے تین سو روپے کے منی آرڈر کی

رقم دے گیا۔

اس طرح مہینے بیت گئے۔ پاپا گھر نہیں آتے لیکن ہر ماہ ڈاکیہ بلا ناغہ منی آرڈر سے بھیجی ہوئی رقم لاتا تھا۔

پھر ڈاکیہ کا آنا بند ہو گیا۔ اس کے بجائے ایک اور آدمی آیا۔ اس نے بھی ڈاکیے کی طرح خاکی وردی پہنی تھی۔ اس آدمی نے امی کو ایک لفافہ دیا۔ سفید رنگ کے لفافے میں سے امی گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر پڑھنے لگیں۔ اچانک کاغذ امی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور وہ رونے لگیں۔

''امی! کیوں رو رہی ہو؟'' وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

امی نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر سے آنچل اٹھایا۔

امی کا چہرہ خزاں زدہ پتے کی طرح زرد تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی امی بولیں۔

''تمہارے پاپا اس دنیا میں نہیں رہے بیٹا۔''

امی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ایک ہفتے کے بعد وہ دوبارہ اسکول جانے لگا لیکن اسی شام اسکول کا چپراسی اس کے خلاف ہیڈ ماسٹر کی شکایت لے کر آیا۔ اس نے ایک بچے کو اسکول کی چھت سے نیچے دھکیل دیا تھا۔ نت نئی شرارتوں کے لیے ہیڈ ماسٹر نے پہلے بھی کئی دفعہ اس کے خلاف امی سے شکایت کی تھی۔

ایک روز اس نے گلاس میں اجے کی دوات الٹ دی۔ اجے نے غصے سے اس کو حرامی کہا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اجے کی ناک پر ایک مکا رسید کر دیا۔

اجے اپنی ناک سہلاتا ہوا بچوں سے بولا۔ ''یہ حرامی بچہ ہے۔ تم لوگ اس کو کل سے حرامی بچہ کہنا۔

اس روز سے جب بھی کسی بچے سے اس کی لڑائی ہوتی وہ اس کو حرامی بچہ کہہ کر چڑاتا۔

اس نے امی سے شکایت کی کہ بچے اس کو حرامی کہتے ہیں۔

امی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''جب باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو سب اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تم ان باتوں کی

طرف بالکل دھیان نہ دو اور خاموشی سے اپنی پڑھائی جاری رکھو"۔

اس کے چند روز بعد وہ چچی جمیلہ کے بیٹے مجید کے ساتھ اسکول سے لوٹ رہا تھا۔ مجید نے اس سے پوچھا۔

"لمبو جمیل تمہارے گھر کیوں آتا ہے؟" لمبے قد کی وجہ سے سبھی جمیل کو لمبو جمیل کہتے تھے۔ اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"تم اپنے باپ کے بیٹے نہیں ہو شکیل۔" مجید اچانک بول اٹھا۔

"پھر میں کس کا بیٹا ہوں؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"تم جمیل کے بیٹے ہو۔ جو تمہارے گھر آتا رہتا ہے۔" مجید نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کون کہتا ہے؟" اس کی مٹھی بھنچ گئی۔

"میری امی کہتی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔ میں انکل جمیل کا بیٹا نہیں ہوں۔" اس نے چلا کر کہا۔ "وہ میرے انکل ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مجید پر مکوں کی بارش کر دی اور مجید روتا ہوا گھر چلا گیا۔

وقت رینگتا ہوا گزرنے لگا۔ وہ اور ماں، باپ کی بچائی ہوئی رقم پر جی رہے تھے۔

"لمبو جمیل آج کل نظر نہیں آرہا ہے۔ وہ کہاں گیا؟" چچی نے پوچھا۔

"کل ہی تو انکل ہمارے ہاں آئے تھے چچی۔" وہ معصومیت سے بولا

وہ تمہارا انکل تو نہیں ہے۔ تمہارے پاپا کا کوئی بھائی نہیں۔ وہ تو نرا لفنگا ہے۔ تمہاری ماں ایسے آدمی کو گھر آنے کیوں دیتی ہے؟"

چچی جمیلہ کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ اس نے اس طنز کو محسوس کیا۔ وہ خاموشی سے کچھ کہے بغیر واپس آگیا۔ اس کے دل میں ایک کرید پیدا ہوئی اور وہ بے چین رہنے لگا۔ اس نے اس بات کو بھلانے کی بڑی کوشش کی لیکن جتنی کوشش کرتا اتنی ہی ایک پھانس کی طرح اس کے دل میں یہ بات چبھنے لگتی۔ پھر یہ پھانس اس کے لیے ناقابل برداشت بن گئی اور وہ اس کو اپنے دل سے نکالنے کے لیے بے تاب رہنے لگا۔ وہ امی کو عجیب نظروں سے گھورنے لگا۔ کبھی کبھی کھانا کھاتے ہوئے

اس کا ہاتھ رک جاتا اور وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ امی نے کئی بار اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی لیکن اس نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اندر ہی اندر کرید اس کو گھن کی طرح کھائے جارہی تھی۔

ایک روز اس نے اپنے جگری دوست رفعت کو اکیلے میں پکڑ لیا۔

''رفعت! کیا میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں ہوں؟''

رفعت حیرت سے اس کا منہ تاکنے لگا۔

''یار، خدارا مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ، صاف صاف بولو۔''

''کیسی بات کرتے ہو؟ تم تو بالکل اپنے باپ پر گئے ہو شکیل۔ بالکل ویسی ہی آنکھیں، ویسی ہی آواز اور رخسار پر ہو بہو ویسا ہی تل''۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔

''یہ سارا جھگڑا جھمیلا لمبو جمیل کا پیدا کیا ہوا ہے جسے تم انکل کہہ کر پکارتے ہو۔''

کیسا جھگڑا جھمیلا؟'' اس نے سوال کیا۔

لیکن رفعت نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

اس نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ ماں سے یہ راز معلوم کر کے ہی دم لے گا۔

''ماں!'' پہلی دفعہ اس نے ماں کو امی کے بجائے ماں کہہ کر پکارا۔ وہ حیران ہو کر اس کو دیکھنے لگیں۔

''ماں! جمیل ہمارے گھر میں روز روز کیوں آتا ہے؟ وہ ہمارا کیا لگتا ہے؟ سبھی کہتے ہیں وہ میرا انکل نہیں ہے۔ تمہیں میری قسم ماں! سچ سچ بتاؤ ورنہ میں زہر کھا لوں گا۔ میں مر جاؤں گا۔''

ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار سی پھوٹ پڑی۔

بتاؤ ماں! حقیقت کیا ہے؟'' اس نے ماں کو جھنجھوڑا۔

''پاپا''! اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک آواز نکلی اور وہ ننگے فرش اوندھے منہ لیٹا زور زور سے رونے لگا۔

☆☆

☆............ورِیندر پٹواری

# پیاسی آنکھیں

''کون ہے یہ لڑکی؟ کون ہے یہ لڑکی؟''

ترلوک پنڈت بڑ بڑاتے ہوئے اور آس پاس کھڑے لوگوں کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس کے اِرد گرد اس کے چاہنے والے نہیں ہیں بلکہ وہ خود چھاپہ مار پولیس کے دستے کے چنگل میں پھنسا ہوا ایک مشکوک کردار ہو!

یوں تو اس کے اِرد گرد ہر وقت حسین و جمیل، شوخ و چنچل ہندوستانی یا غیر ملکی لڑکے لڑکیاں، مرد، عورتیں موجود رہتی ہیں! لیکن آج وہ ان کی موجودگی سے خوفزدہ ہو کر اپنے آپ سے بھی گھبرا رہا ہے! اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ آگے پیچھے دائیں بائیں یوں چل رہا ہے جیسے ملائم قالین پر نہیں بلکہ انگاروں پر چلتے چلتے اُچھل رہا ہو! اس کے چہرے کی کیفیت بھی نرالی ہے اور اُس کو کسی نے اس حالت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے!!

ایک مریل سی نابالغ لڑکی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی یوں رو رہی ہے جیسے بین کر رہو! جبکہ ایک خوبصورت عورت برآمدے میں الگ تھلگ کھڑی ہو کر ساڑی کے پلّو کو منہ میں دبا کر ادھ کھلی کھڑکی سے ترلوک پنڈت کو دیکھ رہی ہے جبکہ آس پاس کھڑے تماش بینوں کی نظریں سسک رہی لڑکی پر جمی ہوئی ہیں!

''کون ہے یہ لڑکی؟'' اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کر جب ترلوک پنڈت زور سے چیخ

پڑا، تب اس کی آواز اس ہال نُما کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونج اُٹھی اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی! تھوڑی دیر بعد جب خاموشی کو چیرتی ہوئی اس عورت کے قدموں کی آہٹ نے سب کو چونکا دیا! تب یوں محسوس ہونے لگا جیسے خاموشی کے بعد ایک زبردست طوفان آنے والا ہو!

ہال میں موجود تمام لوگ خاموش ہیں مگر تشویش ہر ایک کے ذہن پر قابض ہے!

''نہیں نہیں! ترلوک پنڈت ایک قابلِ پرستش زاہد ہے!''

''ہاں! یہ ہماری نادانی ہے جو غلط سوچ کو اپنے عمل میں شامل کر رہے ہیں!''

''مگر رنگ رُوپ دیکھ کر تو رِشی منی بھی پھسل جاتے ہیں؟!''

''مگر یہ لڑکی نابالغ ہے!۔؟؟''

''ناسمجھ ہے! پگلی ہے! دیوانی ہے!''

''مگر یہ عورت کون ہے؟''

طرح طرح کے سوالات نے حاضرین کے غور و فکر کو طاقتور دشمن کی طرح گھیر لیا ہے اور وہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں سے آئی! کیوں آئی ہے؟

ہر چہرے پر ایک سوالیہ نشان دیکھ کر ترلوک پنڈت کی حالت بالکل ویسی ہے جیسے ستار کی ایک تار اچانک ٹوٹ کر لٹک گئی ہو!

یہ کمسن لڑکی آشا ہے اور یہ عورت پدماوتی! ان کے بارے میں چند لوگ فقط اتنا جانتے ہیں کہ دونوں تقریباً دو ماہ پہلے کسی پہاڑی علاقے سے آئے ہیں! اس کے علاوہ کوئی جانتا بھی تو کیسے؟

ترلوک پنڈت کے آشرم میں اس کے چاہنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے! آشرم میں کون آیا، کسی کو فکر نہیں! کون گیا اس کا کہیں ذکر نہیں! آنے والے کی کیفیت یوں ہوتی ہے جیسے وہ کسی تیرتھ کی یاترا کرنے آیا ہو! جبکہ جانے والا یوں نظر آتا ہے جیسے ایک پیاسا کسی ٹھنڈے چشمے کا میٹھا پانی پی کر جا رہا ہو!

ترلوک پنڈت کے پاس واقعی سنگیت کا ایک ایسا چشمہ ہے جس سے ہزاروں سنگیت پریمی اپنی پیاس بجھاتے رہتے ہیں! ان کے بجائے ہوئے ستار میں ایسی انوکھی کشش ہے جو رفتہ رفتہ دل کو کھینچ کر مسرّت و سکون کے حدود میں لے آتی ہے اور من کی تاریکیاں اُجالوں میں بدل جاتی ہیں!

چھ مہینے پہلے اندھیرے غار میں رہنے والے اس غیر معروف موسیقار کو خدا نے ایک مختصر عرصے میں عزت و شہرت کا عروج بخشا ہے جو قابلِ رشک بھی ہے اور نا قابلِ یقین بھی! اس کی زندگی ایک ایسی کہانی ہے جس کو سن کر یوں گمان ہوتا ہے جیسے اس کا کردار کسی سحر نگار کی تخلیق ہے یا پھر کسی جادوگر کا حسین کرشمہ ہے!!

ترلوک پنڈت کا کنسرٹ سننے کے لیے جانے کہاں سے لوگ چلے آتے ہیں! ان لوگوں میں آشا بھی ہے اور پدماوتی بھی! مگر دونوں کی کیفیت اوروں سے مختلف ہے! دونوں کو موسیقی سے زبردست لگاؤ ہے مگر جب سامعین ساز کی آواز سن کر مست ہو جاتے ہیں تب آشا ان کے سرور کا فائدہ اٹھا کر پنڈت جی کے قریب جانے کی یوں کوشش کرتی رہتی ہے جیسے سیماب کا ایک قطرہ کھلونے کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا ایک سُوراخ میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے اور جب اسے پنڈت جی کی قربت کا شرف حاصل ہوتا ہے تب وہ سنگیت کے جادوگر کی انگلیاں دیکھنے کی بجائے اس کی آنکھوں میں جھانک کر یوں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے جیسے ایک گہری جھیل میں اپنا کھویا ہوا کھلونا تلاش کر رہی ہو، ایک نادان بچّی کی طرح۔ جب کہ پدماوتی دُور کسی کونے میں بیٹھی کبھی آشا کو اور کبھی ترلوک پنڈت کو یوں دیکھتی رہتی ہے گویا ان کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھنا ہی اس کا مقصد ہے۔

آشا ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہے کہ کب کنسرٹ ختم ہو جائے، لوگ چلے جائیں اور وہ پنڈت جی کے قریب یوں بیٹھی رہے جیسے شوالے کے سامنے بھگت! مگر جب کنسرٹ ختم ہو جاتا ہے تب وہ پردے کو یوں دیکھتی رہتی ہے جیسے پنڈت جی چاند کی طرح عارضی طور پر بادلوں کے پیچھے چھپ گئے ہوں!

بادل چھٹ جائیں گے! اور چاند پھر سامنے ہوگا! یہ سوچ کر وہ پردے کو ٹکٹکی لگا کر تب تک دیکھتی رہتی ہے جب تک اسٹیج پر چلنے والا کوئی سازندہ، لائٹ مین یا آشرم کا کوئی آدمی اس کو اپنی احمقانہ حرکت کا احساس نہیں دلاتا ہے! اس وقت جب وہ پلٹ کر ہال کے دروازے کو دیکھنا چاہتی تو ہال کے کسی کونے میں پدماوتی یوں موجود ہوتی ہے جیسے کسی مجرم کا تعاقب کرنے والا جاسوس یوں بار بار ہوتا رہتا ہے اور ہر بار پدماوتی اور آشا دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں جھکا

دیتی ہیں اور دروازے کا رُخ کر دیتی ہیں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پدماوتی نیم دوڑ لگا کر یوں باہر نکل آتی ہے گویا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو جبکہ آشا دو قدم چل کر پلٹ کر پردے کو دیکھ لیتی ہے پردے کی جنبش دیکھ کر رُک جاتی ہے اور پھر آہ بھر کر یوں چل پڑتی ہے جیسے قید سے فرار ہوا قیدی ایک بار پھر قید خانے کی طرف جانے لگا ہو۔

آشا جسے چشمہ سمجھ بیٹھی ہے! پدما اسے سراب کہہ کر بھی جانے کیوں اسے قریب سے دیکھنا چاہتی ہے! شاید اسی لیے وہ بھی دُور دُور سے یا آس پاس کہیں چھپ کر بیٹھی ہوئی ترلوک پنڈت کو اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے!!

بتیس برس کی عمر میں پدماوتی کا جسم جتنا پُرکشش ہے آشا کی شکل وصورت اتنی ہی بے کشش ہے! ڈھلیے ڈھالے لباس میں سولہ برس کی عمر میں آشا کا جسم یوں نظر آتا ہے جیسے غبارے میں تھوڑی ہوا نکال دی گئی ہو! زرد چہرہ، بے ترتیب بال اور اس پر طرہ یہ کہ آنکھوں کے دائرے بھی لالی سے ڈھکے ہوئے! کل کی آشا اور آج کی آشا میں کتنا فرق ہے وہ ہونٹ جو آج ایک سوکھے گلاب کے مانند ہیں کل وہ اتنے ہی شاداب تھے جتنے برسات کے موسم میں ہرے بھرے پھول! کل وہ اتنی شوخ وچنچل تھی جتنے بہار کے موسم میں پھولوں کے شگوفے! صبح سے شام تک وہ بس ناچتی گاتی رہا کرتی تھی! باپ کے بجائے ہوئے ساز پر بیٹی کی آواز ان کے گھر میں ہر وقت گونجتی رہتی تھی! جب آشا ایک ننھی سی بچّی تھی تب سے وہ اپنے باپ کے سینے سے چمٹ کر یا گانا سنا کرتی تھی یا سنایا کرتی تھی! مگر آج اس کے ہونٹ منجمد ہو کر رہ گئے ہیں! اور کانوں میں گویا روئی ڈالی ہوئی بیٹھی ہے!

آشا کا باپ ایک مشہور معروف سنگیت کار تھا! مگر وہ شہرت کو ایسی خوشبو سمجھتا تھا جو ہوا کے ساتھ پھیل کر کچھ دیر بعد ہوا میں ہی تحلیل ہو جاتی ہے! رُتبے کو بھی وہ ایک ایسا نشہ سمجھتا تھا جو فن کار کو اپنا غلام بنا دیتا ہے! اور سمجھتا تھا کہ جو خود غلام ہو وہ دوسرے پر کیسے راج کر سکتا ہے! ایسی باتیں سنا سنا کر وہ اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو شہرت میں شریک بنانے کی بجائے اپنی منطق کے حوالوں سے اکثر رشتوں اور ناطوں کا احساس دلاتا رہتا ہے! باپ اور بیٹی کا ایک اٹوٹ جذباتی رشتہ ہوتا ہے جبکہ ایک سنگیت کار اور سنگیت کا ایک ناطہ ہوتا ہے! گویا رشتوں اور ناموں کی کیفیت

جُدا جُدا ہے! ایک سہارا ٹوٹ گیا تھا اور ساتھی بھی روٹھ گیا تھا! سُر خاموش ہو گئے تھے، ٹھمری مرثیہ بن گئی تھی! اور دادنوحہ خوانی!! تب پدما سسکتی رہتی اور اس کی اکلوتی بیٹی آشا یوں ہچکیاں لیتی رہتی جیسے ایک طبلہ بے ساز ہو کر تھپ، تھپ کر بج رہا ہو! ماں بیٹی دونوں اپنے آبائی وطن لوٹ آئے تھا! تو ماں نے جدائی کے بھاری وزن کو مجبوری کے بوجھ کے نیچے دفن کرنے کی کوشش کی مگر بیٹی نا سمجھ تھی اس لیے وہ اکثر ادھ کھلی کھڑکی سے جھانک کر بادل کے ٹکڑوں کو دیکھتی تھی! جن میں وہ اکثر اپنے والد کو دیکھتی رہتی تھی۔ کبھی وائلن بجاتے ہوئے! کبھی ریاض کرتے ہوئے اور کبھی اپنی بچّی کو سینے سے لگاتے ہوئے آشا کی خواہشات کا دِیا جب ٹمٹمانے لگا تب پدماوتی نے اپنے خونِ جگر سے دیا جلانے کی کوشش کی مگر آشا کی کیفیت ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی مانند ہوا کرتی تھی! پدماوتی نے بھی ایک سوئے ہوئے فنکار کو جگانے کی کوشش کی تھی! مگر محلے کے چند دل پھینک لڑکوں نے جب ایک اجنبی لڑکی کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی تب بھی ایک غیّور ماں خاموش رہی! فقط یہ سوچ کر شاید عشق کی تپش سے وہ برف پگھل جائے جس کے نیچے آشا کے جذبات احساسات و خیالات دب گئے ہیں! مگر برف کی ہر تہہ ایک گلیشر بن چکی تھی اور لوگ سمجھ بیٹھے تھے کہ آشا پاگل ہو گئی ہے!

آشا واقعی پاگل ہو گئی تھی!!

اس روز آشا کے پاپا کا تین ماہ کا شرادھ تھا! پدماوتی نے مرحوم کی آتما کی شانتی کے لیے بہت سارے پنڈتوں کو گھر بلایا تھا! وہ لوگ منتر پڑھ رہے تھے اور اچانک جانے کیا سوچ کر آشا نے ایک بھجن گایا تھا! ایک طویل عرصے کے بعد اس کی درد بھری آواز سن کر پدماوتی تو کیا پنڈت بھی یوں رو پڑے تھے جیسے سیلاب کا پانی بے قابو ہو کر سب کچھ بہا کے لے جا رہا تھا!!

سیلاب کا پانی بہہ چکا تھا اور آشا یوں بے ہوش پڑی رہی جیسے ملبے کے نیچے آخری سانسیں لیتا ہوا کوئی بدنصیب!

پھر کئی روز بعد بستر پر کرٹیں بدلتے ہوئے آشا نے ایک جریدے میں چھپے ہوئے ایک مضمون کو دیکھ کر چونک پڑی تھی!

یہ جریدہ شہر سے لایا گیا تھا! ڈاکٹر اپنی غفلت کی وجہ سے وہاں چھوڑ گیا تھا! مگر جو اثر ڈاکٹر

کی دوائیاں نہ کر سکی تھیں وہ کرشمہ اس مضمون نے کر کے دکھایا تھا! ایک طویل عرصے کے بعد خود ہاتھ منہ دھو کر ہاتھ میں جریدہ لیے وہ دہلیز پر یوں بیٹھی رہی گویا پلیٹ فارم پر گاڑی کا انتظار کر رہی تھی! اور بار بار مضمون پڑھ رہی تھی! یہ مضمون ترلوک پنڈت پر خاص طور سے لکھا گیا تھا! اور آشا بار بار پنڈت جی کے فن کے بارے میں کچھ پڑھنے کی بجائے ان کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر یوں خلاؤں میں گھورنے لگی تھی گویا ایک نامکمل تحریر کو پورا کرنے کی خاطر خانہ پُری کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور چند روز بعد ماں کو بیٹی کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال کر ترلوک پنڈت کے آشرم جانا پڑا تھا۔

طے یہ ہوا تھا کہ آشا ترلوک پنڈت کو ایک بار دیکھ کر فوراً واپس لوٹ کر آئے گی، مگر پنڈت جی کو دیکھتے ہی ماں کا ارادہ بھی بدل گیا تھا اور بیٹی کی ضد خدشات پر حاوی ہو کر دونوں کے عمل کا حصّہ بن گئی ہے! دونوں ترلوک پنڈت کے قُرب میں رہنا چاہتی ہیں!

ماں اور بیٹی دونوں جب ترلوک پنڈت کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی ہیں! تب یوں محسوس ہوتا رہا ہے جیسے وہ دونوں ایک دُھندلے آئینے میں ماضی کے عکس دیکھ رہی ہوں!

پہلے پہل ترلوک پنڈت آشا کو اپنا فین سمجھ کر بس مسکراتا رہا مگر آشا کی معنی خیز نگاہوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بھی رفتہ رفتہ آشا میں خاصی دلچسپی لینے لگا۔

آخر تجسّس کھل گیا! پنڈت جی آشا کو اپنے ساتھ بٹھا کر جب بھی ریاض کرتا رہتا تھا تب آشا کی انگلیاں اکثر تان پورے سے یوں پھسل جایا کرتی تھیں جیسے ایک گلیشیر پر چڑھتا ہوا کوئی اناڑی اچانک پھسل کر کسی کھائی میں گرتا جا رہا ہو! بار بار!!

لیکن پھر بھی آشا کو ہر بار یوں محسوس ہوتا رہتا تھا جیسے اس کا پسندیدہ شخص اس کے سامنے بیٹھا تو ہے مگر بیچ میں ایک شیشے کی موٹی دیوار ہے! اور دیوار کو ہٹانا ہی اُس کی زندگی کا واحد مقصد ہے!

کاش یہ دیوار شیشے کی نہیں بلکہ برف کی ہوتی! شاید چاہت کی تپش یا خلوص کی آنچ سے پگھل جاتی! اور آج یہ دیوار ہٹ گئی تھی!!

ترلوک پنڈت کے ہال نما کمرے میں ہر وقت سازندے موجود رہتے ہیں! پنڈت جی

کے مدّاح بھی ہر وقت موجود رہتے ہیں! دُور دراز علاقوں سے آئے ہوئے موسیقار آس پاس موجود رہتے ہیں! مگر آج صبح سویرے جب آشا نے دروازہ کھولا تھا تو پنڈت جی سازوں کے بغیر ہی ریاض کر رہے تھے۔

کیونکہ آشا کو اِسی دن کا شدّت سے انتظار تھا۔ اس لیے اور وہ پنڈت جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن کے سُر سے سُر ملا کر گاتی رہی۔ ساز اور آواز کی جگل بندی ہال میں گونجنے لگی، تو برآمدے میں لوگ جمع ہوتے گئے۔

اچانک ترلوک پنڈت نے اپنے دونوں بازویوں پھیلا دئے جیسے ایک کمزور باندھ کی ایک دیوار ٹوٹ گئی اور بے قابو پانی بہتا جا رہا تھا۔

جبکہ زندگی میں پہلی بار ایک دوشیزہ سے لپٹ کر ۴۰ سال ترلوک پنڈت کو یوں محسوس ہوا جیسے آبشاروں کا اُچھلتا ہوا پانی پتھروں سے ٹکراتا ہوا جل ترنگ بجا رہا ہو۔

کمرے کے ہر گوشے سے ساز بجنے لگے مگر آشا کی کیفیت نرالی تھی۔

نظریں اٹھا کر جب اس نے پنڈت جی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔ کیونکہ اس نے ٹھنڈک کی بجائے ایک جھلس دینے والی آنچ محسوس کی۔ جب ترلوک پنڈت کے تھرتھراتے ہونٹوں نے آشا کے ہونٹوں کا بوسہ لینا چاہا تب آشا چیخ پڑی تھی اور اپنے بولے ہوئے ''پاپا'' کی گونج سُن کر وہ ترلوک پنڈت کے جسم سے الگ ہو کر یوں بے ساختہ رو پڑی جیسے ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد آوارہ بادل کسی جنگل میں بے بس ہو کر پھٹ کر برس پڑے ہوں!

''پاپا'' کا لفظ سن کر ترلوک پنڈت یوں ڈگمگانے لگا جیسے وہ موجوں سے ٹکراتی ہوئی کشتی کے بادبان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر وہ ایک خندق میں ہاتھ پاؤں مار کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں لفظ 'پاپا' کے ساتھ ساتھ بادلوں کے پھٹ جانے کی آواز گونجتی رہی اور وہ بڑبڑاتا رہا۔

''کون ہے لڑکی؟ کون ہے یہ لڑکی؟''

پدماوتی کے آنسو اس کے گالوں کو چھو کر اس کے سینے میں پناہ لیتے رہے! اور اس کے ہونٹ یوں تھرتھراتے رہے جیسے تیز ہوا کے جھونکوں سے درخت کے پتّے!!

ترلوک پنڈت کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھ کر پدماوتی کچھ کہتے ہوئے رُک گئی مگر پھر ایک آہ بھر کر وہ نظریں پھیر کر یوں بول پڑی جیسے ہر لفظ گلے کو لہولہان کرتا ہوا باہر آ رہا تھا!

''یہ معصوم لڑکی اس عظیم سنگیت کار کی بیٹی ہے! جس نے مرتے وقت اپنی خوبصورت آنکھیں دے کر تمھاری دُنیا روشن کر دی ہے! ترلوک پنڈت!''

''تو کیا؟ تو کیا؟ یہ لڑکی! یہ لڑکی مرحوم پرکاش پنڈت کی بیٹی ہے؟۔!!۔؟؟''

ترلوک پنڈت بڑبڑانے لگا اور پھر اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ یوں رو پڑا جیسے وہ ان اُجالوں پر مرثیہ پڑھ رہا ہو جو تقریباً چھ ماہ پہلے پرکاش پنڈت اسے دے چکا تھا!

آس پاس کھڑے نوکر پنڈت جی کے شاگرد، مدّاح، ملاقاتی ماں، بیٹی کو دیکھتے رہے اور وہ بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف یوں چل رہے ہیں جیسے وہ شمشان گھاٹ سے اُٹھ کر اپنے اُجڑے گھر کی طرف جا رہے ہوں!!

ماں بیٹی دونوں پر ایک جیسی کیفیت طاری ہو چکی ہے!

☆☆

☆..........ڈاکٹر ناصر عباس نیر

# ہاں، یہ بھی روشنی ہے!

کچھ نہیں بدلا۔ سب کچھ بدل گیا۔ اس محل میں اس نے انتیس برساتیں گزاری تھیں۔ بارہ سال بعد محل پر پہلی نگاہ پڑی تو لگا کہ کچھ نہیں بدلا، دوسری نظر سے معلوم ہوا، کچھ پہلے جیسا نہیں۔ کتنی برساتیں گزریں تب کہیں جا کر دوسری نظر حاصل ہوئی۔ بوڑھے باپ کی التجا اسے محل میں لائی تھی۔ باپ سے دیکھا نہیں گیا کہ شاہی قبیلے کا وارث اپنی رعایا کے دروازے پر کھڑا ہو۔ باپ نے بیٹے کو دیکھا۔ سمجھا پھر بھی نہیں، بیٹا اس کا وارث نہیں۔ بیٹے نے وراثت کا اصول بدل دیا تھا۔ باپ، بیٹے کو نام دے سکتا ہے، وراثت بیٹا خود بناتا ہے۔ راجہ کا بیٹا، راج کو گرد کی طرح جھاڑ دیتا ہے اور ننگے پاؤں چلتے ان زمانوں میں پہنچ جاتا ہے، جہاں کی خبر بھی باپ کو نہیں ہوتی۔ وہ اپنا حسب نسب نئے سرے سے ترتیب دیتا ہے۔ باپ اور اس کے پرکھوں کا شجرہ الگ ہو جاتا ہے۔

اس کو محل کی سیر کی ہوس نہیں تھی۔ وہ جہاں چاہتا سیر کے لیے جا سکتا تھا۔ محل میں اس کی نظریں سینکڑوں لوگوں پر پڑ رہی تھیں۔ وہ سب اسے تعظیم و پرستش کے جذبات سے دیکھ رہے تھے، مگر اس وقت اس کی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ رفیق خاص نے پہلی بار اس کی آنکھوں کو بے چین دیکھا تو پریشان ہوا۔ وہ سمجھ گیا۔ رفیق خاص سے کہا: سنو، ایک بے چینی ایسی بھی ہے جو صرف یاد دلانے کے لیے ہے کہ وہ اب بھی آدمی ہے۔ آدمی ہونا ایک بات ہے، اور آدمی رہنا دوسری بات

ہے۔رفیقِ خاص نے عرض کیا، آدمی رہنا بڑی بات ہے۔

سب اشارہ پا کر رخصت ہوئے۔

وہ دونوں، اسی کمرے میں ہیں، جس میں اس نے چند گھنٹوں میں بچے اور اپنی ہم عمر بیوی کو چھوڑ کر وفادار غلام کے ساتھ جنگل کا راستہ لیا تھا۔کیا میں اس کے دل کو پڑھ سکتا ہوں؟ اس نے سوچا۔وہ جہاں چاہتا تھا، چھن بھر میں پہنچ جاتا تھا۔وہ خود کو ہزاروں صورتوں میں، سب کی صورتوں میں ڈھال سکتا تھا، وہ آدمی سے بڑھ کر تھا، اس کے پاس وہ ساری روشنی تھی، جو آدمی میں ظاہر ہو سکتی ہے اور جسے آدمی کی ہستی سہار سکتی ہے۔کیا وہ اس روشنی کے ساتھ، عورت کے دل میں اتر سکتا ہے؟ اس نے ایک لمحے کو سوچا۔

تم چپ کیوں ہو؟ کچھ بولو۔

اس نے آنکھیں اس کے چہرے پر ٹھہرا دیں۔لو پڑھ لو۔

وہ اس کے دل میں تھا۔گزرے عالم کی سیر کرنے لگا۔

جب تم اس رات رخصت ہو رہے تھے، ایک عجب بے قراری تمھارے قدموں میں تھی۔ تم تین مرتبہ کھڑکی تک گئے، باہر جھانکا، قدم آگے کیے، پھر واپس آئے۔میرے پیروں کو پہلے چھوا، پھر ان پر پلکیں رکھیں، پھر ہونٹ رکھے۔تپش، نمی، مہک، لرزش، کچھ دوسری ان کہی چیزیں پاؤں کے راستے میرے دل میں اتر گئیں۔میرے پیروں پر ہونٹ تم نے رکھے، زمین میں، مَیں گڑ گئی۔تم نے میرے گال یا ماتھا یا ہونٹ اس لیے نہیں چومے کہ کہیں میں جاگ نہ جاؤں۔تم بارہ سالوں میں یہ تک نہ جان سکے کہ میں تمھیں آنکھوں سے زیادہ، تمھارے بدن کی خوشبو اور بدن کے گرد روشنی کے ایک ہالے سے پہچانتی ہوں...... جانے تم کس روشنی کو ڈھونڈنے گئے تھے......تم جوں ہی کمرے میں داخل ہوئے تھے، میں نے تمھاری خوشبو محسوس کر لی تھی، حالاں کہ میں اس رات نڈھال تھی اور خود اپنے جسم سے اٹھتی ایک اور طرح کی مہک محسوس کر رہی تھی۔تم نے سمجھا تم نے مجھ سے معافی مانگ لی، انتظار نہیں کیا کہ میں بتا سکوں کہ مجھ میں معاف کرنے کی سکت ہے بھی یا نہیں۔شاید تمھیں عورت کی استعداد کا خیال بھی نہیں آیا۔یہ کیسی معافی تھی؟ تمھارا دھیان میری طرف تھا کب؟ تم نے پالنے میں سوئے ننھے کو بار بار دیکھا، جس کے آنے کا ہم نے بارہ سال...... پورے بارہ سال......ہم

دونوں نے انتظار کیا۔ جب وہ آیا تو تم اسے بارہ گھنٹے بھی نہ دیکھ سکے۔ تم نے ثابت کیا، منش کے لیے دنیا ہے، ناری کے لیے منش اور اس کا دیا ہوا تحفہ یعنی بچہ۔ ایک نیا منش، جو کوکھ سے سیدھا چھاتی پر آجاتا ہے، پھر سینے میں۔ وہ ایک نئی قید میں آجاتی ہے۔ منش نہیں دیکھتا...... منش کچھ نہیں دیکھتا کہ کوکھ اور چھاتیاں سوکھتی ہیں تو عورت پر کیا گزرتی ہے، وہ تو دنیا کے لیے نکل چکا ہوتا ہے۔ اس کے دل میں ساری دنیا کے راز جاننے کا جنون ہوتا ہے، نہیں ہوتا تو عورت کے دل کو جاننے کا جنون۔ وہ عورت کے دل کو جیتنے، اور آگے بڑھ جانے سے پرسن ہوتا ہے۔

وہ دونوں اپنے کمرے میں تھے۔

تم وہ نہیں ہو، کوئی اور ہو۔ تم کیسے اس دل کو پڑھ سکتے ہو؟ تم پرائے بن گئے ہو۔ تمھیں کہاں معلوم ہوگا، میں نے چھ سال تک تمھارے پل پل کی خبر رکھی۔ تم ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں گئے، ایک کے چرنوں میں بیٹھے، دوسرے کی بندگی میں پیش ہوئے۔ سب کو چپ چاپ چھوڑا، اور آگے چلتے رہے۔ تم نے بھوک پیاس کاٹی، بھوگ بلاس ترک کیا۔ بدن سوکھ کر کانٹا بن گیا، مانو یہ کانٹا میرے دل میں چبھ گیا۔ اس کے بعد کی مجھے خبر نہیں۔ میں سوچتی تھی، تم ضرور واپس آؤ گے۔ مجھے خود معلوم نہیں، مجھے یقین کیوں تھا۔ شاید اس لیے کہ میں اس زندگی کو دھیان میں بھی نہیں لاسکتی، جس میں تم نہ ہو۔ تم آئے ہو، پر کوئی اور بن کر۔ میں غلط سوچتی تھی، مجھے کہاں خبر تھی کہ جو سدھار جاتا ہے، وہ واپس نہیں آتا۔ وہ آتا بھی ہے تو اور بن کر آتا ہے۔

یہاں بیٹھو، میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ اس نے اشارے سے بلایا، اور کہا: نہ میں وہ ہوں، نہ تم وہ ہو۔

کیا میں تمھارے بچے کی ماں نہیں ہوں؟

تم میرے ہی بچے کی ماں ہو، مگر وہ نہیں ہو، جو پہلے تھیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم وہی ہیں جو بارہ سال پہلے تھے، یہ دھوکا ہے، ایک بھول ہے، اور اس بسواس کا نتیجہ ہے کہ ہم سدا موجود تھے، اور سدا موجود رہیں گے۔

میں تو وہی ہوں، مگر تم واقعی بدل گئے ہو۔ اس نے اپنی آواز میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔

اچھی بات ہے کہ تم مجھے پہچاننے لگی ہو۔ خود کو بھی پہچان جاؤ گی۔ کوئی شے دائم نہیں، مگر

دائم ہونے کا مسلسل دھوکا دیتی ہے، یہ گیان کی طرف پہلا قدم ہے۔

سب لوگ تمھیں سب سے بڑی آتما کہتے ہیں، تمھاری پرستش کرتے ہیں، میں تو پہلے دن سے تمھاری پوجا کرتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے تمھیں پہچانا تھا۔اس نے پرتیت سے کہا۔

آتما؟ کون سی آتما؟ آتما دھوکا ہے۔آتما ہوتی تو تم یوں نراش ہوتیں؟ آتما ہوتی تو میں اس طرح مارامارا پھرتا؟

تم بدل گئے ہو، یہ تو تمھارے ان گیروے کپڑوں، ننگے پاؤں، ہاتھ میں کاسے ہی سے ظاہر ہے، مگرتم کاٹھ کے بن جاؤ گے، اس کا مجھے بسواس نہیں ہو رہا۔اس کا دل جیسے زخمی تھا۔

اِس پر اس نے خاموشی اختیار کی۔ اس کا چہرہ اب بھی مطمئن تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ کمرے کی دیواروں کو دیکھا، اس کھڑکی کو دیکھا، جہاں سے وہ اس رات روانہ ہوا تھا۔ڈھلتے سورج کی زرد کرنیں کمرے کی دیواروں پر پڑ رہی تھیں۔کمرہ پہلے ہی کی طرح تھا۔اسے کچھ راتیں یاد آئیں، لیکن رات میں پرچھائیوں کی طرح گزر گئیں۔اُس نے، اِس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے وہ پھول یاد آئے جنھیں وہ باغ میں بیٹھ کر دیکھا کرتا تھا، ایک لمحے کو کھلے ہوئے، روشن، حسین نظر آتے، اگلے لمحے مرجھا جاتے، اس سے اگلے سے زمین پر سوکھی زرد پتیاں ہوتیں۔عورت کا چہرہ بھی پھول ہی ہے۔عورت کا جسم بھی پھول ہے۔مرد کا جسم بھی پھول ہے۔ اس جہالت کے دور ہونے میں وقت لگتا ہے کہ پھول کا کھلنا، اس کے مرجھانے کی طرف اس کا سفر ہے۔ ہر ابتدا، اپنے انت کی طرف بڑھتی ہے۔

تم دنیا کے بڑے بڑے سوالوں کے جواب دیتے ہو، مجھے ایک سوالی سمجھ کر ایک سوال کے جواب کی بھکشا دے دو۔

پہلی بار اس کے دل میں جنبش سی ہوئی۔

پوچھو۔

تمھارے پاس روشنی ہے جو سب کی جہالت دور کرتی ہے۔کیا میرے دل کا اندھیرا دور نہیں کر سکتی؟

تم نے صحیح سوال پوچھا۔صحیح سوال، صحیح راستے کی طرف قدم ہے۔

وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔اس کے ہاتھ کو چھونا چاہا۔اُس نے روک دیا۔وہ تڑپ اٹھی۔میرے صحیح قدم کو تم نے کیوں روک دیا؟ کیا میرا صحیح قدم، تمھارے صحیح راستے سے ٹکراتا ہے؟

تم ہر سوال پوچھو۔ ہر قدم اٹھانے سے پہلے صحیح راستہ چنو۔صحیح راستہ یہ ہے کہ تمھارے دل کا اندھیرا میں دور نہیں کرسکتا۔ہاں، تم خود چاہو تو دور کرسکتی ہو۔اس نے کمرے کے ننگے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس مرتبہ اس نے، اس کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔مجھے اپنے دل کا اندھیرا دور کرنے سے نہ روکو۔پاؤں پر مٹی جمی تھی، اس کا جی چاہا مٹی کا ایک ایک ذرہ پہلے ہاتھ کی لکیروں میں جذب کرے، پھر یہ ہاتھ وہ اپنی آنکھوں کو لگائے، پھر اپنے بدن پر پھیرے۔اسے ایک لمحے میں یقین حاصل ہوگیا کہ صرف ایک پل میں معجزہ ہوسکتا ہے، وہ دوبارہ جی سکتی ہے۔سالوں سے سوکھی کھیتی، بس پل بھر میں ہری ہوسکتی ہے۔اس نے لمبی پتلی انگلیوں والے سوکھے پاؤں سے ہولے ہولے مٹی کی تہ ہٹائی۔لمس کا ایک تیز سیل اس کے سارے بدن میں سرایت کرگیا۔ہلکی سی روشنی پھیلی۔اندھیرا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔پرندے پہلے پھڑ پھڑائے، پھر چہکنے لگے۔تازہ پھول کھل اٹھے۔سویا ہوا شہر جاگ پڑا۔اس نے سہج سہج دونوں پاؤں پہلے ہاتھوں سے صاف کیے، پھر دھوئے۔اس نے ان کھردرے پاؤں پر آنکھیں رکھ دیں۔آسمان پر تارے اگ آئے تھے۔کمرے میں مشعل جلادی گئی تھی۔

اس نے پاؤں کو ذراسی جنبش دی۔

جب تم پاؤں پر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پھیرتے ہوئے، اپنے بدن کے شہر کو جاگتے ہوئے محسوس کررہی تھیں تو جو روشنی پھیلی تھی، وہ میں تھا، جو پرندہ چہچہایا تھا، وہ میں تھا، جو پھول کھلے تھے، وہ بھی میں تھا۔تم اپنے بدن میں لمس کے جس دھارے کو محسوس کررہی تھیں، وہ بھی میں تھا۔تمھیں جاننے میں وقت لگے گا کہ تمھارے دل کا اندھیرا اس وقت تک دور نہیں ہوسکتا، جب تک میں تمھارے اندر رہوں۔

میں تمھیں اپنے دروازے کی چوکھٹ سمجھتی ہوں اور تم خود کو میرے راستے کا پتھر کہتے ہو؟ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنی مدت بعد جاگنے والا شہر دوپہر بھی نہ دیکھے۔

ہر دوسرا، راستے کا پتھر ہے۔ تم اپنی روشنی کو خود آ کار کرو۔

میں خود کو دوسرا سمجھتی ہوں اور تمھیں اپنی روشنی محسوس کرتی ہوں۔ مجھے میری روشنی سے کیوں دور کرتے ہو؟

تم بھول کا شکار ہو، اس بھول کا، جس کا آغاز تمھارے جنم سے ہوا۔ اسی جنم میں اپنی بھول ختم کرو۔ تمھارے بدن کا شہر کئی سالوں بعد جاگا ہے، تم اس کی سب آوازوں کو سننا چاہتی ہو۔ سنو، ہر آواز شروع ہوتے ہی، اپنے انت کی طرف سفر کرتی ہے۔ ہر صبح جب دوپہر کی طرف بڑھتی ہے تو پہلے صبح کا زوال ہوتا ہے، پھر دوپہر کا۔ بے بس کر دینے والے لہو کی تپش ٹھنڈی ہو کر رہتی ہے۔ کوئی آگ سدا نہیں جلتی۔ ہر آگ جلنے بجھنے، شعلے سے راکھ ہونے کا سلسلہ ہے، اور یہ سلسلہ دکھ دیتا ہے۔

تم مجھ میں اپنی روشنی نہیں دیکھ رہیں، اپنا دکھ دیکھ رہی ہو، مگر نہیں جانتی ہو۔ اس نے کہانی دہرائی۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے وہ خود کھڑی ہے، ایک موہنی بچی کی صورت، تھوڑی ہی دیر میں خوبرو لڑکی، اگلے چند لمحوں میں کہن سال عورت، پھر لاٹھی ٹیکتی بوڑھی عورت۔ کیا تمھاری آنکھوں پہ بندھی پٹی اب بھی باقی ہے؟ اس نے فتح مندی کے احساس کے ساتھ سوال کیا۔

اس نے سوچا، اگر وہ آج بھی نہ کہہ سکی تو کبھی نہ کہہ سکے گی۔

تمھیں یہ کیوں گھمنڈ ہے کہ تمھارا گیان مکمل ہے؟ تمھارے گیان میں صرف تم ہی تم ہو، کوئی دوسرا نہیں۔ تم نے بارہ سال جنگلوں میں گزارے۔ میں نے بھی بارہ سال اس قید خانے میں گزارے، کاٹھ کی طرح نہیں۔ تم نے اپنے لیے ساری کائنات کو چن لیا، مجھے اس محل کے بندی خانے میں ڈال دیا۔ تمھیں خیال آیا کہ جس سفر پر تم نکلے تھے، اس کی آرزو مجھے نہیں ہو سکتی تھی؟ تم بھی یہ سوچتے تھے کہ عورت میں آتما نہیں ہوتی؟ کیا تنہائی میں عورت پر اس بات کی یلغار نہیں ہوتی کہ دنیا میں دکھ کیوں ہے، بڑھاپا کیوں ہے، موت کیوں ہے؟ تم اپنی کھوپڑی کو میری کھوپڑی سے بڑا سمجھتے ہوں گے، مگر تمھارا دل، میرے دل سے بڑا نہیں ہے۔ تمھاری کوکھ ہوتی تو پھر بھی جنگل جاتے؟ کوکھ بھی سوچتی ہے۔ تم ہر زمانے میں، ہر جگہ، کوئی بھی صورت اختیار کر کے جا سکتے ہو۔ تم اس زمانے میں بھی گئے ہو، جب تم اپنی ماں کی کوکھ میں قوس بنے ہوئے تھے؟ میں تمھیں بتاتی ہوں کہ کوکھ بھی سوچتی ہے، اور وہاں موجود جیو بھی سوچتا ہے۔ باہر آ کر سب بھول بھال جاتا ہے۔ جانتے

ہو جیو کیا سوچتا ہے؟ وہی سوچتا ہے جو کوکھ سوچتی ہے، اور جو کوکھ سوچتی ہے وہی جیو سوچتا ہے۔ یہ بھی سنو، کوکھ اور جیو سے پہلے ایک پل ایسا آتا ہے، جب دو سانسیں ایک سانس بنتی ہیں۔ ایک نہ بن سکیں تو جیو اور کوکھ میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ مانو جیو پہلے پل ہی جلاوطن ہو جاتا ہے اور آگے جلاوطن ہوتا رہتا ہے۔ لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔ تم دو سانسوں کے ایک سانس بننے کو بھول چکے ہو۔ اس لیے تمھیں یاد نہیں کہ پریم، گیان سے بڑا ہے۔ تم کہتے ہو، ہر شے اپنے زوال کی طرف بڑھتی ہے۔ میں کہتی ہوں، ہر شے اپنی تکمیل کی طرف بڑھتی ہے۔ شہر کو آنکھیں کھولنے کے بعد انگڑائی لینی چاہیے، چلنا چاہیے، دوڑنا چاہیے۔ دوپہر ہو، رات ہو، تاکہ پھر ایک صبح ہو۔

یہ ایک چکر ہے۔ یہ چکر دکھ دیتا ہے۔ یہ چکر ختم کروگی تو بریت ہوگی۔ اس نے اپدیش کے انداز میں کہا۔

تم کہتے ہو لہو کی تپش شروع ہوتے ہی خاتمے کی طرف بڑھتی ہے۔ یہ ہے تمھارا گیان! گیان میں اتنی بزدلی، اتنا ڈر بھی ہوتا ہے، مجھے بسواس نہیں آتا۔ جسے تم چکر کہتے ہو، اسی چکر نے تمھیں، مجھے جنم دیا اور پھر ہم نے اُسے جنم دیا۔

تم اور طرح سمجھ رہی ہو۔ میں آدمی کے پیدا ہونے کے خلاف نہیں۔

لہو کی تپش کے بغیر آدمی پیدا ہو سکتا ہے؟

وہ لاجواب ہو گیا۔ وہ ڈر گیا۔ بارہ سال محل کی چاردیواری میں رہنے والی، کیسے اس کے آنند کے لیے خطرہ ہو سکتی ہے؟ اس نے سوچا۔

لوہا گرم تھا۔

سنو، جب تم چلے گئے تو میں چھ سال روئی۔ پھر میں نے ایک خواب دیکھا۔ اپنی کھوپڑی میں بھرے سارے جہان کی شکتیوں کو بلالو تاکہ اس خواب کو سنتے ہوئے، تمھارا آنند برقرار رہے۔ ساتویں سال کی پہلی رات تھی۔ وہ محل کے دوسرے کمرے میں سونے لگا تھا۔ میں نے آدھی رات سے پہلے کنیزوں کو جانے کے لیے کہہ دیا۔ نیند خواب کی طرح تھی۔ میرا اس پر اختیار نہیں تھا۔ ذرا ذرا سی دھند پھیلنا شروع ہوئی۔ مدھم سر کا آغاز ہوا۔ خیال کا سلسلہ ٹوٹنے لگا، اور ایک نئی دنیا کا دروازہ معمولی چیں کے ساتھ کھلنے لگا۔ پھر مکمل بے خبری۔ پھر ایک نئی دنیا میں تھی۔ جیسے بیج پھوٹتا ہے

تو دھرتی کی ناف پر ایک لکیر سی ابھرتی ہے۔ مدت کے بعد وہ لکیر ابھری۔ بیج نے اودھم مچایا۔ مانو دھرتی کی گہرائی میں بھونچال آیا۔ بالآخر بیج ٹوٹ گیا، اور بھونچال کو قرار آ گیا۔ بے خبری سے پہلے کی حالت لوٹ آئی۔ اتنی سرشاری۔

اس نے دیکھا، اس کا ہاتھ اس کے کاندھے تک آیا۔ لگا، جیسے اس کی گردن دبوچ ڈالے گا۔ کیا یہ خواب تھا اور بیج کس درخت کا تھا؟ اس کی آواز میں عجب درد تھا۔

وہ اس کی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ تم نے ہی تو کہا ہے کہ تم سب صورتوں میں ڈھل جاتے ہو۔ وہ درخت تم ہی تھے۔ جب اس نے اس کے سینے کے بالوں پر ہاتھ رکھا تو اس نے محسوس کیا کہ اس نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی تھی۔ وہ اس کے سینے سے ہونٹوں تک پہنچی۔ اِدھر رات آدھی ہوئی تھی، مشعل بجھا دی گئی تھی، اُدھر دونوں کے بدن دہک رہے تھے۔ آگ آگ سے ٹکرا رہی تھی۔ سمندر ہچکولے کھا رہا تھا۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ بارش ختم ہونے کے لیے شروع ہوتی ہے۔ بارش کتنی اچھی ہے، اس نے محسوس کیا، لیکن بارش بالآخر تھم گئی۔ دونوں کے جسم بارش میں نہائے درخت کی طرح چمک رہے تھے۔ دو سانسیں، ایک سانس بننے کے بعد ہموار تھیں۔

مجھے بسواس ہے کہ یہ رات ایک نئے سویرے کو جنم دے گی، اور اس مرتبہ تم اسے اپنی روشنی پانے کے سفر میں اکیلا نہیں چھوڑ گے!

اس نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، مسکرایا، اور کہا: ہاں! یہ بھی روشنی ہے۔

وہ دوسری مرتبہ مسکرایا تھا۔ اس کے گواہ دیوتا نہیں تھے، اکیلی وہ تھی۔

اس نے وہ مسکراہٹ جس پتھر میں قید کی، اسے ابھی کسی نے دریافت نہیں کیا۔

☆☆

☆..........احمد صغیر

# ہم سفر

شام نے اپنے گیسو پھیلا دیئے تھے۔سورج آہستہ آہستہ روپوش ہو رہا تھا اور ہر آدمی جلدی جلدی اپنے گھر پہنچنے کے لئے بس اسٹاپ کی طرف بھاگ رہا تھا۔میں بھی اپنے دفتر سے نکل کر بس اسٹاپ پر آ گیا اور ایک بینچ پر بیٹھ کر بس کا انتظار کرنے لگا۔مجھے جامعہ نگر جانا تھا اور میری بیوی ابھی تک نہیں آئی تھی۔وہ بھی پاس ہی کے دفتر میں نوکری کرتی ہے،اس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں بس اسٹاپ پر بیٹھا آس پاس کا جائزہ لینے لگا کچھ ہی فاصلے پر بلو رنگ کی جینس اور پنک کلر کی کرتی پہنے ایک لڑکی بیٹھی تھی،اس کے بغل میں ایک لڑکا بھی بیٹھا تھا جو لڑکی سے زیادہ ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز باتوں میں مشغول تھے۔اسی بینچ کے بالکل آخری کنارے پر بڑے پستان والی ایک عورت بیٹھی تھی۔اس کی عمر یہی پینتس سال ہوگی۔اس کے ساتھ دو بچے تھے۔ایک تقریباً آٹھ سال کا اور دوسرا چھ سال کا۔دونوں ماں کے بغل میں خاموش بیٹھے تھے۔بس اسٹاپ پر کئی مرد عورتیں کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہیں۔ایک لڑکی میرے کچھ فاصلے پر کھڑی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔وہ موبائل پر بار بار نگاہ کرتی۔شاید کسی کی کال آنے والی تھی۔اس کے چند قدم کی دوری پر ایک ضعیف شخص کھڑا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک تھیلہ تھا۔غالباً وہ کچھ سامان خرید کر گھر لوٹ رہا تھا۔اس سے ذرا ہٹ کر ایک ادھیڑ عمر عورت بھی بس کے انتظار میں کھڑی سامنے کی سڑک پر آتی بسوں کو تک رہی ہے جب اس کے نمبر کی بس نہیں آتی تو اس کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں ابھر آتیں۔

ایک ساتھ کئی بسیں آئیں اور لوگ چڑھنے لگے۔ایک بس پر وہ ضعیف شخص سوار ہو گیا تو دوسری بس پر وہ ادھیڑ عمر عورت۔بس اسٹاپ پر بھیڑ قدرے کم ہو گئی۔وہ لڑکی جو بار بار گھڑی دیکھ

رہی تھی۔ کسی بھی بس پر سوار نہیں ہوئی یا تو اس کی بس نہیں آئی تھی یا اسے کسی اور کا انتظار تھا۔ میرے ساتھ بینچ پر بیٹھے لڑکے لڑکی اور وہ بڑے پستان والی عورت بھی اسی طرح بیٹھی تھی۔ لڑکی نے اس لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لڑکے نے دوسرا ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیا۔ لڑکی مسکرانے لگی۔ بڑے پستان والی عورت نے دونوں کو ایک بار دیکھا پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اس کے دونوں بچے اب کھڑے ہو گئے۔

''ممی پیشاب کرنا ہے'' ـــــ بڑے بیٹے نے کہا۔

''ممی مجھے بھی'' ـــــ چھوٹے بیٹے نے بھی کہا۔

''پیچھے کر لو'' ـــــ بڑے پستان والی عورت نے بیٹھے بیٹھے بس اسٹاپ کے پیچھے اشارہ کیا۔ دونوں پیچھے چلے گئے۔ بس اسٹاپ کے پیچھے ایک چھوٹی سی نالی بہہ رہی تھی۔ نالی کے قریب دیوار تھی۔ دونوں بچے نالی کے کنارے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگے۔ چھوٹے والے نے اپنے پیشاب کی دھار بڑے کی دھار سے ملایا۔ بڑا والا بھی ذرا ترچھا ہو کر دھار سے دھار ملانے لگا۔ اب دونوں پیشاب کی دھار کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔

''دیکھتا ہوں کون کاٹتا ہے۔'' ـــــ بڑے لڑکے نے کہا۔

''میں کاٹوں گا'' ـــــ چھوٹے لڑکے نے کہا۔

لیکن اس کا پیشاب جلد ختم ہو گیا اور دھیرے دھیرے اس کی دھار کم ہو کر رک گئی۔

''میں جیت گیا!'' ...... بڑے لڑکے نے کہا۔ چھوٹا لڑکا بغیر کچھ کہے ماں کے پاس آ گیا۔ ماں نے بوتل سے پانی انڈیل کر ہاتھ پر دیا۔ اس نے ہاتھ دھو لیا۔ بڑے لڑکے نے بھی ہاتھ دھو لیا۔

''ممی آئس کریم!'' ـــــ چھوٹے لڑکے نے آئس کریم والے کو دیکھ کر کہا۔ آئس کریم والا ابھی آیا تھا۔ بڑے پستان والی عورت نے پرس سے بیس کے نوٹ نکالے اور بڑے بیٹے کو دیتے ہوئے کہا........

''دس دس کے دو آئس کریم لے لو''

..........................O..........................

دونوں بچے آئس کریم والے کے پاس چلے گئے۔ چھوٹا والا پہیئے پر چڑھ کر آئس کریم کے

ڈبے کے اندر جھانکنے لگا۔

''مجھے ڈنٹی والا چاہئے''

''مجھے ڈبے والا''

آئس کریم والے نے دونوں کی پسند کی آئس کریم دے دی۔ دونوں ماں کی بغل میں بیٹھ کر کھانے لگے۔

وہ لڑکی جو کافی دیر سے کھڑی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ سامنے سے ایک بائیک آ کر بس اسٹاپ پر رُکی۔ وہ جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ بائیک ایک لڑکا چلا رہا تھا اس نے تیزی سے بائیک آگے بڑھائی اور لڑکی اس کی پیٹھ سے چپکتی چلی گئی۔

میرے کچھ فاصلے پر بیٹھے لڑکے لڑکی ایک دوسرے کی انگلیوں سے کھیل رہے تھے اور باتوں میں مشغول تھے۔ جیسے آج پوری رات گزر جائے گی مگر بات ختم نہ ہوگی۔

''آئس کریم کھاؤ گی؟''——لڑکے نے لڑکی سے پوچھا۔

''ہوں!''——لڑکی نے چھوٹا سا جواب دیا۔

لڑکا اٹھ کر آئس کریم والے کے پاس گیا۔ پرس سے سو کا نوٹ نکال کر آئس کریم والے کی طرف بڑھایا اور دو مہنگے آئس کریم لے کر آ گیا۔ ایک لڑکی کو دیا اور دوسرا خود کھانے لگا۔ کھانے کے دوران دونوں خاموش رہے البتہ لڑکی نے اپنا ایک ہاتھ لڑکے کے کندھے پر رکھ دیا پھر اپنا کھایا ہوا آئس کریم اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ لڑکے نے تھوڑا سا کھا لیا۔ لڑکے نے بھی اپنا آئس کریم اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ اس نے اس کا ایک حصہ کھا لیا۔ آئس کریم کھانے کے بعد لڑکی نے پرس سے ہینکی نکال کر ہاتھ صاف کیا پھر لڑکے کی طرف بڑھایا۔ لڑکے نے اپنا ہاتھ صاف کر کے ہینکی واپس کر دیا۔

بس اسٹاپ پر دھیرے دھیرے بھیڑ بڑھنے لگی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ کی ابھی تک میری بیوی نہیں آئی ہے۔ میں نے ایک بار پھر بس اسٹاپ پر کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا' ایک بائیک آ کر رکی اس کے پیچھے چہرے کو نقاب سے ڈھکے ایک لڑکی اتری۔ اس نے لڑکے کو بائی کہا۔ لڑکا بھی بائی کہہ کر بائیک کو آگے بڑھا دیا۔ لڑکی بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کرنے لگی۔ اسی درمیان ایک لڑکی اپنا

پرس سنبھالتی ہوئی میری بغل میں جو تھوڑی سی جگہ خالی تھی بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف بس ایک بار دیکھا۔ اس ڈر سے نظر ہٹالی کہ اگر دیر تک گھور کر دیکھتا رہوں گا تو مجرم قرار پاؤں گا اور کسی لڑکی کو دیر تک دیکھنے کے جرم میں کئی سالوں تک جیل کی دیواروں کو دیکھنا پڑے گا۔

''آپ مجھے گھور رہے تھے!'' ـــــــ لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں تو!'' ـــــــ میں نے بغیر دیکھے کہا۔

''میں کہتی ہوں کہ آپ نے مجھے دیکھا ہے۔''

''صرف ایک بار.........''

''کیوں دیکھا۔''

''کسی کو بھی دیکھنا انسانی فطرت ہے''

''انسانی نہیں مردانی فطرت ہے''............ آس پاس کے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

''آپ جو سمجھ لیجئے''

''لیکن آپ نے مجھے دیکھا کیوں؟''

''یونہی نگاہ اُٹھ گئی......... اگر آپ کو دیکھنا میرا برا لگا تو معافی چاہتا ہوں''۔

''کمال کرتے ہیں۔ گناہ کر کے معافی مانگتے ہیں۔ اس طرح تو کوئی بھی گناہ کرے گا اور معافی مانگ کر بچ جائے گا''۔

''ایک بار دیکھنے کے لئے سرکار نے ابھی کوئی قانون نہیں بنایا ہے۔ جب قانون بنے گا تب میں سزا کا مرتکب ہوں گا''۔

''لیکن میری نظر میں آپ مجرم ہیں۔ اس لئے کہ آپ نے مجھے دیکھا ہے''۔

''میں نے معافی مانگ لی ہے''۔

اسی وقت ایک جلوس سڑک سے گزرنے لگا۔ جلوس میں بہت سارے مرد عورت ہاتھوں میں تختی لئے خاموش چل رہے تھے۔ جیسے ان کے لب کسی نے سی دیئے ہوں۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ تختی پر جو نعرے لکھے ہیں اسے کتنے لوگ پڑھ پائیں گے۔ اگر ہندوستان کا ہر آدمی اس نعرے کو پڑھ لیتا تو ملک میں انقلاب نہ آجاتا؟۔

''یہ جلوس کس چیز کے لئے نکلا ہے بابو جی؟''..........میرے تھوڑے فاصلے پر جوابھی ابھی ایک مزدور آ کر کھڑا ہوا تھا، بغل میں کھڑے آدمی سے پوچھا۔اس آدمی نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تختی میں سب لکھا ہے، پڑھ لو''..........اس نے جھنجھلا کر کہا۔

وہ مزدور خاموش ہو گیا۔ آئس کریم بیچنے والا بھی حیرت سے جلوس کو گزرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس مانگ کو لے کر جلوس نکالا گیا ہے۔

''دیکھا آپ نے لوگ عورتوں کی حفاظت کے لئے سڑکوں پر اتر آئے ہیں اور آپ یہاں بیٹھے ایک اکیلی لڑکی کو گھور رہے تھے''..........میری بغل میں بیٹھی لڑکی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ قانون بنانے سے اگر سدھار آ جاتا تو یہ ملک کب کا ترقی یافتہ ملک بن جاتا۔ انسان کو اپنی سوچ بدلنی ہوگی محترمہ۔ اپنا نظریہ بدلنا ہوگا۔ جب ہم گھر سے نکلتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ میرے گھر میں بھی جوان بہن ہے لیکن ہم دوسری لڑکیوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتے ہیں۔ جب ہم اپنی بہن کے ساتھ سفر کرتے ہیں تو ہرگز نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا مرد اس کی بغل میں بیٹھے لیکن جب ہم اکیلے رہتے ہیں تو لڑکی کی بغل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی بہن، اپنی بیوی کی عزت کی بڑی فکر ہوتی ہے اور دوسرے کی بہن کی عزت لوٹنے میں پل بھر کے لئے بھی اپنی بہن کا خیال نہیں آتا کہ جب وہ اکیلی باہر نکلے گی تو اس کے ساتھ بھی کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ جب تک ہم نہیں بدلیں گے ملک نہیں بدلے گا۔''

''تو پھر آپ ہی انقلاب کا پرچم ہاتھوں میں لے کر نکل پڑیئے''اس لڑکی نے ہاتھ نچا کر کہا۔

''انقلاب سوچ میں لانا ہوگا.......اپنی فکر میں لانا ہوگا.........نظریئے میں لانا ہوگا.........ہمیں عورتوں کا احترام کرنا سیکھنا ہوگا.........ہمیں اس کی عزت کا خیال رکھنا ہوگا.........اس کی پاکیزگی کا بھرم رکھنا ہوگا.........تب کوئی قانون بھی کارگر ہوگا۔ ہندوستان میں قانون بنتے ہیں اور توڑے بھی جاتے ہیں یا خریدے جاتے ہیں''

''آپ تقریر بہت اچھی کر لیتے ہیں لیکن جناب بس آ گئی ہے چلئے.........''

اس نے اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا، ہم دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور بس میں سوار ہو گئے۔

●●

☆..........محمد جمیل اختر

# خواب میں لکھی گئی گُمشدہ کہانی

ہاں میں کہہ رہا تھا کہ کہانی گُم ہوگئی ہے ابھی مکمل نہیں لکھی تھی لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ کہانی کا کافی حصہ میں لکھ چکا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو یاد نہیں آرہا کہ کہاں رکھ کر بھول گیا ہوں لیکن میں اگر پرسکون ہو کر کچھ دیر سوچوں تو شاید مجھے یاد آجائے کہ میں نے کہاں رکھ کر گم کردی ہے، وہ کہانی شاید کسی انقلابی نوجوان کا قصہ تھا جو بعد میں محبت میں گرفتار ہوگیا تھا، ہاں ہاں مجھے کچھ کچھ یاد آرہا ہے کچھ ایسا ہی تھا، تو کیا وہ نوجوان کامیاب ہوگیا تھا؟

معلوم نہیں، مجھے اپنے سرہانے کے نیچے دیکھنا ہوگا میں عموماً کہانیاں اپنے سرہانے کے نیچے رکھ دیتا ہوں، یہ دیکھو کچھ صفحات پڑے ہیں لیکن یہ تو کچھ مضامین ہیں جن کے عنوان کچھ یوں ہیں کہ "کیپٹلزم کی برائیاں"، "غریب مزدوروں کے حقوق"، "انقلاب" ہاں، ہاں یہ سارے مضامین اُسی نوجوان کی کہانی کے سلسلے میں لکھے اور پڑھے تھے لیکن وہ کہانی کہاں ہے؟

"صاب جی کچھ مدد کردیں، صبح سے بھوکی ہوں" ایک فقیرنی نے گلی کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی سے جھانک کر کہا۔

"معاف کرنا"

"صاب جی قسم سے بہت بھوک لگی ہے"

"معاف کرنا میں کسی الجھن کا شکار ہوں میرا کچھ سامان گم ہوگیا ہے، وہ ڈھونڈنا ہے تم پھر کسی وقت آجانا"۔

"صاب بھوک ابھی لگی ہے"

"یہ لو دس روپے اور باہر سے کھانا کھالو" میں نے کھڑکی کی سلاخوں سے دس روپے کا نوٹ اُسے تھمایا۔

نوٹ تلاش کرتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے چند کاغذ بھی میرے ہاتھ میں آگئے تھے، اوہ یہ کیا! یہ کاغذ تو اُسی کہانی ہی کا حصہ ہیں کیونکہ اِن پر بھی اُسی انقلابی نوجوان کی باتیں لکھی ہوئی تھیں، کہانی

گم ہو جائے تو اُسے جوڑنا کتنا مشکل کام ہے۔ اب یہ چند کاغذوں پر لکھے پیراگراف کو میں ایک ترتیب میں یہاں لکھ دیتا ہوں، ہوسکتا ہے کہانی کا کوئی سرا مل جائے۔۔۔

''گھپ اندھیری رات تھی، سڑک کنارے گاڑی گزر رہی تھی اور دور چار دیواری کے اندر ایک بلب جل رہا تھا۔ یہ گرمیوں کے دن تھے اور اُس صحرائی علاقے میں لوگ اُن گرم راتوں میں صحن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ سارا دن جو ریت وہ صحرا میں دیکھتے تھے یوں لگتا تھا وہ سارے ذرے رات کو آسمان پر چمکنے لگے ہیں دن میں جن ذروں پر پاؤں رکھنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ رات کو وہ آسمان پر چمک چمک کر اپنی روشنی سے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتے تھے''۔

''سڑک کنارے گاڑی گزر رہی تھی اور چار دیواری کے اندر بلب کے نیچے ایک نوجوان نے باپ کے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔''

''ابا مجھے شہر جانے دو، میں وکیل بن کر آؤں گا اور وڈیرے کے خلاف مقدمہ لڑوں گا، اُس نے ہم پر ظلم کیا ہے''۔

''ان کے خلاف کون لڑ پایا ہے میرے بچے، ہم کمزور ہیں ہم اِن کے خلاف نہیں لڑ سکتے تُو نے میٹرک کر لی ہے یہ بھی تیری ضد تھی، وڈیرے سائیں نے بہت منع کیا تھا کہ تمہیں نہ پڑھاؤں پر میں نے کہا بچہ ہے، ضد کرتا ہے اب میں تمہیں شہر کیسے بھیجوں میرے پاس کہاں سے رقم آئے گی''۔

''ابا مجھے شہر جانے دے، میں مزدوری کر لوں گا پر مجھے ایک بار شہر جانے دے''۔

پتا نہیں آگے کیا ہوتا ہے کافی پیراگراف یہاں نہیں ہیں کیونکہ اب ایک پیراگراف میں لکھا ہے کہ وہ لڑکا شہر کے کسی سرکاری کالج میں پڑھنے جاتا ہے اور کالج کی سیاسی تنظیم کا رُکن بن جاتا ہے جگہ جگہ انقلابی تقریریں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اب اِس سے آگے کیا ہوتا ہے؟

آہ! مجھ سے اُس انقلابی نوجوان کی کہانی گم ہوگئی ہے۔ افسوس اب سونا چاہیے کہ کہانی تو گم ہوگئی ہے اور مجھے نیند آرہی ہے اور میں سو گیا۔۔۔

دروازے پر بے تحاشا دستک ہوئی۔

اِس وقت بھلا کون آسکتا ہے؟

کہیں کوئی چور ڈاکو تو نہیں آگئے؟

لیکن چور ڈاکو دستک دے کر تھوڑی آتے ہیں۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں''

''کون میں''

''میں وہ نوجوان جس کی کہانی تم لکھ رہے تھے''

''کون؟ میں سمجھا نہیں''

''میں وہ انقلابی نوجوان جس کی کہانی تم سے گم ہو گئی تھی''

''تم؟''

''تم یہاں کیسے؟''

''سوال کم کرو اور دروازہ کھولو، میرے پیچھے پولیس لگی ہے''

''پولیس؟''

''پولیس کیوں؟''

''میں بتا دوں گا لیکن تم دروازہ تو کھولو''۔

''نہیں پہلے بتاؤ''۔

''وہ مجھے پکڑ لیں گے، دیکھو دروازہ کھولو''۔

''نہیں میں دروازہ نہیں کھولتا، تمہارے پاس پستول بھی ہو گی''۔

''میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں، اب کھولو''۔

''لیکن پولیس نے میرے گھر کی تلاشی لی تو میں پکڑا جاؤں گا''۔

''تم کتنا ڈرتے ہو''۔

''ہاں ڈرتا ہوں''۔

''ڈرپوک آدمی پھر انقلابی لوگوں کی کہانیاں کیوں لکھتے ہو؟ نکالو مجھے اُس کہانی سے، میں نہیں آتا تمہاری کہانی میں''۔

''وہ کہانی ویسے بھی مجھ سے گُم گئی ہے''۔

''دروازہ کھولو، وہ مجھے پکڑ لیں گے اور میں شاید پھر تمہیں کبھی نہ ملوں آج کل ہر انقلاب پسند گم ہو جاتا

ہے اُسے پہاڑوں کے پیچھے بہتے دریا میں پھینک دیا جاتا ہے وہ مجھے بھی پھینک دیں گے تم دروازہ کھولو"۔

"نہیں، نہیں میں نہیں کھول سکتا پولیس مجھے بھی پکڑ لے گی"۔

"آہ! تم کتنے ڈرپوک ہو، بہت دکھ کی بات ہے کہ یہاں زیادہ تر لوگ تمہاری طرح ڈرپوک ہیں، مجھے افسوس ہے اور وہ دیکھو پولیس اِس گلی میں پہنچ گئی ہے انسپکٹر صاحب ادھر دیکھیے میں یہاں ہوں مجھے گرفتار کرلیں"۔

"صاب جی، سنتے ہیں، دس روپے والی روٹی بارہ کی ہوگئی ہے مجھے دو روپے اور دیں"

"صاب جی؟؟؟؟"

"صاب جی آپ سو رہے ہیں؟"

"کون ہے؟ کون ہے؟" میری آنکھ کھل گئی۔

"تم کون ہو؟"

"جی میں فقیرنی، جس کو آپ نے دس روپے دیے تھے"۔

"وہ پولیس کدھر ہے؟"

"کونسی پولیس صاب"۔

"وہ جو ایک لڑکے کو پکڑ کر لے جارہی تھی؟"

"وہ تو جی پچھلی گلی میں کسی کو پکڑ کر لے جارہے تھے"۔

"روکو اُنہیں"

"صاب پیسے دے دیں روٹی لینی ہے"

"یہ لو تم دس روپے اور دفع ہو جاؤ"۔

"ٹھہرو وہ کس طرف کو جارہے تھے؟"

"وہ جی تین نمبر گلی میں تھے"۔

میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

کہانی اور کردار دونوں گُم ہوگئے تھے۔۔۔

☆☆

☆............ناصر ضمیر

# نیا آدمی

میں اب کافی تھک چکی ہوں، ہار چکی ہوں۔
ہر لمحہ پریشان اور گھبرائے ہوئے رہنا اب میرا مقدر بن چکا ہے۔
انکی حرکتیں مجھے ہر دن حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔

کثوم دیوی اپنے بھائی سے اپنے شوہر سیوک کمار کی شکایت کر رہی تھی اور اُس کی آواز رُندھی ہوئی تھی۔ سیوک کمار ہسپتال کی بیڈ پر کئی روز کے بے آرامی کے بعد نیند کا انجکشن لگوا کر سویا پڑا تھا۔ کثوم دیوی اور اُسکا بھائی سیوک کمار کے سراہنے بیٹھے تھے اور کثوم دیوی آہستہ آہستہ اپنے بھائی سے کہہ رہی تھی۔

تقدیر کے فیصلوں کے سامنے ہم سب بے بس ہے، اب دیکھو میرے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہیں ہے۔ ان کی حرکتوں سے پریشان رہتی ہوں۔ روز دفتر سے جب لوٹتے ہیں تو ان کی حالت نہایت خراب ہوتی ہے۔ کپڑے اتنے گندے اور میلے ہوتے ہے جیسے کوئلے کی کھان سے مزدوری کر کے واپس لوٹے ہوں۔ پھر بعد میں پتہ چلا کہ ہر روز بس میں اپنی سیٹ کسی بزرگ یا کسی عورت کو بیٹھنے کے لئے چھوڑتے اور خود بھیڑ میں دھکے کھاتے رہتے ہیں۔ کپڑوں کی حالت دھول دھبوں سے خراب تو ہونی ہی تھی۔ پھر میں نے بارہا پوچھا آپ اس طرح اُور لوڈ میں کیوں سفر کرتے ہیں تو میری بات کو ان سُنا کر دیتے ہیں کئی بار اپنی قسم دلوائی آئندہ ایسا نہ کریں اور

یہ مان بھی گئے لیکن اگلے روز کیا دیکھتی ہوں کہ ان کے کپڑوں کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ میں نے پوچھا تو ٹال دیا پھر بعد میں اپنی پڑوسن سے معلوم ہوا کہ وہ بازار میں کسی ٹھیلے والے کی مدد کررہے تھے اور بھرے بازار میں ٹھیلے کو دھکا دے رہے تھے۔ جب پڑوسن نے اِن سے پوچھا بھائی صاحب آپ یہ کیا کررہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔

اس بیچارے سے اس ٹھیلے کو دھکا نہیں لگ رہا تھا سوچا اس کی تھوڑی سی مدد کردوں۔

ایک دن میں نے کہا چند مزدور لے آیئے مکان کی تھوڑی سے مرمت اور صفائی وغیرہ کرنی ہے تو کہنے لگے۔

کوئی ضرورت نہیں۔

جب میں نے پوچھا وہ کیوں؟ تو جواب میں کہنے لگے۔

یہ مزدوروں کا دیش ہیں اور مزدوروں کو یہ شیوہ نہیں دیتا کہ وہ اپنا کام کرانے کے لئے مزدور رکھیں۔ میں بالکل نہیں سمجھی اسی لئے میں نے کہا۔

آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی۔

''دیکھو کثوم جب تم یہ باتیں نہیں سمجھتی تو پھر بھلا بحث کرنے سے کیا فائدہ''۔ ان کا جواب سُن کر میں چِڑ گئی۔ کیوں؟ کیوں نہیں سمجھوں گی کیا پڑھے لکھے صرف آپ ہی ہیں ہاں ہاں میں تو جاہل ہوں، گنوار ہوں، وہ بات نہیں ہے دیکھو سمجھنے کی کوشش کرو ہمارے دیش میں منتری سے لیکر چھوٹے کرمچاری تک سب ہی مزدور ہیں۔ کسی کو کسی سے کوئی سبقت نہیں۔ اصل میں ہم سب برابر ہیں۔ اسی لئے مکان کی مرمت کرانے کے لئے مزدور لانے کی بالکل ضرورت نہیں، میں اور تم یہ ضروری مرمت اور صفائی کا کام کرلیں گے۔

ان کی حرکتیں، باتیں اور اصول بچوں کے لئے بھی پریشانی کا سبب بننے لگے ہیں۔ انہوں نے اب بچوں کو ٹیلی ویژن دیکھنے پر پابندی لگادی ہے۔ خاص کر فلم اور فلمی گانے دیکھنے پر، جب میں نے پوچھا تو کہنے لگے۔

''ہر فلم یا ہر فلمی گیت یا نغمہ ہمیں Morally گائڈ کرتا ہے۔ ان چیزوں کا اثر ہم اور ہمارا دماغ بلواسطہ یا بلا واسطہ لے لیتا ہے۔ بہت احتمال ہے کہ بچے بگڑ جائیں گے کیونکہ اب زیادہ

تر فلموں میں گنڈہ گردی، بھائی گری، مار دھاڑ اور فحاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اکثر نغموں اور گیتوں کی حالت اس سے بھی بُری ہے گیت نہ ہوئے گالی گلوچ ہوا۔ کیا بچے یہ سب سیکھیں گے۔

میں نے تیش میں آکر کہا اس میں فلم والوں کا کیا قصور۔ یہ تو وہی سب کچھ دکھا رہے ہیں جو ہمارے آس پاس ہو رہا ہے۔ یہ بھی کہاں ماننے والے تھے اُٹھے اور اعلان کرتے ہوئے کہا۔

آج سے کوئی ٹیلی ویژن نہیں دیکھے گا مجھے اور بحث نہیں کرنی۔

گڈی کا ایڈمیشن ایک نئے بڑے اسکول میں کرانا تھا۔ پُرانا اسکول بھی ٹھیک تھا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ ایک بڑے شاندار اسکول میں پڑھے، میں ایڈمیشن فارم لے آئی اور ان سے دفتر میں چھٹی رکھنے کو کہا تاکہ یہ فارم جمع کرانے جائیں۔ تین دن تک لگاتار آفس میں چھٹی رکھی، روز اسکول جاتے لیکن شام کو فارم جمع کئے بغیر واپس لوٹ آتے۔ میں نے پوچھا آخر وجہ کیا ہے۔ تو کہنے لگے۔

"وہاں لمبی لمبی قطاریں ہوتیں ہیں میری بھاری آنے سے پہلے ہی کونٹر بند ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا جب اوروں کے فارم جمع ہوتے ہیں تو ہمارا کیوں نہیں تو انہوں نے پھر بات کو ان سُنا کر دیا آخر کار گڈی کا ایڈمیشن فارم جمع نہ کر پائے۔ پتہ لگانے پر معلوم ہوا اصل وجہ یہ تھی کہ یہ قطار میں ہر نئے جڑنے والے شخص کو آگے کھڑا کر دیتے اور خود اُن کے پیچھے کھڑا رہتے اور سہ پہر ہونے تک جب آخر کار یہ کاونٹر کے نزدیک پہنچ جاتے تو کونٹر بند ہو جاتا۔ پھر میں نے بڑی مشکل سے اپنی سہیلی کی مدد لیکر سفارش کرا کے فارم جمع کرایا اور یوں گڈی کا ایڈمیشن کرا لیا۔

تقریباً دو تین مہینے پہلے اپنے معدے کے درد کی کافی شکایت رہی۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے کہا مگر ٹالتے رہے۔ پھر جب تکلیف بڑھتی گئی تو میں ضد کر کے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا یہ سب تکلیف کھانا نہ کھانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے ان کا کام دھندا پوچھا اور پھر کہا شاید انہوں نے کافی عرصے سے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہے۔

میں نے حیرت کا اظہار کیا اور اپنی صفائی میں ڈاکٹر سے کہا میں تو روز انہیں کھانے کا ٹیفن ساتھ دیتی ہوں۔ پھر کیسے ---------

پھر میں نے اِن کے آفس کے ساتھی شرما جی سے دریافت کرایا تو انہوں نے کہا سیوک

کمار جی روز اپنا خالی ٹیفن آفس لاتے ہیں وہ تو روز راستے میں ہی کسی بھوکے، ننگے بچے کو اپنے ٹیفن کا کھانا کھلا دیتے ہیں۔

ایک مہینہ ہمیں بہت ہی مشکلات میں گزارنا پڑا۔ پہلی تاریخ کو جب یہ اپنی تنخواہ لیکر گھر لوٹ رہے تھے تو راستے میں انہیں ایک بوڑھا بھکاری ملا۔ اُس نے اپنے غموں کی داستان سُنا دی۔ پھر کیا تھا۔ انہوں نے بھی اپنی تنخواہ ساری کی ساری اُسکی ہتھیلی پر رکھ دی یہ بھی نہیں سوچا کہ پورا مہینہ ہم کیسے گزاریں گے۔ بچوں کے اسکول کی فیس اور دیگر ضروریات کہاں سے پوری ہونگی۔ اِن کی اس حرکت پر میں نے اِن کے روبرو کھڑی ہوئی اور تنگ آکر آخر پوچھا۔

آخر آپ وہی کرتے ہیں جو آپکا جی چاہتا ہے۔ تھوڑے سے پیسے بچا کے رکھے ہوتے تو میں اُس سے زہر خرید لیتی خود کھاتی اور بچوں کو بھی کھلا دیتی۔ کیوں؟ آخر کیوں کرتے ہیں آپ ایسا جس سے ہماری تکلیفیں اور مشکلات کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہیں۔ تب انہوں نے بہت زیادہ سنجیدہ ہو کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کثوم یہ دنیا اب رہنے کے لائق نہیں رہی ہے۔ اب کوئی اوتار اس دنیا کو سدھارنے کے لئے نہیں آئے گا۔ ہمیں ہی اِس کو رہنے کے لائق بنانا پڑے گا۔ اپنے لئے، اپنوں کے لئے، آنے والی نسلوں کے لئے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں تیر رہے تھے۔

پھر چند روز قبل انہوں نے آفس کے ایک ساتھی کا کام اُس کے بدلے خود کرنے کا ذمہ لیا۔ کام نپٹانے میں کافی دیر ہوئی اور دیر رات گئے جب یہ آفس سے واپس لوٹ رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ نکڑ پر چند بدمعاش ایک لڑکی کے ساتھ زبردستی کر رہے تھے یہ اوروں کی طرح نظریں جھکا کر گزرنے والے کہاں تھے۔ یہ اُن بدمعاشوں کے ساتھ بھڑ گئے۔ یہ اُس لڑکی کو بدمعاشوں کے چنگل سے بچانے میں کامیاب تو ہوئے لیکن اُن ظالموں نے اُنہیں کافی مارا پیٹا اور اِن پر چھری چاقو سے بھی وار کیا۔ نتیجہ یہ کافی زخمی ہوئے اور لہولہان ہو کر سڑک پر پڑے رہے۔ پھر پتہ نہیں کن لوگوں نے اِنہیں ہسپتال پہنچایا اور مجھے خبر کردی۔ کثوم دیوی رونے لگی اور اُس کا بھائی خاموشی سے یہ باتیں سُن رہا تھا۔ کثوم دیوی نے کہا کچھ ہی لوگ ہیں جو اِنہیں قریب سے جانتے ہیں اِنہیں اچھا سمجھتے ہے ورنہ زیادہ تر لوگ اِنہیں بیوقوف سمجھتے ہیں۔ تبھی سیوک کمار نیند سے جاگا اور

کثوم دیوی نے اپنے آنسوؤں پونچھے۔ کثوم دیوی کے بھائی نے سیوک کمار کی اور مسکرا کر دیکھا اور اُن کی خیریت پوچھی تو سیوک کمار نے کہا ٹھیک ہی ہوں بس تھوڑی سی کمزوری ابھی بھی محسوس ہو رہی ہے۔

آپ آرام کیجئے میں اور کثوم آپکے لئے لنچ لے آتے ہیں۔

جب کثوم اور اُسکا بھائی تھوڑی دیر بعد لنچ لے کر واپس لوٹے تو دیکھا سیوک کمار اپنے بیڈ پر موجود نہ تھا۔ بلکہ وہاں اُسکے بیڈ پر ایک بیمار بڑھیا سو رہی تھی۔ دونوں نے ڈھونڈا تو دیکھا سیوک کمار وارڈ کے باہر Corridore میں دور ایک جگہ اور مریضوں کے ساتھ پڑا تھا دونوں اُس کی طرف لپکے اور اُس سے پوچھا۔

وہ.......... بڑھیا آپکے بیڈ پر کیسے سوئی ہے اور آپ یہاں کیسے۔ تو سیوک کمار نے کہا۔

مجھے پتہ ہے وہ بیڈ کیسے حاصل کیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کثوم نے Ward Boy کو پیسے دے کر اُس بیڈ کا انتظام کیا تھا۔ ورنہ اس ہسپتال میں مریض کو ایڈمٹ کرانے میں کتنی دشواریاں ہوتی ہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ شاید وہ بیڈ میرے لئے ٹھیک نہیں تھا۔ میں وہ کانٹوں کا بستر چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اس فرش پر یہاں قدرے سکون ہے، آرام ہے۔

کثوم دیوی نے لنچ کا ٹیفن اور بریڈ سیوک کمار کے سامنے رکھ دی۔ کثوم اور اُس کا بھائی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کثوم دیوی کے بھائی نے اپنی بہن کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

سیوک کمار ہم میں سے تو ہے لیکن ہم جیسا نہیں یہ تو بالکل نیا آدمی ہے۔ ایک الگ ماٹی سے بنا نیا آدمی۔ تم اس آدمی کو اپنے آکار میں ڈھالنے کی غلطی بھی نہیں کرنا ورنہ یہ ٹوٹ جائے گا، بکھر جائے گا۔ سیوک کمار کا زندگی گذارنے کا یہ اپنا طریقہ، ایک الگ فارمولا ہے۔ یہ طریقہ، یہ فارمولا ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

دونوں بھائی بہن سیوک کمار کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

کیونکہ سیوک کمار بریڈ کے ٹکڑے سوپ میں ڈبا ڈبا کر ساتھ ہی پڑے ایک بزرگ مریض کو اپنے ہاتھوں سے کھلا رہا تھا۔

☆☆

ڈرامہ

☆.........انگریزی:- ہرولڈ برگوس

☆.........ترجمہ:- شوکت شہری

# شہزادہ

(ہرولڈ برگوسؔ کے انگریزی ڈرامہ 'دَ پرنس ہو واز اَ پاپئر' کا اردو ترجمہ۔ یہ ڈراما سکول کے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے۔اس لئے بچوں کی عمر مدِنظر رکھتے ہوئے کچھ مکالمے حذف کیے گئے ہیں)

## کردار

۱:۔بادشاہ ............... بے وقوف بادشاہ

۲:۔وزیر ............... چاپلوس وزیر

۳:۔شہزادہ دانش ............... خوبرو شہزادہ گڈریئے کے لباس میں

۴:۔برہان ............... دانش کا شاہی خدمتگار۔

۵:۔محافظ ............... ایک تندرست سپاہی

۶:۔ماہین ............... ایک خوبصورت شہزادی

۷:۔حلیمہ ............... ایک غریب جوان لڑکی

۸:۔مریم ............... ایک متوسط گھرانے کی جوان لڑکی

۹:۔رقیہ بیگم ............... ماہین کی آیا

(پردہ اُٹھتا ہے اور سٹیج ایک شاہی باغیچے کی صورت میں نظر آتا ہے جو شہزادی کی شادی کے لیے سجایا گیا ہے۔سٹیج کے بیچ کے حصے میں دائیں جانب کسی مورتی کا تختہ نصب ہے لیکن مورتی

غائب ہے اور سامنے بائیں جانب شاہی طرز کا گارڈن بینچ ہے۔ بادشاہ اپنے روایتی لباس میں ننگے سر باغیچے میں داخل ہوتا ہے۔ وزیر اس کے ساتھ ہے۔ دونوں سجاوٹ کا معائنہ کرتے ہیں۔)

**بادشاہ:**۔ وزیرِ بے قلمدان۔

**وزیر:**۔ حکم عالیجاہ۔

**بادشاہ:**۔ ہم تمہیں قلمدان عطا کر دینا چاہتے ہیں۔

**وزیر:**۔ ذرہ نوازی ہے حضور

**بادشاہ:**۔ لیکن اُس کے لیے تمہیں ہماری اکلوتی شہزادی ماہین کی شادی کا یہ حسین منظر اس طرح تاریخ میں درج کرنا ہوگا۔ جس طرح قدیم زمانے سے شاہی تاریخ دان اپنے احمق شہنشاہوں کی خوشامد میں قصیدے لکھتے آئے ہیں۔

**وزیر:**۔ بالکل ایسا ہی ہوگا عالیجاہ۔

**بادشاہ:**۔ لیکن کیا تم اپنے شہنشاہ کی خوشامد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ ہماری ضدی شہزادی ہمارے من پسند شہزادے کے ساتھ شادی کرنے کے لیے راضی ہو جایے گی؟

**وزیر:**۔ عالیجاہ۔ شاہی خاندانوں کی تاریخ تو شہزادیوں کی فرمانبرداری کے بے شمار قصوں سے بھری ہوئی ہے۔

**بادشاہ:**۔ باغی شہزادیوں کے قصے بھی کم نہیں ہیں۔

**وزیر:**۔ وہ۔۔۔ وہ تو شاہی خون میں بیرونی آلودگی کا نتیجہ ہے حضور۔

**بادشاہ:**۔ مطلب ؟

**وزیر:**۔ وہ کہ..... جنگجو شہنشاہ میدانِ کارزار میں مصروف رہے اور ملکاؤں سے لغزشیں سرزد ہوتی رہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے حضور۔ ہمارے باغیرت شہنشاہ کی نظر چاروں پہر اپنی ملکاؤں پر ہی لگی رہتی ہے۔ ایسے میں تو خون کی آلودگی ممکن ہی نہیں۔

**بادشاہ:**۔ تمہاری یہ باتیں تو سننے میں بہت اچھی لگتی ہیں۔ لیکن ساتھ میں خیال آتا ہے کہ اگر ہماری شہزادی نے نافرمانی کی، تو ہماری ملکاؤں کے ساتھ تمہیں بھی زندہ دیوار میں چنوا دینا لازمی ہو گیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے وزیرِ بے قلمدان ؟

**وزیر**:۔ حضور۔ اس کے لیے تو رقیہ بیگم کو ذمہ دار ٹھہرانا چاہیے۔ شہزادی تو اُسی کی سرپرستی میں پل کر جوان ہوگئی ہے۔

**بادشاہ**:۔ اُسے ہمارے روبرو پیش کیا جائے۔

**وزیر**:۔ ایک دم حضور۔

(وزیر مُڑ کر نکل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بادشاہ ٹہلتا رہتا ہے۔ اتنے میں وزیر رقیہ بیگم کے ساتھ لوٹ آتا ہے۔)

**رقیہ بیگم**:۔ بندی حاضر ہے بندہ پرور۔

**بادشاہ**:۔ رقیہ بیگم۔ شہزادہ دانش ہمارے محل کی طرف روانہ ہوگیا ہے اور ہمیں اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اب وہ صرف دس میل کی دوری پر ہے۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے اور اُس وقت اگر شہزادی شادی کا جوڑا پہن کر خوشی خوشی شہزادے کے استقبال میں نہیں آئیں گی تو تم جانتی ہو تمہارا انجام کیا ہوگا؟

**رقیہ بیگم**:۔ یہ تو حضور ہی جانتے ہوں گے۔

**بادشاہ**:۔ تمہیں تاریک تہہ خانے میں بھوکے چوہوں کی خوراک بنا دیا جائے گا۔

**رقیہ بیگم**:۔ بندی پر رحم فرمائے حضور۔ شہزادی کا فیصلہ اٹل ہے۔

**بادشاہ**:۔ معاملہ اب تمہارے ہاتھ میں ہے رقیہ بیگم۔ اب تم خود فیصلہ کرو۔ بھوکے چوہوں کی خوراک بنوگی یا ہماری شہزادی کو شادی کے لیے تیار کروگی۔ جاؤ۔ سوچنے کے لیے ابھی کچھ وقت ہے تمہارے پاس۔

(رقیہ بیگم اداس ہو کر چلی جاتی ہے)

**وزیر**:۔ حضور کی عقلمندی کا جواب نہیں۔ رقیہ بیگم کے لیے بالکل مناسب سزا مقرر فرمائی ہے۔

**بادشاہ**:۔ ہمارے دل کا بوجھ کچھ کم ہوگیا ہے۔ اب ہمارے سر پر تاج کچھ سیدھا لگ رہا ہے۔

**وزیر**:۔ آپ کا تاج حضور؟

**بادشاہ**:۔ کیوں سیدھا نہیں ہے؟۔ (سر پر ہاتھ لے جا کر خود کو بے تاج پا کر) یہ دیکھو

کتنے پریشان ہیں ہم۔ریاست کے اس عظیم الشان موقعے پر بے تاج گھوم رہے ہیں۔ہمیں تاج پہن لینا چاہیے۔

(جانے کے لیے مُڑتا ہے تو شہزادی ماہین رقیہ بیگم کے ساتھ آجاتی ہے)

**بادشاہ:**۔ابھی تک شادی کا جوڑا نہیں پہنا ہے تم نے؟

**ماہین:**۔شادی کا جوڑا تو شادی کے لیے پہنا جاتا ہے ابا حضور۔لیکن میں نے تو ابھی اُسے دیکھا بھی نہیں ہے جس کے ساتھ میری شادی طے ہوگئی ہے۔

**بادشاہ:**۔رقیہ بیگم۔کیا اسے یہی آداب سکھایے ہیں تم نے ؟

**ماہین:**۔ابا حضور۔یہی تو آداب ہیں جو اس نے مجھے سکھائے ہیں اور اسی نے مجھے اپنا بھلا بُرا سوچنے کا حوصلہ دیا ہے۔شادی سے پہلے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھنا کوئی گُناہ تو نہیں ہے۔

**بادشاہ:**۔اُس کی تصویر تو دیکھ چکی ہو تم۔اُس نے وہ تصویر خاص طور سے تمہارے لیے بنوائی ہے۔

**ماہین:**۔تب ہی تو مجھے اُس تصویر پر شک ہے۔کوئی بھی مصور اپنے آقا کی ہو بہو تصویر بنانے کی جرت نہیں کرسکتا۔

**بادشاہ:**۔کیا میری تصویریں مصوروں نے نہیں بنائی ہیں؟۔

**وزیر:**۔بالکل بنائی ہیں۔ایک سے بڑکر ایک خوبصورت تصویر بنائی ہے۔

**بادشاہ:**۔میں اُس مصور کا سر قلم کروں گا جو میری ہو بہو تصویر نہیں بنائے گا۔

**وزیر:**۔مطلب خوبصورت تصویر، جیسا کہ ہمارے شہنشاہ ہیں۔

**بادشاہ:**۔اور سب جانتے ہیں کہ میں نے آج تک کسی مصور کا سر قلم نہیں کیا ہے۔کیا یہ ثبوت نہیں ہے کہ ہمارے مصوروں نے ہماری ہو بہو تصویریں بنائیں ہیں۔؟

**ماہین:**۔پھر بھی میں شہزادے کو دیکھنا چاہوں گی۔

**بادشاہ:**۔یہ دورِ جدید کے آداب مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔تمہیں شہزادہ قبول کرنا ہوگا کیوں کہ ہم اُسے پسند کر چکے ہیں۔ورنہ تمہاری یہ آیا بھوکے چوہوں کا خوراک بن جائے گی۔تم فیصلہ کرو۔ہم چلتے ہیں۔

(بادشاہ پیچھے کی جانب سے نکلنے لگتا ہے کہ اچانک بنا مورتی کے تختے پر نظر پڑتی ہے)

**بادشاہ:**۔ یہ تختہ خالی کیوں ہے؟۔ کیا اس پر مورتی نہیں تھی؟

**وزیر:**۔ میں باغبان کو کہہ کر مورتی لگوا دوں گا حضور

**بادشاہ:**۔ بنا مورتی کا تختہ بالکل بنا تاج کے۔

(سر کی جانب ہاتھ لے جا کر بات کاٹ دیتا ہے)

میرے لوٹنے تک مورتی نصب ہونی چاہیے۔

(بادشاہ کے ساتھ وزیر بھی نکل جاتا ہے)

☆

(رقیہ بیگم چوہوں کے ڈر سے ادھ مری ہو کر گارڈن بینچ پر بیٹھ جاتی ہے اور شہزادی حالات پر غور کرنے لگتی ہے۔)

**رقیہ:**۔ کتنی ذلت کی بات ہے۔ اب اس عمر میں مجھے بھوکے چوہوں کی خوراک بننا ہوگا۔ یہ سوچ کر تو میں ابھی سے اپنے جسم پر نوکیلے دانت محسوس کرنے لگی ہوں۔

**ماہین:**۔ گھبراؤ نہیں۔ میرے بابا ہمیشہ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرتے ہیں۔

**رقیہ:**۔ ہاں۔ پہلے بھی تو کیا جب ایک کنیز نے غلطی سے شہنشاہ کی طرف اپنی پیٹھ کر لی۔ شہنشاہ نے اُس کنیز کے بال کٹوانے کا حکم دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد ترس کھا کر کنیز کو معاف کر دیا۔ لیکن نائی اپنا کام کر چکا تھا۔

**ماہین:**۔ بعد میں اُس کنیز کو وگ پہننے کی اجازت بھی تو دیدی۔

**رقیہ:**۔ لیکن وہ اجازت تو اگلے ہی دن شہنشاہ کے عدل کی مثال بنا کر شاہی رسالے میں شایع کر دی گئی تھی۔ پھر کنیز بے چاری کو وگ پہننے کا کیا فایدہ ہوا۔ سب ہی تو جان گئے تھے کہ اُس کے سر پر بال نہیں ہیں۔

**ماہین:**۔ اب تم زیادہ پریشان مت ہو جاؤ۔ تمہارے بچاؤ کی کوئی نہ کوئی تدبیر نکل آئے گی۔

**رقیہ:**۔ تو کیا تم اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرو گی۔؟

**ماہین:**۔ بالکل نہیں۔ شہزادے کو دیکھے بنا میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔

**رقیہ**:۔ دیکھو۔ جب سے تم اتنی سی تھی۔ تب سے پالا ہے میں نے تمہیں۔ کم سے کم اُس کا تو کچھ لحاظ کرو شہزادی۔

**ماہین**:۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟۔ میں اُس آدمی کے ساتھ شادی کروں جسے پیار کرنا تو دور، میں نے دیکھا بھی نہیں ہے۔

**رقیہ**:۔ تمہارے باپ نے فیصلہ کرلیا ہے۔ تمہیں قبول کرنا پڑے گا شہزادی۔

**ماہین**:۔ باپ ایسے کٹھور فیصلے نہیں کرتے۔ اس طرح کے فیصلے صرف شہنشاہوں کے ہوتے ہیں۔

**رقیہ**:۔ ایک بڑھیا کو بھوکے چوہوں کی خوراک بنانا بھی تو شہنشاہ کا ہی فیصلہ ہے اور شہنشاہوں کے فیصلے حکم ہوتے ہیں شہزادی۔ جن کی بہر صورت تعمیل ہوتی ہے۔

**ماہین**:۔ لیکن شہنشاہ نے ابھی اس خالی تختے پر مورتی رکھوانے کا حکم دے دیا۔ اُس کی تعمیل تو نہیں ہوئی۔

**رقیہ**:۔ وزیر بھُلکڑ ہے شہزادی۔ شاید پھر سے بھول گیا ہوگا۔

**ماہین**:۔ اچھا ہے کہ وہ بھُلکڑ ہی رہے۔

**رقیہ**:۔ اگر شہزادہ دانش کے آنے کے بعد شہنشاہ کو اس خالی تختے پر نظر پڑے گی تو سمجھو وزیر کی نوکری گئی۔

**ماہین**:۔ یہ تختہ خالی نہیں رہے گا آیا۔ اس پر مورتی تم رکھو گی۔

**رقیہ**:۔ میں؟۔ میں مورتی کہاں سے لاؤں گی؟۔

**ماہین**:۔ مورتی تمہارے سامنے ہے۔

**رقیہ**:۔ کہاں؟

**ماہین**:۔ میری طرف دیکھو طوفانی آیا۔ میں ہوں وہ مورتی۔ جسے تم اس خالی تختے پر رکھو گی تاکہ جب یہ باغیچہ عام لوگوں کے لیے کھول دیا جائے گا اور لوگ میری شادی میں شمولیت کرنے کے لیے جوق در جوق آئیں گے۔ میں یہاں مورتی بن کر کھڑی رہوں گی اور شہزادہ دانش کو دیکھ لوں گی۔

رقیہ:۔ تمہیں کسی نے پہچان لیا تو غضب ہو جائے گا۔

**ماہین:**۔ تم مجھے ایسا لباس پہنا دو جس میں مجھے کوئی پہچان نہ سکے۔ کم سے کم اتنا تو کرسکتی ہو تم؟

رقیہ:۔ لیکن تم بنا حرکت کئے پتھر بن کر کب تک رہو گی؟

**ماہین:**۔ تم اُس کی فکر مت کرو۔ شاہی محلوں میں شہزادیاں پتھر ہی بنی رہتی ہیں۔

رقیہ:۔ مجھے ڈر لگتا ہے شہزادی۔

**ماہین:**۔ بھوکے چوہوں سے بچنا ہے تو مجھے جلدی سے تیار کردو...... چلو۔

(دونوں سٹیج سے باہر چلی جاتی ہیں۔)

☆

(تھوڑی دیر بعد بادشاہ سامنے کی ونگ سے داخل ہو کر گارڈن بینچ پر بیٹھ جاتا ہے اور کسی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ اسکے بعد ہی وزیر چلا آتا ہے۔)

**وزیر:**۔ جہاں پناہ۔ حضورِ انور۔ بندہ پرور۔ بادشاہِ پُر وقار۔ سالارِ شاندار............

**بادشاہ:**۔ ارے بس بھی کرو۔ کچھ القاب اپنے لیے بھی بچا کر رکھو۔

**وزیر:**۔ حضور کے سامنے ہماری اوقات ہی کیا ہے۔

**بادشاہ:**۔ ٹھیک ہے۔ اب کام کی بات کرو۔

**وزیر:**۔ کام کی بات یہ ہے حضور کہ شہزادہ دانش ابھی آئے نہیں ہیں۔ شہزادی ماہین کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

بادشاہ:۔ نامعقول۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟

**وزیر:**۔ عالیجاہ۔ ہم نے محل کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن شہزادی ماہین کو کہیں نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ خدانخواستہ محل سے نو دو گیارہ ہو گئی ہوگی۔ بلکہ رقیہ بیگم اُسے کسی پوشیدہ جگہ پر لیکر شادی کے لیے منا رہی ہوگی۔

**بادشاہ:**۔ اس طرح کہا کرو۔ اس طرح کی باتوں سے دل کو تسلی ہوتی ہے۔

**وزیر:**۔ ہم ایسا ہی کہنے والے تھے حضور۔

(سٹیج کے پچھواڑے سے محافظ آجاتا ہے)

**محافظ :**۔عالیجاہ۔شاہی باغیچے کے باہر لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی ہے اور لوگ باغیچے میں داخل ہونے کے لیے بہت اصرار کر رہے ہیں۔اگر بادشاہ سلامت اجازت دیں گے تو باغیچے کا دروازہ کھول دیا جائے گا۔

**وزیر:**۔ہاں۔باغیچے کا دروازہ کھولنے کا وقت آ گیا ہے۔

**بادشاہ:**۔نہیں۔ابھی نہیں۔پہلے شہزادہ دانش کو آنے دو۔

**وزیر:**۔عالیجاہ۔شہزادے نے اپنے وقتِ آمد کی رسمی طور کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔لہٰذا رسمی طور ہم پر انتظار کرنے کی پابندی بھی نہیں ہے اور شاید وہ غیر رسمی طور آ بھی گئے ہوں۔یا بس آنے والے ہوں۔لیکن ایسے حالات میں لوگوں کو زیادہ دیر تک انتظار کروانا ٹھیک نہیں رہے گا جہاں پناہ۔

**بادشاہ:**۔کیوں ؟

**وزیر:**۔کیوں کہ لوگ اگر بدظن ہو کر چلے گئے تو شادی کی رسم پر عظیم الشان شہنشاہ کو خود ہی تالیاں بجانی پڑیں گی۔جو میں نہیں سمجھتا رسمِ شاہی کے عین مطابق ہوگا۔

**بادشاہ:**۔کیا شہزادی شادی کے لیے تیار ہوگئ ہے؟

**وزیر:**۔رقیہ بیگم نے بھوکے چوہوں کے ڈر سے شہزادی کو تیار کر لیا ہوگا جہاں پناہ۔آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

**بادشاہ:**۔ایسا ہے تو باغیچے کا دروازہ کھول دو۔

**وزیر:**۔ محافظ۔تم جاؤ اور باغیچے کا دروازہ کھول دو۔

**محافظ :**۔بہتر جناب۔

**وزیر:**۔لیکن سنو۔خیال رکھنا کہ باغیچے کے اس حصے میں زیادہ لوگ نہ آئیں۔کم سے کم بادشاہ سلامت کا دیدارِ خاص کے لیے محفوظ رہنا چاہیے۔

**محافظ :**۔بہتر جناب۔

(محافظ واپس سٹیج کے پچھواڑے سے نکل جاتا ہے۔)

**بادشاہ:**۔وزیرِ بے قلمدان۔

**وزیر:**۔حکم عالیجاہ۔

**بادشاہ:۔** تمہیں کیا لگتا ہے۔ ہماری اکلوتی شہزادی ہمارا فیصلہ قبول کریگی ؟

**وزیر:۔** سر آنکھوں پر حضور۔

**بادشاہ:۔** یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو ؟

**وزیر:۔** عالیجاہ۔ شاہی خاندانوں میں یہی دستور رہا ہے اور شاہی قلمدانوں سے تحریر ہوئی تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔

**بادشاہ:۔** پھر ہم اس قدر بے چین کیوں ہیں ؟

**وزیر:۔** ایک باپ کی حیثیت سے حضور کا بے چین ہونا لازمی ہے۔ لیکن ایک شہنشاہ کی حیثیت سے حضور کا بے چین ہونا شایانِ شان نہیں ہے۔ شاہی دستور کے مطابق حضور کو بشاش رہنا ہوگا............ ( بیک گراونڈ میں لوگوں کو اُچھلتے کودتے باغیچے میں داخل ہوتے ) اور حضور اب تو لوگ بھی باغیچے میں داخل ہوگئے ہیں۔

**بادشاہ:۔** اس لیے ہم محل میں تشریف لے جائیں گے۔

(بادشاہ چلا جاتا ہے اور وزیر اس کے پیچھے پیچھے نکل جاتا ہے۔)

☆

(تھوڑی دیر بعد شہزادہ دانش ایک گڈریئے کے لباس میں ٹہلتا ہوا پیچھے کی جانب سے آجاتا ہے۔ اس کے پاؤں میں شاہی طرز کے چمکیلے جوتے ہیں اور ہاتھ میں بڑا سا فلیؤٹ ہے۔ اس کا اسسٹنٹ، برہان اس کے ساتھ ہے۔)

**دانش:۔** برہان۔

**برہان:۔** حکم شہزادے

**دانش:۔** یہاں تو شادی کی بڑی زبردست تیاری لگتی ہے۔

**برہان:۔** بالکل حضور

**دانش:۔** دیکھو۔ تم یہ حضور شہزادے کی رٹ بند کرو۔ یہاں میں شہزادہ بن کر نہیں آیا ہوں۔ بلکہ اس مرلی سے موسیقی کا جادو جگانے کے لیے ایک خانہ بدوش گڈریا بن کر آیا ہوں۔

**برہان:۔** جی بالکل

**دانش** :۔تم میرے ایک اچھے دوست ہو۔تم نے محل کے دوسرے ملازموں کی طرح میرے فن کی جھوٹی تعریف تو نہیں کی۔پھر بھی تم سے پوچھتا ہوں۔کیا سچ میں میری موسیقی مردہ چیزوں میں جان ڈال سکتی ہے؟

**برہان** :۔شہزادہ دانش۔معافی چاہتا ہوں۔ابھی اس ضمن میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔کیوں کہ میرے دماغ میں اس وقت دوسرے قسم کی تشویش ہے۔تھوڑی بہت گھبراہٹ بھی ہے۔

**دانش** :۔کیوں؟

**بریز** :۔شہزادی ماہین کو چُپکے سے دیکھنے کا آپ کا یہ منصوبہ ہمیں اس بھرے ہجوم میں شرمندہ بھی کرسکتا ہے اور یہ جو آپ کرر ہے ہیں، ہمارے شہنشاہ کو ہرگز پسند نہیں ہوگا اور یہ شاہی دستور بھی نہیں ہے۔

**دانش** :۔تو شاہی دستور کیا ہے؟۔دو انجانے لوگوں کو اچانک ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر کے ان کی شادی کا اعلان کرنا اور انہیں ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لیے مجبور کرنا۔یہ شاہی دستور ہے ؟۔

**برہان** :۔ابھی تک تو یہی دستور ہے۔

**دانش** :۔میں یہ دستور نہیں مانتا۔اور ایک بات کان کھول کر سنو۔میں یہاں بہروپی بن کر صرف شہزادی کو دیکھنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔بلکہ میں خود عام لوگوں میں گھُل مل کر اپنی موسیقی کا صحیح امتحان لینا چاہتا ہوں۔محل میں جھوٹی خوشامد سُن سُن کر میرے کان پک گئے ہیں۔

**برہان** :۔پھر بھی مجھے پوری اُمید ہے کہ آپ بہر صورت شاہی اخلاق کے دائیرے میں رہیں گے۔

**دانش** :۔(قہقہہ) ارے بے وقوف۔میں تو اس وقت ایک خانہ بدوش موسیقار ہوں۔خانہ بدوشوں پر اخلاق کی پابندی نہیں ہوتی۔میں آج ان تمام بندشوں سے آزاد ہوں۔

**برہان** :۔یہ ایک وقتی بہروپ ہے۔حقیقت میں آپ شہزادے ہیں۔آپ شاہی خاندان میں پلے ہیں۔آپ کو شاہی طرزِ زندگی میں ہی رہنا ہوگا۔

**دانش** :۔میرا شاہی محل میں پیدا ہونا ایک حادثہ ہے میرے دوست۔مقدر کا کھیل ہے۔

لیکن اصل میں ، میں ایک فنکار ہوں ۔ اور یہ موسیقی کا فن میں نے شاہی دربار میں نہیں سیکھا ہے۔ یہ تو خداداد ہے میرے یار۔ مجھے یہ خداداد فن خدا کے اِن بندوں کے ساتھ بانٹ لینے دو۔

**برہان** :۔ لیکن آپ یہاں اپنے لیے شریکِ حیات چُننے اور اس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے آئے ہیں۔

**دانش** :۔ اگر یہ سب مجھے شاہی حکم نامے کی تعمیل میں کرنا ہے۔ پیار کی تلاش میں نہیں۔ تو میں شہزادے کی حیثیت سے ابھی مستعفی ہو کر ایک آزاد فنکار بن کر رہنا پسند کروں گا اور محبت کرنے کی پوری آزادی چاہوں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟

**برہان** :۔ اعتراض تو نہیں ہے۔ لیکن آپ کی دیکھ ریکھ کی ساری ذمہ داری مجھ پر سونپی گئی ہے۔ آپ کی یہ بغاوت میری موت کا باعث بن سکتی ہے۔

**دانش** :۔ اس سے پہلے کہ ہماری بغاوت کا الزام تمہارے سر لگے اور ہماری محبت کے لیے تمہارا سر قلم کیا جائے ، ہم تمہیں اپنی ملازمت سے برطرف کرتے ہیں۔ تم جا سکتے ہو۔

**برہان** :۔ ہمیں اس جدائی کا دُکھ رہیگا۔

**دانش** :۔ ہمیں کوئی دُکھ نہیں۔ کیوں کہ ہم پہلے بھی تمہیں اپنا دوست مانتے تھے۔ آیندہ بھی دوست ہی مانیں گے۔

**برہان** :۔ تھینک یو پرنس دانش۔ اپنا خیال رکھنا۔

(برہان دانش کے ساتھ ہاتھ ملا کر نکل جاتا ہے۔)

☆

(دانش گارڈن بینچ پر بیٹھ کر مرلی بجانے لگتا ہے۔ مرلی کی دُھن سن کر دو لڑکیاں دوڑتی کھنچتی چلی آتی ہیں اور دانش کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ دانش بجانا بند کرتا ہے)

**دانش** :۔ تم میری دُھن سن کر آ گئی؟

**مریم** :۔ ہاں۔ اچھی مرلی بجاتے ہو۔

**حلیمہ** :۔ اور بجاؤ۔ ہم تمہاری دُھن پر ناچیں گی۔

**مریم** :۔ ہاں۔ ہاں۔ بجاؤ؟

(دانش مرلی بجاتا ہے اور دونوں لڑکیاں ناچنے لگتی ہیں۔ اس دوران رقیہ بیگم بھی ظاہر ہو جاتی ہے اور ونگ کے اندر کی طرف نہ آنے کا اشارہ کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد محافظ آ جاتا ہے اور سب کو ڈانٹنے لگتا ہے)

**محافظ:** ۔ارے بند کرو ہلا گھلا۔ اور دفا ہو جاؤ یہاں سے۔

**دانش:** ۔کیوں بھئی۔ اس شاہی باغیچے میں ہنسنے گانے پر پابندی ہے کیا ؟

**محافظ:** ۔باغیچے کے اس حصے میں لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔

**حلیمہ:** ۔کیوں۔

**محافظ:** ۔شہنشاہ کا حکم ہے۔

**مریم:** ۔ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ہمیں بھی یہاں رُکنے کا شوق نہیں ہے۔ آؤ چلیں۔

(دونوں لڑکیاں جاتی ہیں۔)

**محافظ:** ۔چلو اُٹھو۔ تم بھی یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔

(دانش بھی مجبور ہو کر اُٹھتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ محافظ دوسری جانب نکل جاتا ہے۔)

☆

(رقیہ بیگم ونگ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آ جاؤ۔)

**رقیہ:** ۔ آؤ شہزادی۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں ہے۔

(شہزادی ماہین سر سے پاؤں تک سفید گاؤن پہن کر آ جاتی ہے اور ادھر اُدھر دیکھتی ہے)

**ماہین:** ۔آہ۔ اب مزا آ جائے گا۔ اب میں عام لوگوں میں گھُل مل کر دیکھ سکوں گی کہ وہ کس طرح ہنستے کھیلتے ہیں۔ کس طرح ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کتنا اچھا لگے گا جب وہ ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر ہونٹوں سے ہونٹ ملا لیں گے۔

**رقیہ:** ۔مجھے نہیں لگتا میری موجودگی میں وہ ایسا کچھ کریں گے۔

**ماہین:** ۔تم یہاں موجود کیوں رہو گی ؟

**رقیہ:** ۔پھر کہاں جاؤں گی ؟

**ماہین:** ۔کہیں بھی۔ لیکن یہاں نہیں۔

رقیہ :۔ کہیں بھی جاؤں گی تو کل کے لوگ مجھے تیرے بغیر پائیں گے تو تمہارے بارے میں کئی طرح کے سوال پوچھیں گے۔ تم جانتی ہونا۔ میں جھوٹ بولتے وقت کس طرح لال پیلی ہو جاتی ہوں اور ہمیشہ پکڑی جاتی ہوں۔

**ماہین** :۔ ہاں یہ ٹھیک کہا تم نے۔ تم سارا کھیل بگاڑ دو گی۔ اس لیے تم یہیں کہیں کسی جاڑی کے پیچھے چھپ جاؤ۔

**رقیہ** :۔ وہ ٹھیک رہیگا۔

(رقیہ بیگم چھپ جاتی ہے۔ ماہین شہزادی تختے پر چڑھ کر کھڑا رہنے کا آسان طریقہ تلاش کرنے لگتی ہے۔)

**ماہین** :۔ نہیں۔ اس طرح تو میں بہت جلد تھک جاؤں گی۔ اس طرح ...... ہاں اس طرح تو میں دن بھر کھڑی رہ سکتی ہوں۔

(اتنے میں سٹیج کے پچھواڑے سے شہزادہ دانش مرلی بجاتا ہوا آتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے کچھ بچے، لڑکیاں، حلیمہ، مریم اور محافظ چلے آتے ہیں۔ دانش گارڈن بینچ پر بیٹھ کر چُپ ہو جاتا ہے۔)

**مریم** :۔ ارے مرلی والے۔ تم نے مرلی کیوں بند کر دی ؟

**دانش** :۔ کب سے بجا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر سانس تو لینے دو۔

**حلیمہ** :۔ بس۔ اتنی جلدی میں تیری سانس پھول گئی؟ تم تو پیشہ ور مرلی والے نہیں لگتے۔

**دانش** :۔ پیشہ ور نہیں ہوں۔ نا سہی۔ مرلی تو اچھی بجا لیتا ہوں۔

**محافظ** :۔ پیشہ ور لوگ تو مرلی بجانے کے ساتھ ساتھ داستانیں بھی سناتے ہیں۔ نت نئے کرتب دکھاتے ہیں۔ کیا وہ سب تمہیں نہیں آتا؟

**دانش** :۔ جی نہیں۔ وہ سب میں نہیں جانتا۔

**محافظ** :۔ پھر تو تم کسی کام کے نہیں ہو۔ تیرے ساتھ تو اپنا وقت ہی ضائع ہو جائے گا۔

**حلیمہ** :۔ کیوں نہ شہزادے کو دیکھ آئیں؟

**مریم** :۔ کیا شہزادہ آ گیا ہے؟

**محافظ** :۔ وہ تو بس آتا ہی ہو گا۔ ہو سکتا ہے آ بھی گیا ہو گا۔

**حلیمہ**:۔ پھر تو اُسی کو دیکھیں گے۔

(حلیمہ کے پیچھے سب چلے جاتے ہیں۔مریم وہیں کھڑی رہتی ہے)

**محافظ**:۔آؤ مریم۔ہم بھی چلتے ہیں۔

**مریم**:۔نہیں۔ہم یہیں رُکیں گے۔یہ بے چارہ اکیلا رہ جائے گا۔

**محافظ**:۔ایسے لوگ تو اس طرح کی ذلت کے عادی ہوتے ہیں۔ان کی عزت کون کرتا ہے۔

**مریم**:۔میں۔میں عزت کرتی ہوں ایسے فنکاروں کی۔بلکہ اس کا شکریہ بھی ادا کروں گی۔شکریہ مرلی والے۔تم بہت اچھی مرلی بجاتے ہو۔(ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑاتی ہے)۔

**دانش**:۔(ہاتھ ملاکر) میں بھی آپ کا شکرگزار ہوں۔آپ بہُت اچھی ہیں۔

**مریم**:۔ارے۔میں نے تو صرف شکریہ ادا کیا۔کچھ دیا تو نہیں۔

**محافظ**:۔لو ۔یہ ایک سکہ بھی دیدو۔خوش ہو جائے گا۔

**دانش**:۔شکریہ۔میں پیسے کے لیے مرلی نہیں بجاتا ہوں۔

**محافظ**:۔تمہاری مرضی ہے۔نہیں لو۔آؤ مریم۔اب چلتے ہیں۔

**مریم**:۔رُکو تو۔شاید یہ پھر سے مرلی بجائے۔

**دانش**:۔ہاں ضرور۔میں ضرور بجاؤں گا۔اور اس بار صرف آپ کے لیے بجاؤں گا۔

**محافظ**:۔کیوں ؟۔اس کے لیے کیوں بجاؤ گے ؟۔اس کو پٹانے کا ارادہ ہے ؟

**دانش**:۔ایسا تو میں نے نہیں کہا۔

**محافظ**:۔کان کھول کر سنو۔یہ لڑکی میری محبوبہ ہے۔اگر تم نے مرلی بجا کر اس کا من بھٹکانے کی ذرا بھی کوشش کی۔میں تمہارا بہت برا حال کردوں گا۔یاد رکھنا۔

**دانش**:۔آپ وہیں ہیں نا جس نے پندراہ منٹ پہلے باغیچے کا یہ حصہ خالی کرنے کے لیے ہمیں یہاں سے دھکیل دیا تھا۔تب تو یہ آپ کی محبوبہ نہیں تھی۔

**محافظ**:۔تب میں ڈیوٹی پر تھا اور ڈیوٹی کے وقت میں صرف اس باغیچے کا محافظ ہوتا ہوں۔

**دانش**:۔لیکن یہ میری مرلی سننا چاہتی ہے۔

**مریم**:۔ہاں۔بالکل۔میں سننا چاہتی ہوں۔

**محافظ** :۔نہیں ۔اب ہمیں یہاں سے جانا چاہیے۔

**مریم** :۔میں نہیں جاؤں گی۔

محافظ :۔ دیکھو مریم ۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ عظیم الشان شہنشاہوں کے عظیم الشان محافظوں میں شمار ہوتا ہوں ۔میرے ساتھ رہ کر تمہیں ہر طرح کا عیش و آرام مل جائے گا۔

**دانش** :۔لیکن جو سُکھ اس مرلی کی دُھن میں ہے۔وہ شہنشاہوں کے محل خانوں میں بھی نہیں ملے گا۔چاہے وہ کتنے بھی عظیم الشان ہوں۔لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ میری دُھن سُن کر بے جان چیزوں میں جان آجاتی ہے۔

**مریم** :۔سچ مرلی والے؟

**دانش** :۔ہاں ۔لوگ ایسا کہتے ہیں۔

**محافظ** :۔مریم ۔اس کی باتوں میں ہرگز مت آنا۔اس آوارہ خانہ بدوش گڈریئے کے لیے میرا دل توڑ دوگی تو بہت پچھتاؤ گی۔

**دانش** :۔میری مرلی کی دُھن میں ایسا جادو ہے کہ تم کہیں سے بھی کھچی چلی آؤ گی مریم۔

**محافظ** :۔پھر کہاں لے جاؤ گے اِسے ۔اپنے ساتھ دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے؟۔ ارے بے وقوف ۔عورت کو ایک مرد ہی نہیں ، ایک گھر بھی چاہیے ہوتا ہے۔تم تو خود بے گھر ہو۔ اسے کیا دو گے ۔اسے تو گھر بھی میں دوں گا اور گھر گرہستی بھی ۔۔۔۔

( محافظ مریم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے لے جاتا ہے۔مریم بار بار مُڑ کر دیکھتی ہے۔ تب دانش مرلی بجانے لگتا ہے تا کہ مریم لوٹ آئے۔لیکن وہ لوٹ کر نہیں آتی ۔دانش مرلی کی طرف حیرت سے دیکھتا ہے)۔

**دانش**:۔نہیں۔تیری دُھن میں کوئی کشش نہیں ہے۔جھوٹی ہے تو۔جھوٹی ہے تیری ساکھ۔

(اسی وقت حلیمہ دھیرے دھیرے اسکے قریب آجاتی ہے۔)

**دانش**:۔تم ؟۔تم تو شہزادے کو دیکھنے گئی تھی۔

**حلیمہ**:۔لوٹ کر آ گئی۔

**دانش** :۔کیوں ؟۔کیوں لوٹ کر آ گئی ؟ کس لیے ؟

**حلیمہ**:۔اس لیے کہ ہر رات کے بعد پھر سے سویرا ہوتا ہے۔ پت جھڑ کے بعد پھر بہار آتی ہے۔فصل کٹ جانے کے بعد پھر سے بیج بویے جاتے ہیں اور نئی فصل اُگ آتی ہے۔

**دانش**:۔کیا میں اسے اس مرلی کا جادو سمجھوں؟۔کیا میں سمجھوں تم پر میری دھُن کا اثر ہو گیا ہے ؟

**حلیمہ**:۔کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔

**دانش**:۔تو آخر میرے من کی مراد پوری ہوگئی۔اب میں زیادہ بہتر مرلی بجا سکوں گا اور تمہیں ایک الگ سی دنیا میں لے جاؤں گا جہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔اور کوئی نہیں ہوگا۔ جہاں ہم دونوں مل کر محبت کی فصلیں اُگائیں گے اور پیار کی ندیاں بہائیں گے۔

**حلیمہ**:۔(روتے ہوئے) بس کرو۔......اور کچھ مت کہو۔ میں............ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔

**دانش**:۔کیوں۔کیا ہوا ؟۔تم۔۔۔تم کیوں رونے لگی ہو؟

**حلیمہ**:۔کاش ایسا ممکن ہوتا۔لیکن میں جانتی ہوں ایسا ممکن نہیں ہے۔

**دانش**:۔کیوں ممکن نہیں ہے ؟

**حلیمہ**:۔کیوں کہ............ کیوں کہ تم سیدھے سادھے، آوارہ خانہ بدوش مرلی والے نہیں ہو جس کے ساتھ میں محبت کر سکتی۔تم نے مرلی والے کا ڈھونگ رچا کر مجھے یوں ہی بہکا دیا۔ اور پل بھر میں ہی زندگی کے کتنے حسین خواب دکھا دیئے۔

**دانش**:۔یہ کیا کہہ رہی ہو تم ؟

**حلیمہ**:۔میں ایک چمار کی بیٹی ہوں۔لوگوں کے ساتھ آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہماری اوقات نہیں۔ ہماری نظر لوگوں کے جوتوں پر ہوتی ہے اور آپ نے خانہ بدوش مرلی والے کا لباس تو پہن لیا ہے۔جوتے نہیں بدلے ہیں۔

**دانش**:۔(اپنے چمکیلے جوتے دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے) اوہ۔

**حلیمہ**:۔پھر بھی میں خوش ہوں۔ایک خواب تو پورا ہو ہی گیا۔

**دانش**:۔کون سا خواب؟

**حلیمہ**:۔اپنی آنکھوں سے ایک شہزادے کو دیکھنے کا خواب۔ایک چمار کی بیٹی کے لیے

اتنا ہی بہت ہے۔

(ماہین شہزادی چونک کر تھوڑی دیر کے لیے مُڑ کر شہزادے کے جوتوں کی جانب دیکھتی ہے۔اس دوران دُکھ کو چھپاتی ہوئی حلیمہ بھاگ جاتی ہے اور دانش بہت دُکھی ہو جاتا ہے)

**دانش:۔** یہ بہت برا ہوا۔کسی کا دل دُکھا کر اچھا نہیں کیا میں نے۔مجھے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔یہ سب اس مرلی کی وجہ سے ہوا۔اب مجھے اس پر بھی کوئی بھروسہ نہیں رہا۔میں اسے توڑ دوں گا۔

(دانش اپنی مرلی کو گھٹنے پر رکھ کر توڑنے لگتا ہے کہ عین اسی وقت وزیر پہنچ جاتا ہے)

**وزیر:۔** ہے۔یہ کیا کر رہے ہو تم ؟۔اپنی مرلی توڑ رہے ہو ؟

**دانش:۔** یہ میری مرلی ہے۔اس کے ساتھ میں کیا کروں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔

**وزیر:۔** لوگوں کا دل بہلانے والے فنکار کا اپنا کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہوتا۔خاص طور سے اس وقت جب لوگوں کو بہلانے کی ضرورت ہے۔

**دانش:۔** کیوں جناب۔کیا کوئی برا حادثہ پیش آیا ہے؟

**وزیر:۔** ابھی تو نہیں آیا۔مگر آ سکتا ہے۔لوگ کافی تذبذب میں ہیں۔اس لیے تم فوراً جاؤ اور لوگوں کو اپنی جانب مرغوب کرو۔اُن کا دل بہلاؤ۔جاؤ

**دانش:۔** معاملہ کیا ہے جناب۔کچھ تو پتہ چلے

**وزیر:۔** یہ سب جاننے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔تم صرف لوگوں کو اتنا بتا سکتے ہو کہ شادی کی رسم دیر سے شروع ہوگی کیوں کہ شہزادی کے لیے لباس سینے والے درزی کو دست لگ گیے ہیں اور۔۔۔۔اور شہزادہ جس رتھ پر آ رہے ہیں، اس رتھ کے ایک گھوڑے کے پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔اسی طرح کی کوئی دلیل سنا کر لوگوں کو مصروف رکھو۔جاؤ

**دانش:۔** جناب ہو سکتا ہے شہزادہ آ گیا ہو۔اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا ہو۔

**وزیر:۔** شہزادہ شہزادہ ہوتا ہے بے وقوف۔بھیڑ تو کیا وہ سو پردوں میں بھی دکھائی دیتا ہے اور تم زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔جیسا میں نے بتایا۔ویسا کرو۔

(دانش نکل جاتا ہے اور وزیر وہیں پریشان حال ٹہلتا رہتا ہے۔اتنے میں اچانک اس کی

نظر برہان پر پڑتی ہے)

**وزیر:** ۔ہیلو۔ہیلو مسٹر برہان۔مسٹر برہان۔

**برہان:** ۔او۔ہیلو وزیرِ سلطنت۔

**وزیر:** ۔آپ۔۔۔آپ کب آ گئے ہیں؟

**برہان:** ۔میں تو صبح کا آیا ہوں۔

**وزیر:** ۔شہزادہ دانش کہاں ہیں؟

**برہان:** ۔سوری۔ان کے بارے میں اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔کیونکہ میں اب اُن کا ملازم نہیں ہوں۔

**وزیر:** ۔اوہ۔پھر تم یہاں کیسے ؟

**برہان:** ۔عام لوگوں کے ساتھ آیا ہوں۔سوچا شاہی بیاہ کا نظارہ دیکھ لوں۔

**وزیر:** ۔ارے اس شادی نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔

**برہان:** ۔کیوں ؟

**وزیر:** ۔اب کیا بتاؤں۔پہلے شہزادے کی پریشانی تھی کہ وہ آیا کیوں نہیں۔اب شہزادی بھی غائب ہو گئی ہے۔

**برہان:** ۔کیا کہہ رہے ہو؟

**وزیر:** ۔سچ کہہ رہا ہوں۔لگتا ہے وہ کسی اور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔

**برہان:** ۔اچھا؟

**وزیر:** ۔ارے۔وہ کسی سے بھی شادی کرے۔ہمیں کیا مطلب۔ہمیں تو اپنی ذمہ داری سے مطلب ہے۔ہفتہ بھر سیاسی دوڑ دھوپ میں لگا ہوں۔انتظامات کے سو جھمیلے۔باغیچے کی سجاوٹ میں ایسی دوڑ دھوپ کرنا پڑی کہ بس کچھ نہ پوچھو۔اور پھر شہنشاہ کے فرمان۔ادھر یہ کرو۔ادھر وہ کرو۔کیاریوں میں پھول کیوں نہیں ہیں۔تختے پر۔۔۔

(اچانک یاد پڑتا ہے اور مورتی کی جانب دیکھتا ہے)۔۔۔شکر ہے۔باغبان کو شاید میں نے کہہ دیا تھا کہ اس تختے پر مورتی لگائیے۔کم سے کم ایک کام تو صحیح ہو گیا ہے۔

**برہان**:۔شہزادی کا کچھ پتہ چلا ؟

**وزیر**:۔ذرا دیکھ لوں۔شاید محل میں آ گئی ہو۔سوری۔مجھے جانا ہوگا

**برہان**:۔میں بھی اب چلتا ہوں۔ (دونوں مختلف سمتوں میں چلے جاتے ہیں۔)

☆

(تھوڑی دیر بیک گراونڈ میں شور شرابا رہتا ہے اور بعد میں دانش مایوس ہو کر لوٹتا ہے۔ مرلی اس کے ہاتھ میں ہے)

**دانش**:۔ہوں۔۔۔۔دو ٹکے کا مرلی والا۔ مفلس بے چارہ۔جس کا اپنا کوئی معاملہ نہیں ہوتا۔جس کی کوئی ساکھ نہیں۔کوئی پہچان نہیں جس کا کام صرف لوگوں کا دل بہلانا ہے اور لوگ...... لوگ اس کے فن کی قدر کیے بنا دل بہلائی کی قیمت ادا کرتے ہیں۔بھکاری سمجھ کر اس کے سامنے سکے پھینکتے ہیں۔ایسا فن کس کام کا جس کی کوئی قدر ہی نہیں۔اِس بے جان مرلی کی اب مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں رہی۔اسے توڑ دینا چاہیے۔

............لیکن نہیں۔میں اسے اس طرح ذلت کی موت نہیں دوں گا۔اسے چند اور سانسوں کا خراج دوں گا تاکہ عزت کی موت مرے۔

(دانش گارڈن بینچ پر بیٹھ کر مرلی بجانے لگتا ہے۔دھیرے دھیرے مورتی حرکت میں آجاتی ہے۔دانش دیکھتا ہے اور زور زور سے مرلی بجاتا ہے جب تک ماہین تختے سے اُتر جاتی ہے۔)

**دانش**:۔آخر وہ معجزہ ہو گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔میری مرلی نے آخر اپنا کمال دکھا ہی دیا۔ایسی دھُن بجادی میں نے کہ پتھر میں جان آ گئی۔آخر اس مرلی نے میری ساکھ رکھ لی اور میں نے.........میں نے ایک شاہکار کو جنم دیا۔

**ماہین**:۔اے مرلی والے۔بے شک آپ کی دھُن میں جادو ہے۔

**دانش**:۔تم۔۔۔تم بولتی بھی ہو ؟

**ماہین**:۔ہاں مسٹر دانش۔

**دانش**:۔اوہ۔میرے خدا۔یہ.....یہ تو کرشمہ ہو گیا۔لیکن.....لیکن تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟

**ماہین**:۔میرے اندر محبت کی چنگاری سلگانے والے اپنے مسیحا کو میں کیوں نہ جانوں؟

**دانش** :۔ مجھے آپ کی ان باتوں میں خوشامد کی بو آتی ہے۔ یہ بھی ایک دھوکہ سا لگتا ہے مجھے۔ میں ۔۔۔ میں آپ کی باتوں پر کیسے یقین کرلوں۔

**ماہین** :۔ آپ کو یقین کرنا ہوگا مسٹر دانش۔ کیوں کہ محبت کے بنا زندگی بے معنی ہوتی ہے اور جس زندگی کے معنی نہیں ہوتے وہ زندگی زندگی نہیں ہوتی۔ آپ کی اس مرلی کی دھُن نے میرے اندر محبت کی چنگاری سلگا کر میری زندگی کو معنی دیے ہیں۔

**دانش** :۔ لیکن آپ یہاں ۔۔۔

**ماہین** :۔ ایک شہزادہ اپنی محبت کی تلاش میں اگر مرلی والا بن سکتا ہے۔ تو کیا ایک شہزادی خالی تختے پر کھڑی ہو کر اپنی محبت کا انتظار بھی نہیں کرسکتی ؟

**دانش** :۔ تو کیا آپ شہزادی ہیں؟

**ماہین** :۔ ہاں......! میں ہی وہ شہزادی ہوں جس کے لیے آپ یہاں آئے ہیں اور بے شک یہ آپ کی اس مرلی کا کرشمہ ہے کہ ہم ایک ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھ سکے ہیں۔

**دانش** :۔ (مرلی کی طرف دیکھ کر) شکر ہے ہماری سا کھ رہ گئی۔

**ماہین** :۔ تو اے میرے سرتاج۔ آؤ (باہیں پھیلا کر) آؤ اور اپنی اس امانت کو اپنی باہوں میں لے کر یہاں سے لے جاؤ۔

**دانش** :۔ ہاں ۔۔۔ (باہیں پھیلا کر) ۔۔۔ اب ہمیں ایک ہو جانا چاہیے۔ اب ہم ایک ہو جائیں گے۔

(دونوں ایک دوسرے کے قریب آنے لگتے ہیں کہ پردہ گر جاتا ہے)

☆☆

ناولٹ

☆......وحشی سعید

# پھانس

## (۱)

ہر بغاوت میں جوش کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ جوش جب اعتدال کی صورت اختیار کرتا ہے تو جد و جہد کی لگن عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ یوں تو عروج ہی معراج ہے لیکن معراج حاصل کرنے کے لیے انل نے اپنے انفرادی ماحول سے بغاوت کی۔ آج اس کے پاس کچھ تھا تو وہ جد و جہد کا جذبہ۔ یہی وہ سرمایہ تھا جس کی لگن میں وہ ایک نئی منزل فتح کرنے نکلا تھا۔

پرانی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر آج وہ گہما گہمی نہیں تھی جو اس کی خصوصیت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے رات کی سیاہی میں سب سو گئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے بینچوں پر سوئے ہوئے مسافروں کے چہروں پر تھکن کی شکنیں پڑی ہوئی تھیں لیکن انل تھکا ہوا نہیں تھا۔ اس کے پاس اس کے آہنی ارادے تھے۔ وہ تیسری کلاس کے ٹکٹ گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

وہ زندگی میں کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں رہا۔ وہ سوچوں کا سفر کرتا رہا۔ ٹکٹ والے نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔

''کہاں کا ٹکٹ؟''

انل نے خود سوال کیا..... ''اگلی ٹرین کہاں جانے والی ہے؟''

''ممبئی....''

''ٹکٹ بناؤ......!'' ٹکٹ والے سے ٹکٹ لے کر وہ گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کے وقفے میں زندگی کی حقیقتیں اپنی تلخیوں کی عجیب و غریب صورتیں اختیار کرتے ہوئے اس کے دماغ میں رینگتے ہوئے داخل ہوتی رہیں۔

گاڑی آئی اور شاید انل کی ٹرین چھوٹ بھی جاتی، کیونکہ وہ اپنے خیالوں کی دنی میں بھٹکتا اور ڈوبتا رہا۔ ڈبے میں داخل ہو کے اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اچانک اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ زندگی کی دوڑ میں بھی یہی آنکھ مچولی کھیلتا رہا تو کہیں وہ مقصد فوت نہ ہو جائے جس کے لیے وہ بغاوت کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ وہ بڑبڑایا۔

''وہ مقصد فوت نہیں ہوگا۔''

وہ اپنے مضبوط ارادے کا اعادہ کرتا رہا۔

انل کے پہلو میں ایک کالا سوٹ والا بیٹھا تھا۔ جب سے اس نے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا تھا۔ وہ کالا سوٹ والا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ انل کے لیے وہ 'تجسس' کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ انل نے کالے سوٹ والے سے کہا۔

''آپ کہاں جانے والے ہیں؟''

''جہاں آپ جائیں گے.....میرا مطلب ہے جہاں تک یہ ٹرین جائے گی۔''

''ممبئی؟''

''ممبئی!''

اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے تمام سفر کے دوران اجنبی رہے۔ اور ٹرین اپنی مسافت طے کرتی رہی، پھر جانے وہ کون سا لمحہ رہا ہوگا، جب وہ نیند کی آغوش میں ہچکولے کھاتے ہوئے سو گیا۔ نیند جو آدمی کو تمام دنیا سے بے خبر کر دیتی ہے، وہ ایک بار پھر آدمی کو زندگی کے رنگین پہلوؤں سے آشنا کرا دیتی ہے۔ لیکن نیند خوابوں کو جنم دیتی ہے لیکن خواب! خواب کی طرح سراب اور بہلاوے کا نچوڑ ہوتا ہے۔ انل کے لیے بیٹھے ہوئے سو جانا ایک نیا تجربہ تھا.....لیکن زندگی بھی تجربوں کا نام ہے۔

پھر ریل کے انجن کی آواز بند ہو گئی۔ لوگوں کا شور، زندگی کی گہما گہمی، وہ ان سب کے نزدیک پہنچ گیا۔ کالے سوٹ والے نے انل سے کہا۔

''ممبئ آ گیا۔''

''ممبئ!''

ممبئ سنٹرل پر قلی اپنی سرخ وردی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتے ہوئے نظر آرہے تھے۔انل نے اپنی چھوٹی اٹیچی خود ہی سنبھالی اور ممبئ سنٹرل پر پاؤں رکھے۔

قلی نے پوچھا۔

''صاحب، سامان!''

''نہیں۔''

ممبئ کی یہ صبح سنہری دھوپ میں لپٹی ہوئی تھی۔اس مسکراتی ہوئی دھوپ نے جیسے انل سے کہا کہ اب تمہاری عملی زندگی شروع ہورہی ہے۔تمہارا عمل تمہیں کہاں پہنچائے گا، آنے والا وقت ہی اس کا جواب دے گا۔

''کہاں جانا ہے ساب؟'' ٹیکسی والے نے سوال کیا۔

''یوں تو سردار جی ممبئ شہر میرے لیے اجنبی نہیں ہے، لیکن آج جہاں میں جانا چاہتا ہوں وہ میرے لیے اجنبی علاقہ ہے۔'' انل بڑبڑایا۔

ٹیکسی والے سردار نے کہا۔

''پاشاؤ، اب بتاؤ تو سہی کہاں جانا ہے؟ ہم پہنچا دیتے ہیں۔''

انل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ایسے گیسٹ ہاؤس میں لے جاؤ سردار جی جہاں سستے دام میں رہنے کا انتظام ہو۔''

سردار جی نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''لو پاشاؤ ابھی پہنچائے دیتا ہوں۔''

کالا سایہ بھی ٹیکسی میں پیچھا کرتا رہا۔

انل ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ممبئ کی زندگی کا مطالعہ کرنے لگا۔بھاگ دوڑ کی زندگی اب بھی یہاں کا خاصہ ہے۔ہر موڑ پر بھیک مانگنے والوں کی ٹولی اب بھی موجود ہے۔جانے یہ لوگ بھی کب اور کیسے یہاں آئے۔کیا ان کے پاس کوئی مقصد رہا ہوگا؟ وہ سوچتا رہا اور ممبئ کے بازاروں کی

رنگینیوں میں کھو جانے لگا۔ ٹیکسی فارس روڈ سے گزر رہی تھی جہاں لوہے کے پنجروں کے پیچھے مختلف نسلوں کی عورتیں اپنے سڑے ہوئے جسموں کا سودا اپنے گاہکوں کے ساتھ طے کر رہی تھیں۔ ممبئی کی رنگینیوں میں جب کوئی بدنما پہلو ابھرتا ہے تو فارس روڈ پر بکنے والی ان عورتوں کے سڑے ہوئے جسم زندہ رہنے کے لیے اپنا حق مانگتے نظر آتے ہیں۔ جانے حساس آدمی اس بازار سے گزرتے ہوئے اپنی آنکھوں کو کیوں بند رکھتا ہے۔ شاید وہ اس حقیقت کو ایک فریب کی صورت دینا چاہتا ہے اور وہ خود سے کہتا رہتا ہے۔ واہمہ ہے، دھوکہ ہے!!

ٹیکسی تاج ٹاکیز پلے ہاؤس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ ٹیکسی والے نے انل سے کہا۔

''ساب، یہاں سے بغل والی گلی کے آخر میں ایک گیسٹ ہاؤس ہے، اگر آپ......''

انل نے ٹیکسی والے کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... ہاں چلو.....!''

ٹیکسی والا چلنے کو تیار ہوا کہ ایک آدمی نے کھڑکی کے اندر سر ڈالا۔

''ساب کون سے نمبر میں جانا مانگتا ہے؟''

''نمبر.....؟'' انل حیرانی سے پوچھ بیٹھا۔

ٹیکسی والے نے اجنبی سے کہا۔

''ارے بھاگ یہاں سے..... یہ ایسے ساب نہیں۔''

ٹیکسی والا چل پڑا۔ انل کے لیے نمبر کا معاملہ بھی معمہ تھا۔ اس نے ٹیکسی والے سے پوچھا۔

''یہ نمبر کا چکر کیا ہے؟''

''ساب، فارس روڈ کی عورتوں سے اونچا مال جو ہوتا ہے وہ نمبروں کے حساب سے بکتا ہے۔''

''او.....او.....!'' انل کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، مسکراہٹ نے طنز کی شکل اختیار کی..... طنز اپنے ماحول پر..... اپنے آپ پر۔

ایک پرانی اور بوسیدہ بلڈنگ کے سامنے ٹیکسی کھڑی ہوئی۔ تیسرے فلور پر سادھنا گیسٹ ہاؤس کا بورڈ آویزاں تھا۔ ٹیکسی والے نے کہا۔

''ساب یہ گیسٹ ہاؤس ہے۔''

شکریہ اور کرایہ ادا کر کے بلڈنگ کی جانب قدم بڑھائے اور ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بلڈنگ کے نیچے دو دکانیں تھیں۔ ایک موٹر کلینک کی دکان تھی، جس پر رحمت بھائی موٹر کلینک کا بورڈ آویزاں تھا۔ دوسری چائے والے کی دکان تھی جس پر شیریں فرہاد ریسٹورنٹ کی تختی آویزاں تھی۔ اس بلڈنگ کے ارد گرد پرانی بلڈنگوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آرہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹے ہوئے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے..... گلی کے سرے پر ایک چارپائی پر ۲۵ سالہ تنومند نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد ہم عمر نوجوانوں کی ٹولی تھی۔ ان میں کوئی اس کا پاؤں دبا رہا تھا، کوئی اس کا بازو، کوئی اس کا کندھا۔ گلی کے دوسرے سرے پر ایک بوڑھی اپنے میلے کچیلے ہاتھوں میں بار بار اپنے دس پیسے کے چند سکوں کو گن رہی تھی۔

انل نے بلڈنگ کے احاطہ میں پہلا قدم رکھا کہ تیز بھاگتی ہوئی نوجوان عورت سے اس کی ٹکر ہوگئی۔

''سوری۔''

انل نے رسمی انداز میں کہا ''جی کوئی بات نہیں۔''

سیڑھیوں کے اوپر والے سرے پر ایک نوجوان قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''بچ کے بابو.... بچ کے، یہ ممبئی ہے۔''

عورت شانِ بے نیازی کے ساتھ بلڈنگ سے باہر چلی گئی۔ انل ہکا بکا کبھی اوپر، کبھی نیچے دیکھتا رہا۔

تیسری منزل پر گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہوئے انل کو گجراتی وضع کا آدمی ملا۔ اس نے پوچھا۔

''بھائی صاحب، گیسٹ ہاؤس کے منیجر صاحب سے ملنا ہے۔''

''اپن ہی ہے منیجر اور مالک اس گیسٹ ہاؤس کا۔''

''جی میرا نام انل ہے اور میں......''

آدمی نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔

''میرا نام پٹیل ہے۔ شنکر راؤ پٹیل! سمجھے۔''

''دیکھئے مجھے ایک کمرہ چاہیے۔''

''پیسے ہیں جیب میں۔'' پٹیل نے پوچھا۔

''اچھا آؤ میرے ساتھ۔'' پٹیل اس کے جواب دینے سے پہلے ہی بولا۔

''کون سا ٹائپ کا کمرہ چاہیے۔''

جی سستا والا۔''

''سستا والا.......جنرل وارڈ......یہی سستا ہے۔''

''جنرل وارڈ.....!''

پٹیل ایک کشادہ ہال میں داخل ہوا، جہاں دو طرفہ چار پائیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان چارپائیوں پر مختلف قسم کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ پٹیل نے کہا۔

''یہیں ایک چارپائی پر ایک مہینے کے لیے پچاس لگتا ہے، مسٹر انل۔''

''جنرل وارڈ....!'' انل نے کہا۔

''جنرل وارڈ....!'' پٹیل نے واپس انل کے لہجے میں کہا۔

''اور اسپیشل......!''

''ہاں.....آؤ۔''

پٹیل اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں لایا۔ یہ ۸×۸ فٹ کا کمرہ تھا۔ ایک معمولی سی چارپائی اور کمرے کے ایک طرف ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ دیواروں پر چند کیل ٹھکے ہوئے تھے جن پر کپڑے ترتیب کے ساتھ لٹکائے جا سکتے تھے۔

''مسٹر انل یہ ہمارا اسپیشل کمرہ ہے لیکن یہاں ہر کمرے کے لیے ایک ہی باتھ روم ہے۔ اس کمرے میں آپ تاج محل ہوٹل یا شیرٹن میں رہنے کے لیے تصور تو کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ کمرہ تاج محل ہوٹل یا شیرٹن کا نہیں ہو سکتا۔''

''اور کرایہ؟''

''کتنے دنوں کے لیے۔''

''مہینے کے حساب سے؟''

''نوے روپے مہینے کے لیے۔''

انل نے جیب سے دو سو روپے نکالے اور کہا۔

''پیشگی۔''

''دوسو روپے!..... ایک ساتھ ایڈوانس..... مسٹر انل آپ نے ایک ساتھ دوسو روپے ایڈوانس دیے..... اس لیے آپ دوسو روپے پر ڈھائی مہینے تک رہ سکتے ہیں۔''

انل نے مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی، جی..... ضرور!''

پٹیل کے جانے کے بعد انل نے اپنی چھوٹی سی اٹیچی سے چند کپڑے نکالے اور نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا..... غسل سے فارغ ہونے کے بعد معمولی سی چارپائی پر آرام کرنے لگا اور ایک بار پھر نیند کی دیوی کی آغوش میں چلا گیا اور خوابوں نے اس کے ذہن میں خاکے ترتیب دے۔

خواب دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن زندگی کے قریب جب آدمی جاتا ہے تو خواب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ حقائق جب بھیانک صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہ ایسے لمحات ہمت کے لیے چیلنج بن جاتے ہیں۔ انل نے بھی اپنے مستقبل کے ساتھ بہت سارے سنہرے خواب وابستہ کر رکھے تھے۔ لیکن خوابوں کی تعبیر نے تھوڑی دیر کے لیے اس کو بوکھلا کر رکھ دیا، Greater Bombay کے سارے علاقے انل نے چھان مارے۔ بی اے کی فرسٹ کلاس کی ڈگری اس کے گلے میں تختی بن کر لٹک تو رہی تھی لیکن اس کا کوئی قدر دان نہیں ملا..... ممبئ میں اسے ایک ہفتہ ہو گیا، لیکن ہر طرف ناکامی اور مایوسی کے اندھیرے پھیلتے جا رہے تھے..... نوکری کا ملنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل بن گیا.... ایک ہفتہ کے بعد جب اس نے نقدی کا جائزہ لیا تو اپنے پاس صرف پچاس روپے اور کچھ ریزگاری پائی۔ ذہن نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ خود سے کہہ پڑا۔

''فاقے کرنے کے دن قریب آنے لگے۔''

لیکن ایک بار پھر اس نے ہمت اور قوت کو جمع کر لیا۔ ایک بار پھر وہ میدان عمل میں سرگرم ہونے کے لیے تیار ہوا۔ وہ بلڈنگ سے نکل کے جوش اور ہمت کے ساتھ ایک کاروباری ادارے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اخبار کے ''ضرورت ہے'' کے کالم مین ایک کاروباری ادارے نے ایک کلرک کی جگہ کے لیے امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''مجھے میری قابلیت کی وجہ سے یہ جگہ ملنی چاہیے۔''

وہ اپنے انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا جارہا تھا کہ رحمت بھائی میکینک کی آواز کانوں میں پڑی۔

''اے بابو.....اے بالو....''

وہ رک گیا۔

''ہاں بولو.....کیا کام ہے؟''

''بابو، ذرا اس لفافے پر ایڈریس لکھ دو۔ اپن ذرا معمولی اردو جانتا ہے۔ اس لیے اچھی طرح ایڈریس نہیں لکھ پاتا۔''

انل اسٹول پر بیٹھ گیا اور رحمت بھائی سے ایڈریس پوچھ کے لفافہ پر لکھ دیا۔

''بہت مہربانی۔ چائے کا گلاس منگا دوں۔''

''نہیں نہیں، شکریہ مجھے کام پر جانا ہے۔''

''اچھا، شام کو ملنا بابو۔''

''اچھا۔''

انل نے رحمت بھائی سے اجازت لی اور انٹرویو کے بارے میں سوچتے ہوئے بس اسٹینڈ پہنچ گیا۔

بس اپنے مقررہ وقت پر اسٹینڈ آکر رکی، وہ سوار ہوا، اور راستہ میں انٹرویو کے بارے میں اپنے دماغ کو دوڑاتا رہا۔ بس اسٹاپ پر رک گئی....اس کاروباری ادارے کی فلک پیما عمارت پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔

کیا کبھی میرے ارادے کی عمارت بھی آسمان کو چھوتی ہوئی نکل جائے گی۔''

لفٹ نویں منزل پر آکر رک گئی۔ وہ اترا اور انٹرویو ہال کی جانب چل پڑا۔ وہاں انٹرویو دینے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی اینگلو انڈین لڑکی جو بہت ہی نازک اور خوبصورت تھی۔ سب سے درخواست لے رہی تھی اور لینے سے پہلے چند سوالات کرتی تھی۔ انل نے اپنی درخواست رکھی، کاؤنٹر گرل نے کاغذات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپ مراٹھی ہیں؟''

''جی نہیں۔ میں دراصل دہلی کا رہنے والا ہوں۔''

''دیکھئے، یہ جگہ صرف مراٹھی کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔''

''مراٹھی۔''

لڑکی انگریزی میں بول پڑی۔

I am sorry, I cannot entertain your application.

یوں تو کئی دنوں سے وہ مختلف اداروں میں گیا اور کورا جواب لے کے آیا....لیکن آج نہ جانے کیوں بوکھلا گیا۔ اگلے لمحہ وہ خود سے کہہ پڑا۔

''مردوں نے زندگی میں صرف لڑنا سیکھا ہے۔''

وہ پختہ ارادے سے باہر آیا اور آسمان کی وسعتوں میں اپنی منزل ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ تھکا تھکا اپنے گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔ کالا سوٹ والا جو کبھی ٹرین میں اسے ملا تھا، نظر آیا، وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

''بھئی تم ہو کون؟ جب بھی تم ملتے ہو، میں مایوسی کی انتہا کے قریب ہوتا ہوں۔''

لیکن وہ کالے سوٹ والے سے نہیں بولا اور چپ چاپ اپنے راستہ چلا گیا۔ ایک بار پھر وہ اپنے عزائم کا اعادہ کرتا رہا۔ ایک بار پھر وہ اپنی ہمت اور جرأت کو توانائی کی کسوٹی پر جلا بخشنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس رات وہ بہت دیر تک نہیں سویا۔ اور خیالوں کے تانے بانے میں الجھا رہا۔ خود کو کبھی ڈوبتے ہوئے پایا اور کبھی کنارے کی جستجو میں زور آزمائی کرتے ہوئے۔

دوسرے دن سویرے اٹھ کر اس نے منھ دھونے کے بعد ہلکا سا ناشتہ کیا اخبار کے Wanted کالم کا بڑے غور سے جائزہ لیا۔ آج کل لوگوں کے پاس ٹکنیکل ڈگریوں کی اہمیت ہے۔ بی.اے. کی ڈگری گھٹتے گھٹتے تیسرے درجے کی کلرکی پر پہنچ گئی۔ لیکن کلرکوں کی بہتات پہلے سے ہی ہے۔ اس لیے اب Wanted کالم میں کلرکوں کے سلسلے میں اشتہار کبھی کبھار ہی نظر آتے ہیں۔ انل نے مایوس ہونے کے بعد اخبار دوسری طرف پھینک دیا۔ اپنی مالی حالت کا جائزہ لیا۔ اس کے پاس نقدی اثاثہ اب صرف دو روپے پچیس پیسے تھے۔ مزید پندرہ دن تک گیسٹ ہاؤس میں رہ سکتا تھا۔ لیکن اب ان پندرہ دن میں روزانہ پندرہ پیسے اپنے کھانے پر خرچ کر سکتا تھا۔

پھر پندرہ دن کے بعد..... میں فٹ پاتھ پر ہوں گا..... کھانے کے لیے ایک کوڑی نہیں

ہوگی۔پھر بھیک.....

میں......میں......میں اپنے مقصد کی ہار ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے نوکری کرنی ہوگی، پچاس روپئے کی نوکری ہی ہو......لیکن نوکری ہو...... معمولی ہو، لیکن کمائی ہو۔ وہ پھر ایک بار اٹل فیصلے کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا گیسٹ ہاؤس کی بلڈنگ سے باہر آیا۔ رحمت بھائی کی دکان کے قریب پہنچا۔

''اے بابو.....ادھر آ.....'' رحمت بھائی نے کہا۔ انل اس کی دکان کے قریب پہنچا۔ رحمت بھائی نے اپنے میلے کچیلے اسٹول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو بابو.....بیٹھو''

اس کی دکان میں موٹر گاڑیوں کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ سامنے دو موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں ان پر دو لونڈے کام کر رہے تھے۔

''نوکری ملی بابو....''

''نہیں۔''

''ممبئی ہے یہ ممبئی بابو..... یہاں آدمی منٹوں میں کروڑ پتی بھی بن جاتا ہے، اور کبھی کبھی ہفتوں کھانا نہیں ملتا ہے۔''

''شاید میری زندگی میں بھی فاقے کرنے کے دن آرہے ہیں، انل انتہائی کرب سے بولا۔'' اب بولو کیا کروں۔''

''ڈرائیوری جانتے ہو؟''

''ہاں۔''

''کہاں تک پڑھا ہے؟''

''بی اے۔''

''ڈگری کو چوپاٹی کے پاس سمندر میں پھینک کے آجاؤ۔''

''کیا مطلب؟''

''ڈگری بھول جاؤ، یہ کہو ڈرائیوری جانتے ہو۔ ان پڑھ ہو، ڈرائیوری کی تلاش میں ہو، تب نوکری مل سکتی ہے۔''

''میں ڈگری بھول جاؤں گا۔ میں یہ بھی بھول جاؤں گا کہ میں ان پڑھ ہوں، اگر مجھے نوکری مل جائے۔''



''مل جائے گی۔'' رحمت بھائی نے اطمینان بھرا جواب دیا۔

''مل جائے گی.... کہاں؟ کیسے.....؟'' انل نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے راجہ تیرا نقشہ وہاں بٹھایا ہے جہاں اچھی تنخواہ کھانا اور رہنے کے لیے جگہ بھی ملے گی۔''

''لیکن یہ تو بتاؤ، ہیں کون لوگ وہ؟''

''یار نام تو میں بھی نہیں جانتا۔ ہاں ان کا منیجر ایک بوڑھا آدمی، ان کی بڑی بیوک کار، میرے پاس مرمت کے لیے لاتا ہے۔ کچھ دن پہلے ان کا ڈرائیور بھاگ گیا۔ منیجر نے مجھ سے ایک اچھا سا ڈرائیور دلانے کے لیے کہا ہے۔ سو اپن کو تمہارا خیال آیا، میں نے آج چار بجے اس کو آنے کے لیے کہا ہے۔''

''کیا معلوم مجھے یہ نوکری ملے گی یا نہیں۔'' انل نے مایوس آواز میں کہا۔

''بیٹے خان یہ نوکری تمہیں ضرور ملے گی۔ رحمت جس کے لیے بات کرتا ہے اس کی نوکری سو فی صدی پکی ہوتی ہے۔'' رحمت نے نو عمر چھوکرے سے کہا۔

''چھوکرے، دو گلابی چائے لا، بھاگ کے جا... اپنے بیٹے خان کے ملازم ہونے کی خوشی میں۔''

''رحمت بھائی آدمی فرسٹ کلاس ہے، ارے اپن نے تم کو یار کہا ہے۔ ہماری یاری کسی دن کسوٹی پر پرکھنا۔''

انل نے دہلی سے جو سفر شروع کیا تھا اس سفر کا انجام کیا ہوگا..... اس کی زندگی کو کہاں جا کے اطمینان اور سکون میسر ہوگا۔ یہ بات اسے نہیں معلوم تھی لیکن ایک بات اس کے دماغ میں چسپاں ہو کے رہ گئی کہ دہلی کے سفر نے رحمت بھائی جیسا مخلص دوست دیا۔

چار بجے تک وہ اپنے کمرے میں سوتا رہا۔ سوا چار بجے رحمت بھائی کی دکان میں آیا۔ منیجر ابھی تک نہیں آیا تھا، ساڑھے چار بجے منیجر نے رحمت بھائی کی دکان کے سامنے اپنی فیٹ گاڑی کھڑی کی۔

اس نے گاڑی سے اترتے ہی کہا۔

''معاف کرنا رحمت بھائی، آفس میں بہت کام ہونے کی وجہ سے وقت پر نہ آسکا۔''

"ٹھیک ہے ساب، آپ ٹھہرے سیٹھ لوگ۔
"نہیں نہیں رحمت بھائی ایسی بات نہیں ہے۔ میں بھی اس کمپنی کا ایک ملازم ہوں۔"
"خیر منیجر صاحب یہ اپنا یار انل ہے۔ آج سے یہ آپ کی بیوک کار چلائے گا۔"
"چلو، چلو.... میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہارے پاس کچھ سامان ہے۔"
"سامان، سوٹ کیس ہے۔"
"لاؤ...لاؤ.....جلدی اپنا سوٹ کیس لاؤ۔ تمہیں رہنے کے لیے وہاں ہی جگہ ملے گی۔"
"اچھا، ابھی لاتا ہوں۔" انل بھاگتے ہوئے گیسٹ ہاؤس سے سوٹ کیس لایا پھر رحمت بھائی سے کہا۔
"اچھا رحمت بھائی تمہارا بہت شکریہ۔"
"اپن کے تم یار ہو، انل.... کبھی اپن کی ضرورت ہو، فوراً چلے آنا۔"
دونوں نے ہاتھ ملایا.... منیجر نے سے کہا۔
"نمستے رحمت بھائی۔"
"خدا حافظ...." رحمت بھائی نے ان کو کار میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ انل منیجر کے ساتھ ایک نئے سفر کے لیے روانہ ہوا۔ پہلی بار وہ خود کمائے گا۔ محنت کی کمائی.....اچانک اس کو کالے سوٹ والا سایہ یاد آیا، جو اس وقت بھی ایک کار میں ان کا تعاقب کرر ہا تھا۔
اس نے آہستہ سے کہا۔
"منحوس ہمیشہ میرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔"

(۲)

الف لیلیٰ کے قصے بڑے لطیف اور میٹھے ہوا کرتے ہیں۔ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ شہزادہ بے ہوش ہو گیا، ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو ایک شان دار محل میں پایا۔ دیواریں سنگ مرمر کی تھیں۔ فرش ایرانی قالینوں سے سجا ہوا تھا اور فرنیچر مخمل، کم خواب اور اطلس سے۔ نوکر چاکر ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتے نظر آرہے تھے۔ عطر سے مہکے ہوئے اس ماحول میں شہزادہ حیرت زدہ کھڑا تھا۔
انل جب بنگلے میں داخل ہوا تو کچھ اسی قسم کا نظارا تھا۔ پھر منیجر کی آواز نے اس کو جاگتی

ہوئی بے ہوشی سے واپس بلایا۔

''شمبھو.....!شمبھو.......!!''

شمبھو، ایک بوڑھا نوکر تھا، وہ دوڑتے ہوئے منیجر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''شمبھو! یہ نیا ڈرائیور انل ہے اس کو رہنے کے لیے جگہ بتاؤ۔''

''اور مالکن کہاں ہیں؟''

''وہ کلب گئی ہیں، گاڑی خود چلا رہی تھیں۔''

''اف....اف.... کتنی بار اسے کہا کہ گاڑی خود مت چلاؤ۔'' منیجر نے جھنجھلاہٹ میں کہا۔

''خیر....تم انل کو رہنے کی جگہ دکھاؤ اور اس کو کام سمجھاؤ۔''

''جی بہت اچھا۔'' شمبھو نے انل سے کہا۔

''آیئے صاحب۔''

انل شمبھو کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بنگلے کے پاس نوکروں کے رہنے کے لیے کوارٹر تھا۔ ایک کمرے کا شمبھو نے قفل کھولتے ہوئے کہا۔

''آپ کا کمرہ۔''

انل نے کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔ کسی بھی اچھے ہوٹل سے اچھا کمرہ تھا۔ کمرے میں پلنگ لگا ہوا تھا۔ اس پر صاف ستھرا بستر تھا۔ پاس میں دو کرسیاں تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل تھا۔ اور اس کے ساتھ چھوٹا سا اسٹول۔ ایک بڑی الماری تھی۔ فرش مرزاپوری قالین سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی باتھ روم۔ فلش باتھ روم بھی صاف اور ستھرا۔

انل نے اپنا سوٹ کیس نیچے رکھا اور ایک لمبی سانس لی جیسے اب طویل سفر کے بعد اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا ہو۔

پلنگ پر وہ آہستہ آہستہ بیٹھا۔ شمبھو نے کہا۔

''لگتا ہے، بابو تم پڑھے لکھے ہو، اور کسی اچھے خاندان کے ہو۔''

''کیا مطلب؟ نہیں تو..... بھئی پھر میں ڈرائیور کی نوکری کیوں کرتا۔''

شمبھو کے جملے سے وہ بوکھلایا۔ اس لیے الفاظ اس کی چغلی کھانے پر آمادہ نظر آرہے تھے۔

شمبھو نے کہا۔

''بابو ہمارے تو بال سفید ہونے کو آئے۔دنیا دیکھی ہے، مختلف رنگ و نسل، ذات و پات، ڈھنگ اور طریقے کے انسانوں سے ملتے ہوئے۔آپ جو بستر پر آہستہ آہستہ بیٹھے وہ طریقہ ہے ایک مہذب کا، پڑھے لکھے اور اچھے اخلاق والے کا۔ڈرائیوری کرنے والے کی ہر ادا میں بیساختہ پن ہوتا ہے۔جیسے فوراً بریک پر پاؤں رکھا ہو، یا گیئر بدلا ہو یا چلتے چلتے اچانک گاڑی کے سامنے رکاوٹ آئے تو فوراً موٹر کاٹنی پڑے.....ان سب حرکات میں بے ساختہ پن ہوتا ہے اور یہ بیساختہ پن ڈرائیور کی زندگی کا بھی حصہ بن جاتا ہے۔وہ ہر چیز موٹر گاڑی کے انداز میں پرکھتا ہے، دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے، اس لیے صاف ظاہر ہے بابو کہ یہ نوکری آپ کی مجبوری کا نتیجہ ہے۔''

تھوڑی دیر کے لیے وہ گاؤں کے ایک معمولی ان پڑھ بوڑھے کو تکتا ہی رہ گیا.....زندگی کا اس قدر گہرا مطالعہ اور پھر اس مطالعہ سے استفادہ کرنا....انل شمبھو کی دانشمندی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

بوڑھے نے اسے خیالات کے ادھیڑ بن سے واپس لاتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں سوچتا ہوں بابو.....اس سلیقے کا آدمی ہماری مالکن کے پاس ایک ہفتہ سے زیادہ نوکری نہیں کرسکتا۔''

''کیوں؟ ایسا کیوں....؟''

''وہ تیز مزاج نہیں تھی، لیکن اب بات بات پر ٹوکتی، جھگڑا کرتی اور ہر معمولی مسئلے کو اتنا اہم بنا دیتی ہے کہ آدمی خود بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ ہاں کچھ ضرور ہوا ہے۔پھر آہستہ آہستہ ہر حساس آدمی ایسے ماحول سے فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔اب تمہارا اگلا سوال یہ ہوگا کہ شمبھو تم اب تک یہاں کیسے ٹکے ہو؟ بابو دراصل میں نے کومل بیٹی کو گود میں پالا ہے.....دو سال پہلے وہ نہایت ہی رحم دل تھی، کومل تھی، لیکن اچانک ایک منحوس دن سیٹھ جی اور سیٹھانی جی موٹر حادثہ میں کومل بیٹی کو اس دنیا میں اکیلے چھوڑ کر چلے گئے۔کومل بیٹی کو اس حادثہ کا ایسا اثر ہوا کہ کچھ دنوں تک ہوش ہی نہیں آیا۔ہوش آیا تو جنونی حرکتوں میں مبتلا ہوگئی۔لیکن میں نے اور منیجر بابو نے حالات سنبھالے.....ڈاکٹری علاج نے کومل بیٹی کو ٹھیک کیا۔لیکن اس کے بعد میرے اور منیجر بابو کے علاوہ جو بھی اس کے سامنے آتا ہے، اس کی تیز مزاجی اور غصے کا شکار ہوتا ہے۔اس کی ہر حرکت میں غصہ اور صرف غصہ ہوتا ہے لیکن میں جانتا ہوں اس کے اندر اب بھی

ایک ایسی عورت موجود ہے جو کومل کی طرح کومل ہے، رحم دل ہے لیکن اس وقت وہ عورت سوئی ہوئی ہے۔"

انل کے لیے شمبھو پر اسرار بنتا جا رہا تھا۔ وہ اس بوڑھے سے بہت متاثر ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے کلام سے کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ شمبھو تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

"اب بابو تم یہ سوچو گے کہ شمبھو یہ سب باتیں مجھے کیوں بتا رہا ہے، یہ سچ سمجھ لو یا جھوٹ، لیکن ہمارا یقین ہے کہ تم میں وہ آدمی نظر آ رہا ہے جو کومل کے اندر سوئی عورت کو جگا دے گا۔"

پھر اس نے دیوار پر لگی ہوئی سرخ بتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بلب جب بھی جل اٹھے گا، سمجھ لینا کہ کومل بیٹی تم کو بلا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی گھنٹی بھی بج اٹھے گی۔ رات ہو یا دن کسی بھی وقت کام کے لیے یہ اشارہ ملے گا..... میں ابھی تمہارے لیے چائے بھجوا دیتا ہوں۔ شام کا کھانا تھوڑی دیر بعد آئے گا۔"

یہ کہتے ہی شمبھو وہاں سے چل پڑا۔ انل کے ہونٹوں تک بات آتے آتے رہ گئی۔ پھر وہ بوکھلائے ہوئے خود سے کہہ پڑا۔

"یہ سارا گھر میرے لیے ایک معمہ بن گیا ہے...." اور رات کے اندھیرے پھیلنے لگے۔

## (۳)

دن کی ابتدائی روشنی کے ساتھ ہی انل کی آنکھ کھل گئی، وہ اٹھا باتھ روم میں نہایا۔ بالو میں کنگھی کرتے ہوئے، سرخ بلب اور گھنٹی پر نظر پڑتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔

"کیا یہ گھنٹی رات کو بجی تھی......" خود سے اس نے سوال کیا۔

"نہیں تو....." اپنے سوال کا اپنا یہ جواب پا کر وہ کسی قدر مطمئن ہوا..... کنگھی کرتے کرتے وہ دوبارہ خیالوں میں الجھ گیا اور سوچنے لگا۔

"کومل اگر واقعی تیز مزاج ہے، بات بات پر ڈانٹتی ہے، تو مجھ جیسے حساس آدمی کا یہاں ٹکنا دشوار ہو گا۔ لیکن اتنی بڑی ممبئ میں دو ٹکے کی عزت دار نوکری بھی ملتی کہاں.....؟ بہر حال یہ نوکری کرنی ہو گی.....لیکن یہ بوڑھا شمبھو کیا کہہ رہا تھا کومل.....سوئی عورت.....میں جگا دوں گا.....بے وقوف آدمی.....میرے لیے ایسا خیال کرنا بھی گناہِ عظیم ہے.....جتنے دن اس گھر میں روزی نصیب ہو گی۔ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اپنا کام انجام دوں گا۔"

کوٹھی کے ایک ملازم نے دروازے پر دستک دی۔اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔انل نے دروازہ کھولا۔ملازم کے ہاتھ میں چائے کی پیالی اور چند بسکٹ تھے۔

''لو بابو......مالکن نے کہا کہ نو بجے تیار رہنا۔سامنے گیراج میں گاڑی ہے۔یہ لو کنجی!''

چائے سے فراغت حاصل کر کے انل نے گیراج سے گاڑی نکالی۔اس کو دھویا.....صاف کیا.....اور دلہن کی طرح چمکایا۔آج وہ بیوک کار چلائے گا۔

وہ بہت خوش تھا۔

جیسے کوئی انمول تحفہ ملا ہو۔

ساڑھے آٹھ بجے وہ بالکل تیار تھا۔اس نے اپنے کوارٹر میں جا کر الماری سے ڈرائیور کی وردی نکال کر پہن لی....بیوک کار کو کوٹھی کے مین دروازے کے سامنے کھڑا کیا اور مالکن کا انتظار کرنے لگا۔اس نے سوچا کہ اس کو اپنا ہر کام تندہی سے انجام دینا چاہیے تاکہ مالکن کسی بھی بات پر غصہ نہ ہو جائے۔

ٹھیک نو بجے ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ قیمتی ملبوسات پہنے کوٹھی کے دروازے سے برآمد ہوئی۔اس کے پیچھے پیچھے شمبھو تھا۔

وہ نہایت ہی حسین اور معصوم چہرہ تھا۔

انگارے جیسے حسین عارض۔

گلاب کی پنکھڑیاں جیسے ہونٹ۔

اور بڑی بڑی آنکھیں۔

لمبی لمبی کالی زلفیں۔

سروقد.....اور لچک دار چال۔

اس کی ہر ادا میں ایک جلال تھا۔حسن تھا۔

انل مبہوت رہ گیا۔

جانے اس پل میں، اس لمحے میں کتنے فاصلے طے کر پایا، لیکن وہ ایک لمحہ رہا۔ایک پل رہا.....دوسرے لمحے سلام کے لیے اس کا ہاتھ اٹھا۔

''ڈرائیور......!'' وہ غضب ناک آواز تھی۔

انل بوکھلایا۔

''جی میم صاحب!''

''تمہاری ٹوپی تمہارے سر پر کیوں نہیں ہے؟''

انل کا ہاتھ اپنی سیٹ پر فوراً گیا..... سر پر ٹوپی رکھی.....وہ سب مشینی انداز میں ہوا۔

''ہم ایسی حرکت برداشت نہیں کرتے.....اس بات کا خاص خیال رہے....'' یہ جملہ پہلے جملے سے تھوڑی دھیمی آواز میں تھا۔ لیکن لہجے کا جلال اب بھی برقرار تھا۔

انل نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

شمبھو نے کہا۔

''بیٹی آج جلدی آنا۔''

شمبھو کاکا، آج کلب میں پارٹی ہے۔ اس لیے زیادہ دیر ہوگی۔

کومل نے شمبھو کے سوال کا جواب نہایت شیریں آواز میں دیا۔

انل کومل کی تھوڑی دیر پہلے کی غضب ناک آواز اور اس شیریں آواز میں موازنہ کرنے لگا۔

کومل نے اب انل سے کہا۔

''چلو آفس چلو۔''

انل نے شمبھو کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں شمبھو سے پوچھا یہ آفس کہاں ہے اور شمبھو آنکھوں کی زبان سمجھ گیا۔ اس نے کہا۔

''آفس جیولس سنیما کے سامنے والی بلڈنگ میں ہے۔'' انل نے کار اسٹارٹ کی۔ کومل نے شمبھو سے کہا۔

''کھانا آفس بھیج دینا۔''

گاڑی چل پڑی۔ مسافت طے کر کے آفس بلڈنگ کے سامنے انل نے گاڑی کھڑی کی۔ اور دروازہ کھولا۔ کومل گاڑی سے اتری۔ لفٹ مین نے سیلوٹ دیا اور لفٹ کا دروازہ کھولا۔

لفٹ اوپر چلی گئی۔ انل نے آسمان کی طرف دیکھا اور خود سے کہنے لگا۔

''کومل دیوی کتنی اوپر ہو تم.....اور کتنا نیچے ہوں میں۔ اس لیے آپ ٹوپی سر پر نہ رکھنے کی

وجہ سے اتنی غضب ناک ہو سکتی ہیں۔اس لیے میں بوکھلا سکتا ہوں اور مشینی انداز میں ٹوپی اپنے سر پر رکھ لیتا ہوں۔

''کیا میں کبھی یہ مسافت طے کر کے اونچا۔کیا لفٹ کی تیزی کی طرح یہ مسافت میں طے کر پاؤں گا۔''

خواب!

صرف خواب!!

انل نے گاڑی کو سائیڈ میں پارک کیا اور خواب کا حقیقت میں بدلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً چار گھنٹے تک وہ گاڑی میں بیٹھا رہا۔پھر چپراسی نے آ کر کہا۔

''منیجر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں؟''

وہ چپراسی کے ساتھ آفس والے فلور میں چلا گیا۔یہاں بہت لوگ اپنی اپنی میزوں پر خاموشی کے ساتھ کام کرر ہے تھے۔منیجر ایک کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔وہ کیبن میں داخل ہوا،منیجر نے کہا۔

''آؤ.....آؤ.....انل۔''

انل نے نمسکار کیا.....منیجر نے کہا۔

''تم نے اپنا کام سنبھالا.....؟''

''جی ہاں.....''

''ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔''منیجر نے کہا''میں نے رحمت بھائی سے کہا تھا کہ تمہاری تنخواہ معقول ہوگی۔ہم نے تمہاری تنخواہ تین سو روپئے ماہوار مقرر کی ہے۔کیونکہ تمہاری دن اور رات والی ڈیوٹی ہے۔اس لیے کھانا پینا کپڑا اور رہنے کی جگہ اس کے علاوہ۔''

''جی بہت شکریہ۔''

''انل تم اپنا کام ٹھیک ڈھنگ سے کرو تو تمہارے کام کے پیش نظر تمہاری تنخواہ میں اضافہ بھی ہوگا۔''

''میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا،کہ آپ کو شکایت کا موقعہ نہ ملے۔''

''ویری گڈ.....اب تم جا سکتے ہو۔''

کیبن کے باہر پھر اس کو چپراسی ملا۔

''ڈرائیور بھائی، آپ کا کھانا آیا ہے۔ کامن روم میں رکھا ہوا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔''

کامن روم میں آفس کے تمام ملازم کھانا کھاتے تھے۔ انل نے بھی کھایا اور گاڑی میں واپس آ گیا۔

شاید پانچ بجے کا وقت رہا ہوگا۔ جب چپراسی اس کے پاس آیا۔ دو روپئے اس کے ہاتھ میں سونپتے ہوئے کہا۔

''منیجر بابو نے چائے کے لیے پیسے دیئے ہیں، جا کے سامنے والے ہوٹل میں پی آؤ....''

انل نے ریسٹوران میں چائے پی۔ اور گاڑی میں واپس آ گیا۔ وہ سوچنے لگا کیا اس کی زندگی صرف ایک ڈرائیور کی صورت میں انجام پذیر ہوگی۔ کیا اس کی زندگی تعطل کی شکار ہوگی۔

وہ عمل چاہتا تھا۔ وہ اڑان چاہتا تھا۔ رفتار چاہتا تھا۔ بے حسی کی زندگی نہیں۔ وہ اپنی منزل کا یہ انجام جان لینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا......لیکن اب تو وہ صرف سوچ سکتا تھا یا خواب میں اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ ساڑھے چھ بجے کے قریب اجالے اندھیروں میں ڈوبنے لگے!!

(۴)

رات نے اپنی سیاہی پھیلا دی، جیسے ہر ایک گناہ کو یہ سیاہی چھپا دے گی۔ جیسے یہ سیاہی یہ یاد دلاتی رہے گی......اب کل کو اور صرف کل کو یاد رکھو۔

ٹھیک سات بجے کومل اور منیجر لفٹ سے نمودار ہوئے۔ منیجر نے کہا۔

''اچھا بیٹی پھر کل ملاقات ہوگی۔''

''کل.....'' کومل نے شیریں آواز میں کہا ''کل تو شاید ملاقات نہیں ہو سکے گی، کل میں شوالی مندر جا رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، پھر پرسوں ملیں گے۔''

انل نے کار کا دروازہ کھولا اور کار اسٹارٹ کی۔ منیجر نے ہاتھ ہلایا کومل نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔ گاڑی چل پڑی۔

"Blue Bird" کلب چلو۔ سن اینڈ سینڈ ہوٹل کے پاس یہ کلب ہے۔''

''جی بہت اچھا!'' انل نے کہا اور بیوک کو رفتار میں ڈالا۔ شام کی معطر ہوائیں دل و دماغ

کومسحور کر رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے میں بیوک ''بلیو برڈ'' کلب کے سامنے کھڑی تھی۔ انل نے کار کا دروازہ کھولا۔ کومل گاڑی سے باہر آئی۔

''تم انتظار کرو۔''

کومل یہ کہہ کے کلب کے اندر چلی گئی۔

''انتظار۔''

''ہاں انتظار کروں گا۔''

کب تک....!

کب میں ایسی بیوک چلاؤں گا۔ ڈرائیور کی حیثیت سے نہیں، مالک کی حیثیت سے!!

وہ گاڑی میں بیٹھا، اپنے خیالوں میں ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔

رات کے بارہ بجے کا وقت رہا ہوگا جب کومل کلب کے دروازے سے نکلی۔ اس کے چلنے کے انداز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ انل دوڑ کے اس کے پاس پہنچا سوچا کہ کومل کو گرنے سے بچالے لیکن کومل نے کرخت آواز میں کہا۔

''ڈرائیور.... تم صرف ڈرائیور ہو..... یہ بات ہمیشہ یاد رکھو۔''

''جی میم صاحب!!''

اس نے دروازہ کھولا اور کومل سیٹ پر بیٹھ گئی۔ انل اتنا سمجھ گیا کہ کومل نے تھوڑی سی شراب پی لی ہے۔ لیکن اس کی تلخ کلامی شراب کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اس کے غرور کا پتہ دے رہی تھی..... اس نے سوچا کہ کومل نے شراب پی ہو، تھوڑی ہو یا زیادہ...... اس کا نجی معاملہ تھا..... پھر اونچی سوسائٹی میں شراب سے دلچسپی رکھنا گن مانا جاتا ہے۔ خامی نہیں..... لیکن تلخ کلامی کیوں.... وہ سوچتا رہ گیا۔

کوٹھی آ گئی..... کومل کوٹھی کے اندر چلی گئی..... انل نے کار گیراج میں کھڑی کی اور اپنے کمرے میں آ گیا..... وہاں اس کو کھانا رکھا ہوا ملا۔

کھانا کھا کے وہ بستر میں گھس گیا..... بہت تھک گیا تھا۔ لیکن نیند کوسوں دور تھی..... اور پھر اس کا ذہن صبح سے شام تک تمام واقعات دہرانے لگا۔

پہلا واقعہ ٹوپی کا سامنے آ گیا۔ اور پھر نصف رات کو کومل کے پاس دوڑ کے جانے پر شکریہ

کے بدلے ذلالت بھرے جملے......!!

وہ خود سے سوال کرنے لگا۔

''میری عزت کہاں جا کر سو گئی......کہاں جا کر سو گئی۔ کیا بھوک برداشت نہ ہو سکی۔ کیا زندگی کی سختیوں نے مجھے ایک کمترین.... حقیر انسان بنا کے چھوڑ دیا۔''

پھر وہ کچھ پل کھویا رہا.....کچھ سوچتا رہا.....آخر خود سے کہا۔

''اونچ نیچ زندگی کے دو پلڑے ہیں، ان سے کیا گھبرانا۔''

## (۵)

ایک......دو.......دس........بیس......تیس......ساٹھ دن ہو گئے۔ ساٹھ دن کیسے گزر گئے۔ کیوں کر گزرے اور کتنی بار انل نے محسوس کیا کہ وہ خود اپنی نظروں سے گر گیا ہے.....اس کا اندازہ بھی وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ کومل کی زیادتیاں یاد کر کے اس کے لیے ہر پل سوہان روح بن جاتا اور اس لیے اس نے سوچنا چھوڑ دیا.....اور کل، کل ہی دفن کر دیتا.....کل....... پرانا کل.....کل کی بات چھوڑو.....آج.....آج ہمارا ہے......تمہارا ہے......یہی سوچ کے انل کومل کی زیادتیوں کو بھولتا رہا......اس بھول جانے کی عادت میں کسی قدر شمبھو کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ کہتا۔

''بیٹے کتنی بار کہوں کہ کومل بیٹی دل کی بہت اچھی ہے۔ وقت نے اس کے مزاج کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ یوں تو بہت غصہ کرتی ہے، پھر مجھ سے اکثر جھینپ کر کہتی ہے۔

''شمبھو کا کا جانے مجھے کیوں غصہ آتا ہے۔ کیا ہو جاتا ہے مجھے......!!''

''میں اس سے کہتا ہوں.....بیٹی آہستہ آہستہ بے جا غصہ کرنے کی عادت چلی جائے گی۔ اور مجھے یقین بھی ہے کہ ایک بار پھر وہ پہلی والی کومل ہو گی، رحم دل کومل!'' انل بھی بوڑھے شمبھو کی باتوں پر یقین کرنے لگا کہ ایک دن کومل کے مزاج کا چڑچڑا پن اور غصہ چلا جائے گا۔

جب کبھی وہ رحمت بھائی کے پاس جاتا تو وہ کہتا۔

''کیوں خان بیٹے مزے ہو رہے ہیں!''

''رحمت بھائی میم صاحبہ بات بات پر غصہ کرتی ہے اور خواہ مخواہ بگڑ جاتی ہے۔''

''ارے میرے یار، یہ تو امیروں کے چونچلے ہوتے ہیں۔ پہلے دو تین مہینوں کے لیے

ملازم کو ستاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ خود بخود شانت ہو جاتے ہیں۔''

منیجر صاحب بھی جب ملتے تو کہتے۔

''کیسے ہو انل.....؟''

''جی کرپا ہے آپ کی!''

''اچھے جا رہے ہو، ترقی کرو گے۔''

شمبھو، اپنے گاؤں چند دنوں کے لیے چلا گیا تھا....رات کے بارہ بجے کا وقت رہا ہوگا جب کومل اپنے کسی نوجوان خوش پوش دوست کے ساتھ کلب سے نکلی، وہ دونوں قہقہے بھرتے ہوئے بیوک کار کے پاس پہنچ گئے۔ انل نے دروازہ کھولا، کومل نے نوجوان سے کہا۔

''روی تمہاری کار خراب ہوگئی ہے۔ آؤ میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں۔''

روی نے آج کل کے فیشن ایبل نوجوان کے انداز میں کہا۔

''او۔ کے''

کومل نے انل سے کہا۔

''ڈرائیور پہلے پیڈر روڈ چلو''

''جی بہت اچھا'' انل نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا اور گاڑی آگے بڑھائی۔

روی نے کومل سے انگریزی میں کہا۔

"Komal you are looking today dazling."

کومل نے میٹھی آواز میں کہا "Shut up"

انل سنتا رہا....انل Side mirror سے روی کی بہکتی ہوئی حالت کا جائزہ لینے لگا.....روی کومل کے بالوں کو چومنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کومل روی کی اس حرکت سے بے خبر ہے۔ جانے کیوں اس لمحے روی سے انل کو نفرت ہوگئی.....انتہائی نفرت.....اس لیے اس نے اچانک اور بہت زور کے ساتھ بریک لگائی۔

اس عمل سے کومل اور روی اپنی سیٹ سے آگے کی طرف آ پڑے۔ کومل کو کوئی خاص چوٹ محسوس نہ ہوئی لیکن روی کو یوں محسوس ہوا کہ اگلی سیٹ سے سر لگتے ہی پھٹ گیا وہ انل پر چیخ پڑا۔

"You bloody fool. Son of a bitch. You wanted to kill us."

انل نے کہا۔

''دیکھئے صاحب انگریزی زیادہ مت جھاڑیے۔ سامنے آدمی آرہا تھا اس لیے بریک پر پاؤں رکھنا ضروری تھا۔

اس نے پھر خاموشی سے گاڑی چلائی۔ اس تمام وقفے میں کومل نے چپ سادھ لی۔ روی نہ جانے کیوں خاموش ہوگیا، شاید اس کا سر چکرا رہا تھا۔

پیڈر روڈ کے بتائے ہوئے بنگلے کے سامنے گاڑی رک گئی۔

روی نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

''کومل مجھے امید نہیں تھی کہ تم ایسے گنوار، اجڈ آدمی کو پالتی ہو۔'' پھر روی انگریزی میں بولا۔

"I love you Komal but that does not mean a bastard will insult me."

انل نے اب سخت مگر نرم آواز میں کہا۔

''دیکھئے صاحب آپ اب بھی انگریزی میں میری ماں اور میرے خاندان کو گالیاں دے رہے ہیں۔ لیکن اگر میں آپ سے کہوں کہ۔

"You are son of an ass."

تو آپ کو کیسا لگے گا؟''

روی نے مکا دکھاتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے گدھے کا بچہ کہا..... میں...... میں.....'' وہ اپنی تمام انگریزی بھول گیا۔ انل نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جا جا...... بچے..... اپنے نرم بستر میں سو جا۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ روی چیختا رہا۔

''کومل میری بے عزتی تمہاری وجہ سے ہوئی۔ تمہاری وجہ سے ہوئی۔''

کومل نے سارے وقفے کے دوران کچھ نہیں کہا۔ لیکن انل جانتا تھا کہ کومل کی یہ خاموشی معنی خیز ہے اور اب کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔ اس نے سوچ لیا کہ آج وہ ہر ہنگامے کا مقابلے کرے گا۔

کوٹھی کے سامنے گاڑی رگ گئی۔

کومل نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

''ڈرائیور تم اندر آنا۔''

''بہت اچھا میم صاب۔''

اس نے گاڑی گیراج میں رکھی۔اور کوٹھی میں کومل کی بوچھاڑ کے لیے داخل ہوا۔اس نے دیکھا کہ کومل بڑی بے چینی کی حالت میں ڈرائنگ روم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تیز تیز قدم سے فاصلے طے کر رہی تھی پھر اس پر نظر پڑتے ہی کہا۔

''ڈرائیور......آ......تمہارا نام انل ہے؟''

''جی میم صاحب۔''

''تم پڑھے لکھے ہو؟''

وہ کومل کے اس انوکھے سوال پر حیران ہوا۔وہ تو کسی ہنگامے کی توقع رکھتا تھا۔لیکن یہاں تو کچھ اور ہی سوالات کیے جا رہے تھے۔

''جی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن یہ تم نے پہلے نہیں بتایا۔''

''پوچھا نہیں گیا۔''

''ٹھیک ہے......ٹھیک ہے۔'' کومل نے آگے کہا ''تم پڑھے لکھے ہو، لیکن ہو تو میرے معمولی ڈرائیور، میرے ٹکڑوں پر پلنے والے معمولی ملازم۔پھر تم میں جرأت کہاں سے آئی کہ تم نے میرے معزز دوست کی بے عزتی کی۔ایک حقیر ملازم ہو کے میرے سامنے تم میں بولنے کی ہمت کہاں سے آئی۔''

پہلی بار......پہلی بار ڈھائی ماہ کے بعد......اس کی عزت نے جوش مارا۔اس کے سوئے جذبات جاگ اٹھے۔وہ کومل کی غضب ناک آواز کے سامنے بالکل ایک شیر کی طرح گرج پڑا۔

''دیکھئے میم صاحب! نوکری میں ضرور آپ کی کرتا ہوں، اس کے لیے مجھے محنتانہ ملتا ہے۔میں آپ کے حقیر ٹکڑوں پر نہیں پل رہا ہوں۔اپنے بازوؤں سے کماتا ہوں، وہی کھاتا ہوں۔معمولی ملازم تو ضرور ہوں میں آپ کا، لیکن حقیر نہیں۔اس لیے آپ کو ایسے الفاظ کہنے کا کوئی حق نہیں۔''

کومل مبہوت ہو کے کھڑی رہ گئی......آج تک کسی کو اس کے سامنے ایسے کھرے جواب

دینے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ حیرت سے وہ تکتی رہ گئی.... اور پھر لاوا سا پھٹ پڑا۔ وہ چیخ پڑی۔

''نکل جا..... میرے گھر سے نکل جا..... اس کوٹھی سے نکل جا..... میں تجھے نوکری سے نکال رہی ہوں۔''

انل نے بڑی دھیمی اور نرم آواز میں کہا۔

''آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوئی کہ آج کے واقعہ کے بعد میں آپ کی نوکری کروں گا۔ میں تو یہ بات کہنے والا تھا کہ میں آپ کی نوکری چھوڑ کے جا رہا ہوں......'' پھر میز پر گاڑی کی چابی رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ رہی گاڑی کی چابی..... میں کوارٹر سے اپنے کپڑے لینے جا رہا ہوں۔ میں آپ سے اپنی پندرہ دن کی تنخواہ نہیں مانگوں گا کیونکہ میں خود نوکری چھوڑ کے جا رہا ہوں۔''

یہ کہتے ہی وہ تیز تیز اور لمبے لمبے قدم ناپتے ہوئے کوٹھی سے باہر آیا۔ آج...... آج..... کیوں سب خلاف توقع ہوا۔ آج..... آج.... کیوں میرا نوکر میرے منہ پر دوٹوک جواب دے گیا۔ یہ سب روی کی وجہ سے ہوا ہے روی کی وجہ سے..... میرے سامنے کسی کی ہمت بولنے کی نہیں ہوئی..... روی آج سے تم بھی میرے دوست نہیں رہے..... انل جیسے ایک معمولی ڈرائیور کی اتنی ہمت..... لیکن وہ جہاں کہیں جائے گا، میں اسے برباد کر کے چھوڑوں گی۔''

یہ سب کچھ وہ سوچتی رہی اور پھر چیخ پڑی۔

"I will ruin him!!!"

اس کی چیخ بادل کی گرج میں ڈوب گئی۔ انل نے اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے ہوئے آسمان پر نظر ڈالی...... بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں منہ پر آ کے گریں..... وہ کوٹھی سے باہر آ گیا..... ڈھائی مہینوں میں پہلی بار اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ جیل میں اڑھائی مہینے رہنے کے بعد رہا ہوا ہو۔

## (۶)

رحمت بھائی جب صبح دوکان کھولنے آیا تو دکان کے بائیں طرف انل کو سوتا ہوا پایا.... پہلے تو وہ حیران ہوا کہ آخر صبح ہی صبح یہ کیسے آیا ہے۔ پھر سر کے نیچے سوٹ کیس دیکھتے ہی وہ حالات سمجھ گیا۔ وہ پہلے کچھ سوچتا رہا اور پھر انل کا کندھا ہلایا۔

''یار.....یار.....کیا ہوا.....؟''

انل نے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے اور ایک جماہی لی۔

رحمت بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جو معاملہ اپن نے فٹ بٹھایا تھا وہ خلاص ہو گیا.....خیر، میرے یار تم فکر مت کرو۔ اپن کوئی اور بندوبست کریں گے۔''

انل نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''رحمت بھائی میں اب نوکری کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اس لیے سوچتا ہوں کہ کوئی معمولی سا لیکن اپنا دھندہ شروع کروں۔''

''ایسی بات ہے، یعنی میرے بیٹے خان کے حوصلے بلند ہیں۔'' رحمت بھائی نے کہا ''خیر سوچتے ہیں تم کون کام شروع کرتے ہو۔ فی الحال ایک ایک گلابی چائے کا گلاس ہو جائے۔''

رحمت بھائی نے دکان کھولی اور شیریں فرہاد ریسٹورنٹ کے چھوکرے سے کہا۔

''ابے.....او چھوکرے۔ دو گلابی چائے کے گلاس لا۔''

انل نے رحمت بھائی سے کہا۔

''رحمت بھائی، مجھے افسوس ہے کہ جہاں پر تم نے نوکری دلائی، میں کہے بنا چھوڑ کے آیا ہوں۔''

''دیکھو انل.....دوستی میں کبھی افسوس والی بات استعمال نہیں کرو، جس دن افسوس بیچ میں آ گیا سمجھو دوستی کا وزن گھٹ گیا۔''

انل نے رحمت بھائی کو ڈھائی مہینے میں گزرنے والے تمام واقعات سنائے۔ رحمت بھائی نے کہا۔

''انل تم نے نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ بہت اچھا فیصلہ کیا.....''

گلابی چائے کے دو گلاس آ گئے۔ دونوں چائے پینے لگے۔ دونوں کی چائے کا آدھا گلاس ختم ہوا تھا کہ رحمت نے کہا۔

''آ گیا.....آ گیا.....!''

''کیا آ گیا.....؟''

''آئیڈیا..... آ گیا..... انل تمہیں یاد ہے وہ گلی کے نکڑ پر ایک گاؤں کا آدمی ریڑھے پر نیوز پیپر، اور کتابیں بیچا کرتا تھا۔''

''ہاں.... ہاں اس کو کیا ہوا؟''

''وہ گاؤں چلا گیا، اب واپس نہیں آئے گا۔''

''بے چارہ.....!'' انل نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔

''لیکن وہاں ریڑھے پر کوئی تو کتابیں بیچتا رہے گا۔ اور اب کی بار جو آدمی کتابیں فروخت کرے گا وہ تو ہوگا۔''

''ارے اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا....'' انل نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''میں یہ کام کر سکتا ہوں۔''

''بیٹے خان، اب بولو آئیڈیا کیسا ہے!''

''فرسٹ کلاس..... تنخواہ کے پیسے تو موجود ہیں اس لیے تھوڑی بہت کتابیں خرید کے لا سکتے ہیں۔ لیکن رہنے کے لیے جگہ چاہیے اور وہ بھی سستے داموں میں۔''

''ارے ہاں، اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں۔''

پھر رحمت بھائی نے چونکنے والی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن، اس کے بارے میں کیا سوچنا..... اپنی دکان میں سو جانا۔ آخر یار کے کام یہ دکان نہ آئے تو لعنت ہو اس دکان پر!''

انل کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''رحمت بھائی تم میرے لیے کیا کیا کر رہے ہو۔ آج کل دوستی بھی فائدے کے لیے کی جاتی ہے۔''

''یار اپن..... وہ اونچے سوسائٹی کی بات ہوگی...... تو اپنا یار بیٹے خان ہے۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا...... اور جس دن میں یہ سمجھوں گا کہ میں نے تمہارے لیے کچھ کیا۔ سمجھو..... اس دن میں نے اپنے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔''

رحمت بھائی کی راہبری میں انل نے گلی کے نکڑ پر ریڑھے پر ایک معمولی سی کتابوں، میگزین اور نیوز پیپر فروخت کرنے کی دکان کھولی۔

پہلے دو دن معمولی سیل Sale رہی۔ لیکن پھر دکان چل نکلی۔ پندرہ، بیس دن کے بعد کا واقعہ ہے، گلی کے دادا نے انل سے کہا۔

''کیوں بے.... چھوکرے یہ ریڑھے کی دکان تم نے کس کی اجازت سے لگائی...؟''

''یہاں پہلے بھی ریڑھے کی دکان تھی۔''

''تھی..... لیکن تمہاری نہیں تھی۔''

''لیکن اب تو ہے۔''

دادا کے ساتھ چار پانچ چمچے تھے۔ ان میں سے ایک چمچے نے کہا۔

''دادا سے زبان لڑاتا ہے، سر کاٹ کے رکھ دیں'' انل بھی خاموش نہ رہ سکا۔

''اب یہاں دکان لگ گئی ہے، اور کسی کی مجال نہیں جو اس دکان پر اعتراض کرے۔''

''ہم کریں گے..... اپن..... اس گلی کا دادا کرے گا.....'' وہ اپنے ساتھیوں پر چیخ پڑا۔

''الو کے پٹھو..... تم کیا تماشا دیکھتے ہو، کتابوں کو جلا کر راکھ کر دو۔''

وہ فوراً انل سے بھڑ گئے...... وہ پانچ تھے، اور انل ایک۔ کتابوں کو آگ لگا دی گئی..... انل کی ساری پونجی شعلوں کے حوالے کر دی گئی۔ اور انل بے بسی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ شور سن کر رحمت بھائی اور اس کے ساتھی آ گئے۔ وہ دادا اور دادا کے آدمیوں سے الجھ گئے۔ رحمت نے دادا کو پیٹتے ہوئے کہا۔

''رحمت کے ہوتے ہوئے تم نے انل کی طرف دیکھنے کی جرأت کیسے کی..... بول سالے..... کیسے کی..... بول سالے کیسے کی....؟''

''رحمت بھائی.....'' دادا نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا ''ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ کوئی سوٹ بوٹ والا آدمی آیا۔ اس نے انل کی کتابوں کی دکان تباہ کرنے کے لیے ہم کو سو سو کے چار نوٹ دیئے۔''

رحمت بھائی نے دادا کو چھوڑتے ہوئے کہا۔

''آئندہ کبھی کوئی حرکت کی تو سمجھو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''نہیں رحمت بھائی..... رحمت بھائی، ایسا اب کبھی نہ ہوگا۔'' دادا نے اپنے ساتھیوں کو وہاں سے کھسک جانے کے لیے کہا۔

انل کی ساری پونجی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"انل.....انل.....آخر تمہارے ساتھ یہ دشمنی کون کر رہا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"مجھے بتاؤ، میں اس سالے کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"میم صاحب!"

"میم صاحب.....؟ نہیں.....میم صاحب۔" رحمت بھائی نے کہا "ہاں ہو سکتا ہے۔" "میں ابھی منیجر سالے کے پاس جاتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں اس سے، ممبئی میں کیا صرف امیر لوگ رہ سکتے ہیں، غریبوں کو اس شہر میں رہنے کا کیا کوئی حق نہیں ہے؟"

رحمت بھائی نے مین سڑک پر جاتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے کیا سمجھتے ہیں یہ امیر لوگ اپنے آپ کو!"

انل نے کہنا چاہا!

"رحمت بھائی اب وہاں جانے کا، کوئی فائدہ نہیں"، لیکن رحمت بھائی چلا گیا تھا۔

(۷)

رحمت بھائی آندھی طوفان کی طرح دفتر میں داخل ہوا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ چپراسی نے اسے روکنا چاہا.....اس نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ اور منیجر کے کیبن میں داخل ہو گیا۔ منیجر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"منیجر صاحب!"

منیجر فائلوں کے مطالعہ میں محو تھا۔ رحمت کی آواز کے ساتھ ہی سر اٹھایا۔

"کیوں رحمت کیا بات ہے؟ کار کی مرمت کے پیسے ابھی تک نہیں ملے ہیں کیا؟" منیجر نے دھیمی آواز میں کہا۔

"دیکھو منیجر.....! اپن نے اپنے دوست انل کو آپ کے یہاں نوکری کرنے کو کہا۔" رحمت بھائی نے نرم لہجے میں کہا۔

"لیکن تمہارے یہاں آدمی نہیں چاہیے، جانور چاہیے۔ الو کا پٹھا چاہیے۔ انل بی اے

پاس ہے، اپن اسے مجبور کیا، ڈرائیوری کرنے کے لیے لیکن منیجر!''

رحمت بھائی کی آواز میں تیزی کے ساتھ ساتھ جوش بھی آ گیا۔

''تمہاری مالکن نے اس کے ساتھ حیوانوں کا سلوک کیا۔ وہ خاموشی سے نوکری چھوڑ کر آ گیا۔ پندرہ دنوں کی تنخواہ بھی آپ لوگوں کی جھولی میں ڈال کے آیا۔ لیکن تمہاری مالکن، اس کی ترقی کو نہ دیکھ سکی۔ اس کی چھوٹی سی دکان پر غنڈے بھجوا کر تمام کتابوں کو آگ لگوا دی..... منیجر.....!''

منیجر گھبراہٹ میں کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''لیکن رحمت کومل بیٹی نے ایسا نہیں کیا ہو گا!''

''اس نے ایسا کیا ہے، اس کے غنڈوں سے جب پٹائی برداشت نہ ہو سکی تب انہوں نے راز کھول دیا۔''

''اگر ایسا ہے رحمت تو میں اپنی طرف سے اس ظلم اور زیادتی کے لیے معافی مانگتا ہوں.... میں مالکن سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرتا ہوں اور اگر واقعی اس بات میں حقیقت ہو گی تو میں تم کو یقین دلاتا ہوں، تب میں سارے نقصان کی رقم ادا کرواؤں گا۔ اگر وہ رقم مالکن دینے کے لیے تیار نہ ہوئی تو میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔''

رحمت بھائی نے منیجر سے کہا۔

''منیجر صاحب! آپ میں ایک خوبی ہے، آپ ہر بات کو ٹھنڈے دماغ سے سوچتے ہیں، اور سنتے ہیں۔ اس لیے گرم دماغ والا بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ خیر منیجر صاحب، آپ جو مناسب سمجھیں۔ کیوں کہ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کسی کی حق تلفی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔''

رحمت بھائی یہ کہتے ہوئے منیجر کے کیبن سے باہر آیا۔ رحمت کے جانے کے بعد منیجر اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا بڑبڑایا۔

''جانے کومل کو کیا ہوا.... آخر انل کے ساتھ اس قسم کی زیادتی کیوں؟''

کومل آفس نہیں آتی تھی، اس لیے منیجر نے گھر فون کیا۔ فون پر شمبھو بولا کہ ''کومل کلب چلی گئی ہے۔ کہ آج کلب کا سلور جوبلی فنکشن تھا۔''

منیجر دوسرے دن صبح ہی صبح کوٹھی پر پہنچ گیا.... شمبھو میز پر ناشتہ لگا رہا تھا۔ منیجر نے شمبھو سے کہا۔

''مالکن نیند سے اٹھی؟''

''بابو جی....ابھی چائے پینے کے لیے آ رہی ہے۔''

کچھ وقفے کے بعد کومل نیچے آ گئی....اور منیجر کو دیکھتے ہی کہہ پڑی۔

''ارے منیجر صاحب، آج صبح صبح کیسے آ گئے۔''

''بیٹی کچھ ضروری کام آن پڑا۔''

''آفس میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے؟''

''آفس میں کل رحمت بھائی آیا تھا۔''

''کون رحمت؟'' کومل نے پوچھا۔

''وہی جو ہمارا موٹر میکینک ہے، جس کے توسط سے انل یہاں آیا تھا۔''

''کون انل؟'' کومل نے پھر سوال کیا۔

یہ کون کون کی رٹ منیجر کو کچھ عجیب سی لگی۔ وہ بولا۔

''ڈرائیور۔''

''وہ بیہودہ! جو نہایت ہی بد دماغ اور بد اخلاق ہے، آپ نے رحمت سے نہیں کہا کہ ایسے آدمی کو ہمارے پاس کیوں بھیج دیا......کیا آپ نے اس سے نہیں کہا کہ ایسے آدمی سے رابطہ نہ رکھیں، ورنہ ہماری گاڑی کا کام نہیں لے گا۔''

منیجر دھیمی آواز میں بولا۔

''بیٹی، رحمت کہتا تھا کہ کل انل کے بک اسٹال کی کتابوں کو غنڈوں نے آگ لگا دی.....اور وہ غنڈے اس حرکت کا اشارہ بیٹی آپ کی طرف کر رہے تھے.....''

شمبھو نے اسی دوران آ کر کہا۔

''بیٹی اور گرم چائے لاؤں....''

''شمبھو کتنی بار کہا ہے کہ جب میں کسی سے بات کر رہی ہوں تو بیچ میں ٹوکا نہیں کرتے۔'' کومل نے تیز آواز میں کہا۔ شمبھو ہکا بکا رہ گیا۔ کبھی وہ خود آپ کو اور کبھی کومل کو دیکھتا۔ وہ شمبھو کا کاسے اب شمبھو ہی رہ گیا.....منیجر بھی حیرت زدہ رہ تھا۔ شمبھو چلا گیا۔

اب کومل نے منیجر سے کہا۔

''ہاں میں نے اس کی تمام کتابوں میں آگ لگوا دی ہے۔ میرے ساتھ بدتمیزی اور بداخلاقی کرنے کے لیے اس کو میرے ہاتھوں سے شدید اذیت ملے گی۔''

''لیکن یہ ظلم ہے، زیادتی ہے۔'' منیجر کرسی سے کھڑا ہوا۔

''اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ غلطی کو سدھارنا ہوگا۔''

''منیجر صاحب، آپ اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے لگے ہیں۔ میرے کسی بھی عمل کو غلط کہنے کے اختیارات آپ کو نہیں دیے گئے ہیں۔''

منیجر کومل کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ اسے تب سے جانتا تھا جب صرف دو سال کی تھی۔ بیس سال سے اس ادارے کو جانتا تھا جہاں اس نے اپنے خون سے ہر شعبہ کو سینچا۔ وہ کومل کے باپ کو جانتا تھا جو منیجر کے ہر مشورے پر عمل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ اور کومل کی تربیت میں منیجر کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن کومل کی تربیت کیوں غلط ہوگئی ہے؟ کیوں؟

منیجر نے پھر اعتماد بھری آواز میں کہا۔

''لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ غلط آخر غلط ہے۔''

کومل تھوڑی دیر تک خاموش رہی، پھر کرخت آواز میں بولی۔

''منیجر صاحب، جہاں مالک اور نوکر کے خیالات میں تضاد ہو، وہاں نوکر کو اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دینا چاہیے۔''

منیجر کے لیے کومل کے یہ جملے بم سے زیادہ سخت تھے۔ چابک کا وار اس کا بوڑھا جسم برداشت کرسکتا تھا لیکن کومل کے یہ جملے!!

اس کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔

''کومل بیٹی، استعفیٰ تم کو ملے گا لیکن غلط پھر بھی غلط ہے اور ہم نے غلط بات کا ہمیشہ غلط نتیجہ دیکھا ہے۔''

یہ جملہ کہتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ کومل کو یہ گمان نہ تھا کہ منیجر اتنی جلدی، اتنا سخت فیصلہ کرلے گا..... کومل نے یہ جملے اس احساس کے ساتھ کہے تھے کہ منیجر کو اپنی حقیقت معلوم ہوجائے۔

کومل سوچتی رہی۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے..... شمبھو کے ساتھ میں نے یہ بدسلوکی کیوں کی؟

منیجر نوکری چھوڑ کر کیوں جا رہا ہے؟

میرے غصے نے کیوں شدت اختیار کی؟

صرف ایک کے لیے؟ کیوں.....؟ انل کے لیے کیوں.....؟ ایک معمولی نوکر کے لیے کیوں؟

آخر وہ بدبخت میرے پاس نوکری کرنے کے لیے کیوں آیا.....؟ کیوں آیا.....؟

وہ سوچتی رہ گئی.....!!

## (8)

کتابیں راکھ ہو گئیں۔

عمل سارا مٹی میں مل گیا.....!!

آسمان تک اڑنے کا شوق تھا.....!!!

سب کچھ ختم ہو کے رہ گیا......

جدوجہد کا جذبہ سلب ہو کے رہ گیا۔

بس اب تو فرار چاہیے......زندگی سے فرار چاہیے......عمل سے فرار چاہیے۔

انل یہی سوچتے ہوئے چوپاٹی پر پہنچ گیا.....نرم نرم ریت اس کے پاؤں کو چھوتے ہوئے چلی گئی.......سمندر کی موجیں، اوپر اٹھنے کی کوشش میں سمندر کے ساتھ مل جاتی تھیں۔ لیکن وہ دوبارہ کوشش کرتی تھیں......پھر کوشش کرتی تھیں۔ تھک نہیں جاتی تھیں۔

موجوں کے اس کھیل سے انل متاثر ہوا۔ وہ سوچنے لگا۔

"مجھے ایک بار پھر کوشش کرنی ہوگی۔ اڑان کی ہمت کے ساتھ۔ جذبے کے ساتھ!"

"کومل نے میری غیرت کو ذلیل اور رسوا کرنا چاہا۔ میں نے مقابلہ کیا اب وہ میری زندگی میں کانٹے بکھیر رہی ہے، مجھے اس کا بھی مقابلہ کرنا ہوگا۔ وقت کو اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ اور کومل سے اپنی ہر زیادتی کا حساب لینا ہوگا لیکن وہ وقت کب آئے گا۔"

وہ سوچتا رہا.....اور آفتاب غروب ہونے لگا۔

کالا سایہ اس کی طرف دوڑتا ہوا آرہا تھا...... ہر منحوس وقت پر یہ اپنا چہرہ دکھاتا رہا.....آج وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟

کالا سایہ اس کے سامنے آکے رکا۔

''چلو، میرے ساتھ چلو......''

''کیوں، آخر کیوں.....؟''

''وہ دیکھو سڑک پر بیوک کار کھڑی ہے.....اس میں بیٹھا ہوا آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے.....'' سایہ نے کہا۔

انل نے سوچا کہ بیوک کار والے سے معلوم کریں کہ آخر اس سے کیا چاہیے شاید مجھے نوکر رکھنا چاہتا ہو۔ وہ اس کے ساتھ بیوک کار کے پاس پہنچا۔

کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بوڑھے لیکن شاندار آدمی نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور انل سے کہا۔

''بیٹھو.....!''

انل نے دیکھا گاڑی میں بیٹھا ہوا آدمی اور کوئی نہیں.....اس کا دادا ہے۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گیا.....کالا سایہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا.....آفتاب غروب ہو چکا تھا۔

## (9)

دو دن سے انل لاپتہ تھا۔ رحمت بھائی نے ریلوے اسٹیشن کے کئی چکر لگائے۔ ادھر ادھر آدمی دوڑائے۔ لیکن......اس کا کوئی پتہ نہ تھا.....وہ فکر مند ہو گیا.....منیجر صاحب رحمت بھائی کی دکان پر آئے اور کہا۔

''رحمت بھائی، مالکن نے تمہارے دوست کے ساتھ کی گئی زیادتی کا اعتراف کیا۔ اسے افسوس بھی ہوا ہے کہ غصہ میں آکر یہ حرکت کی، اس نے ایک ہزار روپئے میرے ہاتھ بھجوادیے ہیں......''

وہ سب جھوٹ تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی نوکری چھوڑ چکا تھا۔ اور جو ایک ہزار روپئے اس نے رحمت بھائی کو دیئے، وہ اس کے اپنے تھے......

''منیجر صاحب، انل اس دن سے نہیں چلا گیا ہے اور آج تک واپس نہیں آیا۔ میں بہت پریشان ہوں.....انل آئے گا تو اپنی امانت خود آپ کے ہاتھوں سے لے گا۔''

منیجر نے کہا۔

''رحمت! گھبراؤ مت۔ انل ضرور آئے گا.....اور انل جب آئے گا تو تم دونوں اکٹھے میرے گھر کلابہ، مکان نمبر۴، واسو محل فلیٹ نمبر ۱۰ میں آجانا۔''

''اچھا منیجر صاحب، ہم ضرور آئیں گے.....'' رحمت بھائی نے منیجر سے کہا اور منیجر کو گاڑی تک چھوڑنے آیا.....لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اب انل واپس نہیں آئے گا اور یہ سوچ کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا کہ انل نے کہیں خودکشی نہ کر لی ہو۔''

لیکن پندرہ دن کے بعد جب رحمت بھائی اپنی دکان کھول رہا تھا، تو ڈاکیہ نے اس کو خط دیا۔ اس نے پاس والے ''شیریں فرہاد'' ریسٹورنٹ کے مالک سے خط پڑھوایا۔ انل نے لکھا تھا۔

''میرے پیارے دوست!

نمسکار!

میں آج کل دہلی میں ہوں اور خیریت سے ہوں.....حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ میں تم سے نہ مل سکا۔ آج کل میں کام میں مصروف رہتا ہوں فرصت ملتے ہی تم سے ملاقات کرنے آجاؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے بھولے نہیں ہو گے، میں تمہیں ہر وقت یاد کرتا رہتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا جلد ملاقات ہو گی۔

تمہارا دوست

انل

رحمت بھائی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یعنی اپن سالا کا دوست زندہ ہے۔ اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مر گیا ہو گا۔''

پھر وہ چائے والے چھوکرے پر چیخ پڑا۔

''ابے او چھوکرے، دو گلابی چائے کے گلاس لا، ایک اپنے مالک کے لیے، ایک میرے لیے۔ اپن آج تیرے مالک کو چائے پلائے گا.....صبح صبح ہی اچھی خبر سنا دی۔

## (10)

واسومحل کلابہ کے سامنے بیوک کار رک گئی.... کار میں سے شاندار سوٹ پہنے ہوئے ایک جوان آدمی نکلا۔ لفٹ میں چڑھا اور لفٹ مین سے کہا۔

''دس نمبر فلیٹ۔''

فلیٹ کے سامنے لفٹ رک گئی۔ نوجوان نے Call bell دبائی۔ دروازہ کھل گیا، بارہ سال کے لڑکے نے پوچھا۔

''آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''کومل کیمیکل انڈسٹری کے منیجر سادھورام جی یہیں رہتے ہیں؟''

''سادھورام جی تو یہیں رہتے ہیں، لیکن اب وہ کومل کیمیکل انڈسٹری کے منیجر نہیں ہیں۔'' لڑکا بولا۔

''مجھے معلوم ہے لیکن میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''آیئے، اندر آیئے.....'' لڑکے نے نوجوان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا۔ اسی اثناء میں سادھورام بھی آ گئے۔ لڑکے نے کہا۔

''پتا جی، یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''نمستے...... ''میرا نام دنیش ٹھاکر ہے۔ میں ہرنام انٹر پرائزز کا نمائندہ خصوصی ہوں۔''

''ہرنام انٹر پرائزز..... کہیں یہ نام سنا ہے.....'' سادھورام نے کہا۔

''سنا نہیں ہوگا، کسی اخبار میں پڑھا ہوگا.....'' دنیش ٹھاکر نے کہا۔

''ہمارا کاروبار کلکتہ، دہلی، بنگلور اور ایک چھوٹا سا آفس ممبئی میں بھی ہے۔ لیکن اس بار میں ممبئی کچھ جامع اسکیمیں ساتھ لایا ہوں۔ ہم نے فی الحال ممبئی کے لیے تین کروڑ Invest کرنے کا Target مقرر کر رکھا ہے، ان تین کروڑ میں ایک تو کیمیکل انڈسٹری کھولی جائے گی، جس کے لیے زمین خریدی گئی اور اس کے لیے پلانٹ بھی آ چکا ہے۔ چند دنوں میں اس کے کیمیکلز مارکیٹ میں آنے شروع ہو جائیں.....ایک جدید ترین فلمی اسٹوڈیو بھی بنایا جائے گا۔ اس میں جدید ترین سہولتیں رکھی جائیں گی۔ یہ اسٹوڈیو فلمیں بنانے کا کام انجام دے گا۔ پہلے تو چھوٹی بجٹ کی فلمیں اور ڈاکو

منٹری فلمیں تجربے کے لیے بنائی جائیں گی۔اس کے علاوہ ایک موٹر گیراج کھولا جائے گا۔اس میں جدید قسم کا پلانٹ لگایا جائے گا۔تاکہ کسی بھی گاڑی کا کوئی بھی مرمت کا کام کیا جائے۔''

گفتگو کے دوران چائے بھی آگئی تھی۔سادھورام نے کہا۔

''چائے لیجیے مسٹر دنیش.....آپ کی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ میں مہمان نوازی کے فرائض بھی بھول گیا۔''

''سادھورام جی،مہمان نوازی کے حق کو ادا کرنے کے لیے اور کچھ کرنا ہوگا۔''

''میں سمجھا نہیں مسٹر دنیش.....''

''ہمارے انٹر پرائزز کے چیئر مین نے آپ جیسے تجربہ کار آدمی کو کیمیکلز انڈسٹری کا انچارج مقرر کیا ہے۔اور مجھے یہ کام سونپا گیا ہے کہ آپ کو چارج سونپ دوں۔'' دنیش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سادھورام نے کہا۔

''لیکن میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں....آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن ہمارے چیئر مین کے فیصلے غلط نہیں ہوا کرتے۔کیمیکلز انڈسٹری کے لیے انہیں آپ سے زیادہ کوئی دوسرا مناسب آدمی نظر نہیں آیا۔انہوں نے آپ کی تنخواہ تین ہزار مقرر کی ہے۔''

دنیش کا یہ آخری جملہ سادھورام کے لیے بہت اہم تھا،کیونکہ تیس سال تک کومل انڈسٹری میں کام کرتا رہا۔لیکن وہ بارہ سو روپئے سے زیادہ تنخواہ نہیں لے سکا۔

''مسٹر دنیش آپ نے مجھے انچارج بنا ہی لیا۔''

''ویری گڈ.....آپ کے فیصلے کو سن کر چیئر مین بہت خوش ہوں گے،اس نوکری کے ساتھ صرف چند شرائط چیئر مین نے رکھی ہیں.....ایک تو آپ کو کیمیکل انڈسٹری کے ساتھ رہنے کے لیے کوارٹر ملے گا اس لیے آپ اپنی تمام Family لے کر انڈسٹری کے کوارٹر میں منتقل ہو جائیں گے۔''

دوسری یہ کہ آپ دس سال کے لیے کیمیکل انڈسٹری کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ وابستہ رہیں گے.....مجھے امید ہے کہ ان دونوں شرائط پر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

سادھورام نے سوچا کہ تین ہزار بہت بڑی رقم ہوتی ہے اور اس رقم کے سامنے کسی بھی شرائط نامے پر دستخط کیے جا سکتے ہیں۔

''مجھے منظور ہے.....''

''ویری گڈ.....''مسٹر دنیش نے کھڑے ہوئے ہوئے کہا۔

''سادھورام جی، آپ نے صحیح اور بروقت فیصلہ کر کے چیئر مین کے اعتماد کو حوصلہ دیا۔ آپ کل اپنا چارج سنبھال لیں گے.....''

دنیش نے اٹیچی کھول کر تین ہزار روپئے نکال لیے اور کہا۔

''لیجیے پہلے مہینہ کا ایڈوانس اور مجھے اجازت دیجیے.....کل ملاقات ہوگی۔''

سادھو رام نے دنیش سے ہاتھ ملایا..... دنیش لفٹ سے نیچے آیا، اپنی بیوک کار میں بیٹھا.....اپنی پہلی کامیابی پر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی.... بیوک ناگ پاڑا سے ہوتے ہوئے تاج پلے ٹاکیز کی بغل والی گلی میں گھس کر رحمت بھائی موٹر میکینک کی دکان کے سامنے رک گئی.....دنیش کار سے اتر کر دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا اس نے رحمت بھائی سے کہا۔

''رحمت بھائی.....!!''

''ہاں صاحب کہو.....گاڑی میں کوئی خرابی ہے.....؟''

''میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں.....!''

''کرلو صاحب۔''

''میں دہلی سے آیا ہوں.....انل صاحب نے تمہارا پتہ دیا ہے۔''

''انل.....اپن کے یار نے.....!!''رحمت بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا.....''کیسا ہے وہ؟''

''اچھا ہے۔''

''ارے خان بیٹے نے لکھا تھا کہ پندرہ بیس دن میں وہ ممبئی آنے والا ہے.....لیکن دو مہینے ہونے کو آئے ہیں، ابھی تک وہ نہیں آیا۔ کیا بات ہے؟''

''وہ آج کل کام میں مصروف رہتے ہیں۔''

''ارے کام.....یعنی کام مل گیا اسے.....یہ اچھی خبر سنائی تم نے.....!''

اپنے چھوکرے مستری سے رحمت بھائی نے کہا۔

''ابے چھوکرے، دو گلابی چائے کے گلاس لا۔ اپنا یار کام میں لگ گیا ہے۔''........''اچھا

صاحب، اب آپ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟"

"اصل میں انل صاحب نے مجھے اس لیے تمہارا پتہ دیا تھا کہ ہم بہت بڑا موٹر گیراج کھولنا چاہتے ہیں..... یہ موٹر گیراج ممبئی میں سب سے بڑا موٹر گیراج ہوگا...... ہمیں ایک قابل میکینک چاہیے جو موٹر گیراج کا انچارج ہو۔ انل صاحب سے معلوم ہوا کہ تم بہت قابل میکینک ہو!"

"وہ تو ہوں.... لیکن صاحب! اپنا دھندہ پھر بھی اپنا دھندہ ہے۔" رحمت نے کہا۔

اسی اثنا میں چائے کے دو گلاس آئے۔ اس نے دنیش کے سامنے ایک رکھا۔ اور دوسرے سے خود چائے کی چسکیاں لینی شروع کیں۔ دنیش نے کہا۔

"لیکن رحمت بھائی ہمارا چیئر مین تمہیں ملازم نہیں بنانا چاہتا۔ بیس فی صدی کا حصہ دار..... پیسہ کمپنی کا ہوگا اور کام تمہارا ہوگا۔"

رحمت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"کیوں اپن سالا کے ساتھ مذاق کرتا ہے سیٹھ!"

"میں مذاق نہیں کر رہا رحمت بھائی۔" دنیش نے سنجیدہ آواز میں کہا "گیراج بن گیا ہے! اس میں نئی قسم کی مشینری آئی ہے، اب وہاں تمہارے آنے کی دیر ہے۔"

"لیکن یہ سب تو اپن کو الف لیلہ کا قصہ لگتا ہے۔ ارے اپن دوسری دنیا میں تو نہیں چلا گیا چھوکرے۔" "سیٹھ اپن آپ کے گیرج کا کام ساجھے داری میں سنبھال لے گا۔"

"بہت بہت شکریہ رحمت بھائی۔ میرا نام سیٹھ نہیں ہے دنیش ہے! تم صرف دنیش کہہ سکتے ہو۔ تمہیں آج ہی میرے ساتھ چلنا ہوگا اور وہاں کام سنبھالنا ہوگا۔ کل سے یہ دکان بند..... اور وہاں کا کام چالو۔"

"چلو، دنیش صاحب آپ کے ساتھ ابھی چلتے ہیں۔" رحمت نے کھڑے ہوتے ہوئے چھوکرے سے کہا "اے او چھوکرے ذرا لفافہ لا کے رکھنا اپن سالا اپنے دوست کو لکھوائے گا کہ ممبئی میں کیا کیا ہوتا ہے۔" اور پھر دنیش کے ساتھ بیوک کار میں بیٹھا اور اس نے نئی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔

## (11)

ہر نام کیمیکل انڈسٹری بڑی تیزی کے ساتھ مارکیٹ پر چھا گئی..... مناسب داموں کے

ساتھ ساتھ مال نئی نزاکت کے ساتھ مارکیٹ میں آ گیا۔ اس کے مقابلے میں کومل انڈسٹری کے مال میں پہلے جیسے اوصاف نہ رہے تھے۔ یہ مال خریدنے والے اکثر اس بات کی شکایت کرتے تھے کہ مال کا معیار بہت گر گیا ہے.....کومل کیمیکل انڈسٹری کا مال مارکیٹ میں بہت کم چلنے لگا۔

کومل ایک دن اپنے نئے منیجر پر ابل پڑی۔

''آج تک جو کمپنی نفع پر جا رہی تھی، آپ کے چارج سنبھالنے کے بعد خسارے پر جانے لگی۔ آخر کیوں؟''

''میڈم میں خود حیران ہوں کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہمارا مال مارکیٹ والے کیوں نہیں اٹھاتے۔ تیار ہو کے وہ مال گوداموں میں سڑ رہا ہے۔ میں کمپنی کے پرانے منیجر سے یہ بات معلوم کرنے گیا تھا کہ کیا ایسے موقعے پہلے بھی کبھی آئے تھے۔ اگر آئے تھے تو کیا کیا جاتا تھا.....لیکن وہاں منیجر صاحب کے فلیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ آس پاس کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ منیجر نے ہرنام کیمیکل انڈسٹری والوں کی نوکری اختیار کر لی ہے اور آج کل وہیں کمپنی کے کوارٹر میں رہتا ہے۔ تب مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر تلا ہوا ہے۔

کومل نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔

''اس بوڑھے کی جرأت.....ہم سے ٹکر لینے کی سوجھی، میں اس سے اس انتقام کا بدلہ لوں گی۔''

پھر اس نے اپنے نئے منیجر سے کہا۔

''تم جا سکتے ہو۔''

''میڈم کمپنی کے حالات بگڑ رہے ہیں۔ اگر اس کمپنی کو زندہ رکھنا ہے تو اس کے لیے پیسوں کا انتظام کرنا چاہیے۔''

''میں جانتی ہوں.....اور اب تم جا سکتے ہو.....!''

منیجر چلا گیا.....!

کومل نے تنہائی میں حالات کا جائزہ لیا اور سوچ میں پڑ گئی کہ ہرنام کیمیکل انڈسٹری کے عروج میں بوڑھے منیجر کا ہاتھ ہے اور بوڑھے منیجر نے کمپنی کیوں چھوڑی.....صرف انل کے معاملہ کی وجہ سے.....!

''انل.....انل.....!'' وہ چیخ پڑی..... ''میری تباہی کا باعث انل بنتا جا رہا ہے.....اور میں انل کی زندگی کو ختم کر دوں گی۔''

اس نے ٹیلیفون رسیور ہاتھ میں اٹھایا اور نمبر ڈائل کیا۔

''راکیش بول رہے ہو....فوراً چلے آؤ.....!''

تھوڑے وقفے کے بعد ایک کالے رنگ کا آدمی کومل کے سامنے کھڑا تھا.....کومل نے کہا۔

''راکیش تمہیں وہ کتاب والا انل یاد ہوگا؟''

''جی ہاں، جس کی کتابوں کی دکان میں نے جلوادی تھی۔''

''ہاں.....'' کومل نے کہا ''اس کو قتل کر دو....!''

''میڈم.....'' وہ حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

''دس ہزار روپئے ملیں گے۔''

''کیوں.....لیکن کیوں.....؟''

''کیوں، نہیں پوچھا جائے گا۔ دس ہزار روپئے'' کومل نے کہا۔

''او.کے.کام ہو جائے گا۔''

''یہ لو! دو ہزار ایڈوانس۔''

راکیش نے دو ہزار جیب میں ٹھونس لیے.....اور کومل کو سلام کر کے چلا گیا.....!!

کومل نے خود کو ہلکا محسوس کیا، جیسے انل کی موت ہی اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوگی۔

اس شام جب کومل کھانے کے ٹیبل پر کھانا کھا رہی تھی۔

شمبھو نے کہا۔

''بیٹی.....آج انل کا خط دہلی سے میرے نام آیا ہے، مجھے بہت یاد کر رہا ہے۔ لکھتا ہے کہ آج کل وہ اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے.....بیٹی میں نہ کہتا تھا کہ وہ اچھا لڑکا ہے۔''

''شمبھو.....'' کومل نے کہا ''تم ہر وقت انل کے گیت گاتے رہتے ہو، تمہارے لیے اچھا ہوگا کہ تم بھی انل کے پاس دہلی جاؤ۔''

شمبھو نے تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو مردہ سا محسوس کیا۔ چالیس سال کے بعد اس

سے یہ گھر چھوٹا جا رہا تھا....اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن کومل سے صرف اتنا کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میں جاتا ہوں۔تم سکھی رہو۔''

شمبھو کاکا نے جب کوٹھی کو چھوڑا، اس وقت سخت بارش ہو رہی تھی۔کسی نے یہ نہ پوچھا کہ ''شمبھو اس بارش میں کہاں جاؤ گے.....اور وہ بھی ممبئی جیسے شہر میں.....!''

وہ سیدھا سنٹرل ریلوے چلا گیا۔اس نے سوچا کہ ۱۲ بجے والی ٹرین سے اپنے گاؤں چلا جائے گا۔جہاں، وہ اپنے چالیس سال کے واقعات یاد کر کے سو جانا چاہتا تھا....

ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔

شمبھو سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

''نوکری کرو گے شمبھو کاکا.....'' کسی آواز نے اسے چونکا دیا۔اس نے جو سر اٹھایا دنیش کو اپنے سامنے پایا۔شمبھو نے کہا۔

''سیٹھ میں اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن ہم تم کو اپنے گاؤں نہیں جانے دیں گے شمبھو کاکا.....کل کا جو دن آنے والا ہے، وہاں تمہاری ہمیں بہت ضرورت ہے.....چلو کار باہر کھڑی ہے۔''

شمبھو کھڑا ہو گیا اور دنیش کے پیچھے پیچھے چلنے لگا..... بارش تھم گئی تھی.....!

اور ستاروں بھری رات آنے والے سنہرے دن کا پتہ دے رہی تھی!!

## (12)

کومل کیمیکل انڈسٹری کا خسارہ اب برداشت کی حدود کو پار کر گیا تھا۔کہنے والے کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی.....یہ ضرب المثل کومل کیمیکل انڈسٹری کے لیے صحیح ثابت ہوئی۔

انڈسٹری کی ایک مشین خراب ہو گئی جس کی وجہ سے سارے پلانٹ پر اثر پڑا۔اور سارا کام ٹھپ ہو گیا۔اس کی وجہ سے نقصان میں اضافہ ہونے لگا۔اور پھر چیف انجینئر نے غیر متوقع بات کہہ ڈالی کہ پلانٹ کی بیکار مشین کی مرمت نہیں ہو سکے گی، اوس لیے نئی مشین لانے کا انتظام کیا جائے۔

اور نئی مشین لانے کے لیے بہت بڑی رقم درکار تھی۔حالات کی غیر اطمینانی اور نقصان میں اضافہ ہونے کی وجہ سے کومل بہت پریشان رہنے لگی تھی۔کومل کیمیکل انڈسٹری کے حالات اب کسی سے

پوشیدہ نہ رہے تھے۔اس لیے کوئی بھی بزنس مین نئے سرے سے اس انڈسٹری میں رقم لگانے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔کومل نے اپنے والدین کی موت کے بعد پہلی بار اپنے باپ کو یاد کیا۔

آج پتا جی ہوتے تو شاید یہ وقت نہ آتا..... پھر اس کے سامنے انل کی شکل آ گئی۔انل کی شکل نے بگڑتے بگڑتے ایک اژدھا کے روپ میں تبدیل ہو گئی۔وہ بڑبڑائی۔

''انل تو میرے لیے اپنے ساتھ بدقسمتی اور بدبختی لایا۔'' وہ کیبن میں بیٹھے بیٹھے ان ہی خیالات میں غلطاں تھی کہ منیجر نے کیبن میں آکر کہا۔

''ہرنام کیمیکل انڈسٹری کا نمائندۂ خصوصی مسٹر دنیش آیا ہے۔وہ مجھ سے ملا وہ اپنے ساتھ کچھ دلچسپ پرپوزل لایا ہے۔اس لیے میں نے اس سے کہا کہ خود ہی آپ سے ملے....''

کومل نے تھوڑی دیر سوچا پھر کہا۔

''اچھا اسے اندر لے آیئے اور دوران گفتگو آپ بھی یہیں رہیں۔''

منیجر اور دنیش اکٹھے کمرے میں داخل ہوئے۔اس نے نمستے کے بعد کومل سے کہا۔

''جیسا کہ آپ کو منیجر صاحب نے بتایا ہوگا کہ میں ہرنام کیمیکل انڈسٹری کا نمائندۂ خصوصی ہوں......میڈم آپ کی انڈسٹری کی جو رپورٹ ہمارے پاس موجود ہیں، ان کے مطابق وہ آج کل خطرناک حد تک خسارے میں چل رہی ہے۔''

دنیش نے تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی اور پھر کہا۔

''ہمارے چیئرمین صاحب کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا ہے، بہرحال حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، انڈسٹری خسارے میں جا رہی ہے۔لیکن خسارہ نفع میں بدلا جاسکتا ہے۔''

اس نے اب خاموشی اختیار کر لی، کیونکہ ضروری تھا کہ سننے والا اس سے پوچھے کہ نقصان کو نفع میں کیسے بدلا جاسکتا ہے۔

منیجر نے کہا۔

''کیسے؟''

''ہمارے چیئرمین صاحب نے ہمیں ایک پرپوزل دیا ہے۔اس کے مطابق کومل انڈسٹری اور ہرنام انڈسٹری....نیو انڈسٹری نام کی دو گروپ انڈسٹریاں ہوں گی.....یعنی دونوں کا اپنا

انفرادی کردار ہوگا۔لیکن دونوں نیو انڈسٹری کے جھنڈے تلے کام کریں گی.....ہمارے چیئرمین کومل کیمیکل انڈسٹری میں پیسے لگانے کے لیے تیار ہے لیکن دونوں انڈسٹریوں کے Managing اختیارات ان کے پاس رہیں گے۔اس کے بدلے کومل کیمیکل انڈسٹری کے مالک کو دونوں کمپنیوں کے نفع سے چالیس فیصد حصہ ملے گا.....''

''یہ پرپوزل میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔''

تھوڑی دیر کے لیے سب خاموش رہے۔آخر منیجر نے یہ خاموشی توڑی۔

''ہمیں سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔''

''ضرور....ضرور.....کل شام تک آپ سوچ کر ہمیں جواب دے دیجیے۔'' دنیش نے کہا ''اصل میں ہرنام انڈسٹری کے چیئرمین اپنی کیمیکل انڈسٹری کو بہت اونچا لے جانا چاہتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ دوسری اور انڈسٹری کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں۔اس بارے میں میرے پاس فہرست آئی ہے، اس میں آپ کا نام سب سے اوپر ہے۔آپ کے ساتھ اگر بات چیت ناکام رہی تو میں سادھنا کیمیکل انڈسٹری والوں سے بات کرنے جاؤں گا،اس لیے آپ مجھے کل شام تک ہاں یا نہیں میں جواب دیجیے۔''

دنیس نے کھڑے ہوتے ہوئے کومل سے کہا۔

''میڈم، مجھے اجازت دیجیے.....'' اور پھر منیجر نے کہا۔

''منیجر صاحب، میرا فون نمبر آپ کے پاس ہے، مجھے کل آپ کے فون کا انتظار رہے گا۔''

کومل تھوڑی دیر کے لیے دنیش کے بارے میں سوچتی رہی کہ کیسے میٹھے اور سیدھے انداز میں اس نوجوان نے اس سے کہا کہ وہ اپنی ہی انڈسٹری میں دوسرے درجے پر چلی جائے۔لیکن اس کی پشت پر وہ حیرت انگیز آدمی ہے جو اس کا مالک ہے، جو یہ جانتا ہے کہ کومل انڈسٹری کو بچانے کے لیے یہ قدم اٹھانا ضروری ہے۔

منیجر نے کومل سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ جب کوئی آدمی پیسے لگانے کے لیے آگے آرہا ہے تو موقعہ غنیمت ہے، اس موقعہ کو ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہیے۔''

کومل نے کہا۔

''لیکن میری پوزیشن؟''

منیجر نے جواب دیا۔

''بہر حال نفع میں سے آپ کو چالیس فیصد مل رہے ہیں اور وہ بھی دو مشترکہ کمپنیوں سے۔''

''میں سوچنا چاہتی ہوں.....''

''آپ سوچ لیجیے.....لیکن میرا مشورہ ہے کہ ہمیں ہرنام والوں سے اشتراک کر لینا چاہیے۔''

کومل نے منیجر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

اس رات وہ ''بلیو برڈ'' کلب گئی....اپنی مقدار سے زیادہ شراب پی۔ جس کی وجہ سے لڑکھڑانے لگی....لیکن اپنی کوٹھی صحیح وسلامت پہنچ گئی۔ جب آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی تو انل سامنے آ گیا۔ وہی معصوم مسکراہٹ لیے اس کے گھنگریالے بال ماتھے پر لٹک رہے تھے۔ آئینہ بول پڑا۔

''میڈم تمہاری کمپنی تمہارے ہاتھوں سے چھوٹی جا رہی ہے۔''

وہ چیخ پڑی۔

"I will kill you bloody fool."

اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے گلدان سے آئینہ میں آئی ہوئی صورت کو چکنا چور کر دیا۔ لیکن انل اب بھی کومل کے ذہن کے خانوں میں چھپا ہوا تھا۔

دوسرے دن صبح منیجر کو کومل نے بلا کے کہا۔

''آپ دنیش سے شراکت نامے کے سلسلے میں تفصیلی بات چیت کر سکتے ہیں.....''

منیجر کے چہرے پر جو چند ماہ سے بہت تناؤ تھا، پہلی بار ہلکا ہو گیا.....کومل نے آگے کہا۔

''اس سے کہیے کہ میری صرف ایک شرط ہے، وہ یہ کہ ہمارا پرانا بوڑھا منیجر سادھو رام اس نئی کمپنی میں کام نہیں کرے گا.....''

اس دن دوپہر کے وقت منیجر نے دنیش کو فون کیا اور کومل کی اس انوکھی شرط کو سنا دیا...دنیش نے قہقہہ لگاتے ہوئے منیجر سے کہا۔

''اس شرط کے بارے میں چیئرمین نے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا۔ اس لیے ہم نے کل ہی سادھو رام کو ہرنام کیمیکل انڈسٹری کی منیجری کے کام سے سبکدوش کر دیا ہے......''

منیجر نے اطمینان کی سانس لی.....دو دن کی طویل گفتگو کے بعد جس میں دونوں جانب کے وکیلوں نے حصہ لیا۔شراکت نامہ مرتب کیا گیا.....ہرنام انٹر پرائزز کی جانب سے دنیش نے اور کومل کیمیکل انڈسٹری کی طرف سے کومل نے شراکت نامہ پر دستخط کیے۔

اگلے چند دنوں میں کومل کیمیکل انڈسٹری کے لیے نئی میشن آگئی اور کام پہلے کی رفتار سے چالو ہو گیا...... پہلے ہی ماہ خسارے پر بہت حد تک قابو پالیا گیا....

تین ماہ کی قلیل مدت میں کومل کیمیکل انڈسٹری نے نہ صرف خسارے پر قابو پالیا بلکہ نفع بھی آنا شروع ہو گیا۔کومل نے اطمینان کی سانس لی....ایک دن جب وہ ہشاش بشاش اپنی کیبن میں بیٹھی ہوئی تھی، راکیش داخل ہوا....کومل نے چونکتے ہوئے کہا۔

''راکیش تم.....!''

''میڈم تین ماہ سے آپ کا کام نہیں ہو رہا ہے۔کیونکہ انل نے سال بھر پہلے ہی ممبئی چھوڑ دیا اور آج تک وہ واپس نہیں آیا۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں.....'' کومل نے کہا'' آج کل وہ دہلی میں ہے۔''

''ارے میں اسے ممبئی میں ڈھونڈھ رہا ہوں.....خیر کوئی بات نہیں میڈم۔میں اب کی بار آپ کا کام کر کے ہی واپس آؤں گا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ کیبن سے باہر چلا گیا۔اور کومل ''لیکن'' کہتے رہ گئی۔نہ جانے کیوں پہلی بار اسے انل کو قتل کرانے میں ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔شاید اس لیے کہ اس کی زندگی میں جو اضطراب آیا تھا اس میں ٹھہراؤ آ گیا تھا اور پہلے جیسی نفرت بھی انل کے لیے اس کے دل میں نہیں رہی تھی۔

(13)

ماہ اپریل کا دوسرا دن بڑا ہی خوش گوار تھا۔جب دنیش کومل کیمیکل انڈسٹری کے دفتر میں آیا..... منیجر کو سلام کر کے وہ اپنے ساتھ منیجر کو کومل کے کیبن میں لے آیا، وہاں بھی دنیش نے سلام کیا اور کہا۔

''میڈم میں اس لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، کہ کل صبح چیئر مین صاحب آرہے ہیں۔وہ اس دفتر میں دن کے تین بجے پہنچ رہے ہیں۔میں نے سوچا کہ آپ کو ان کی آمد کے بارے میں قبل از وقت اطلاع دے دوں۔''

کومل نے منیجر سے کہا۔

''کیوں منیجر صاحب، دنیش کے چیئر مین صاحب کا کھانا کل شام ہماری کوٹھی پر ہو۔ یہ کیسا رہے گا؟''

''بہت اچھا....'' منیجر نے کہا۔

دنیش نے کہا۔

''میں کل ان کی مصروفیات کا شیڈول بنا رہا ہوں۔ اور کل شام کا کھانا میڈم کی کوٹھی پر رکھوں گا....'' منیجر نے کہا۔

''مسٹر دنیش بہت بہت شکریہ۔''

دنیش نے مسکراتے ہوئے کومل اور منیجر سے اجازت لی، اس کے جانے کے بعد منیجر نے کومل سے کہا۔

''میڈم میں آفس اور فیکٹری دونوں جگہوں کی کارکردگی کا جائزہ لے کے سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک رکھوں گا۔''

''ٹھیک ہے....'' کومل نے کہا ''اور اس کے علاوہ کل شام کا کھانا بھی آپ ہی خود کرائیے۔''

''جی بہت اچھا۔''

ان جملوں کے کہتے ہی منیجر کیبن سے باہر چلا گیا۔

کومل ''ہرنام انٹر پرائزز'' کے چیئر مین کے بارے میں سوچنے لگی کہ وہ کیسا آدمی ہوگا.... جوان ہوگا.... بوڑھا ہوگا۔

وہ بڑبڑائی۔

''وہ بوڑھا ہوگا......اس کے ہر فیصلے سے تجربہ کاری جھلکتی ہے.....یقیناً وہ بوڑھا ہوگا۔''

اور نہ جانے کیا کیا شبیہیں کومل کی آنکھوں کے سامنے لہرائیں۔

دوسرے دن تین بجے دفتر کے ہر کارکن میں مستعدی نظر آرہی تھی جب کہ دن کے اس وقت ملازموں پر عام طور پر کاہلی غالب ہوتی ہے.....منیجر نے اپنا نیا سوٹ آج زیب تن کیا تھا۔ کومل بھی اپنے کیبن میں موجود تھی۔ اس نے بھی آج بہت ہی قیمتی ساڑی زیب تن کی تھی۔

ایک چھوٹا مگر خوبصورت ہار اس کی صراحی دار گردن کی زینت بنا ہوا تھا۔ وہ آج دو آتشہ بنی ہوتی تھی۔

دنیش دن کے سوا تین بجے دفتر میں یہ خبر لے کے آیا کہ۔

''چیئرمین صاحب دس منٹ کے اندر آرہے ہیں۔''

منیجر اور کومل دونوں بلڈنگ کے نچلے والے گیٹ پر کھڑے ہوگئے۔ پاس میں دنیش بھی کھڑا تھا۔

منیجر جس دنیش کو جانتا تھا، وہ دنیش آج نظر نہیں آرہا تھا..... وہ آج گھبرایا ہوا تھا..... نروس تھا..... منیجر نے مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے کہا'' مالک کی آمد پر ہر ملازم بوکھلا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کی مالا تھی جو چیئرمین کے گلے کا ہار بن جانے کے لیے بے تاب نظر آرہی تھی۔

ٹھیک ساڑھے تین بجے کالی رنگ کی امبیسڈر گاڑی اس کے بعد ایک بیوک کار اور اس کے پیچھے ایک فیئٹ کار، تین کاروں کا قافلہ کومل کیمیکل انڈسٹری کے سامنے رک گیا۔

امبیسڈر گاڑی میں سے ایک کالا سایہ اترا..... اس نے بیوک کار کا دروازہ کھولا..... فیئٹ کار سے دوڑتا ہوا ایک نوجوان آیا..... وہ بھی بیوک کار سے اترنے والی شخصیت کا انتظار کرنے لگا۔

اس پروقار شخصیت نے پہلا قدم زمین پر رکھا..... پھر وہ بیوک گاڑی سے باہر آیا۔

دوڑتے ہوئے منیجر نے پھولوں کا ہار چیئرمین کے گلے میں ڈال دیا۔

کومل جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

''انل...... اس کا ڈرائیور..... اور چیئرمین۔''

وہ اپنی نظروں کا اعتبار ڈھونڈ رہی تھی..... وہ اپنے وجود پر شک کرنے لگی...... اور وہ حقیقت کو خواب سمجھنے لگی۔

منیجر کو کومل کے سلام نہ کرنے، نہ آگے بڑھنے اور نہ ہاتھ ملانے والے رویہ پر سخت تعجب ہوا۔

انل نے کومل سے کہا۔

''ہیلو مس کومل۔''

''او ہیلو.....'' کومل نے بوکھلاتے ہوئے جواب دیا۔ اور یہ قافلہ آفس والے طبقے کی طرف روانہ ہوا.... انل نے آفس کا سرسری جائزہ لیا۔

ہر ایک سے وہ خندہ پیشانی سے ملا..... اس نے اسٹینوگرافر سے کچھ سوالات کیے۔

پھر ٹائپسٹ سے۔

اور اسی طرح اکاؤنٹینٹ سے۔

اس کی ذہانت اور تجربہ کاری کی داد ہر ایک ملازم دینے لگا اور کومل کو پورا یقین ہو گیا کہ یہ اس کا ڈرائیور انل نہیں ہے، اس کا کوئی ہم شکل ہے۔

انل کومل کے کیبن میں آ گیا.....کومل کی سیٹ پر بیٹھ گیا.....کیبن میں اب صرف وہ دونوں ہی رہ گئے۔

''مس کومل......میں کیمیکل انڈسٹری کی ترقی سے بہت خوش ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس گروپ مین اب تیسری انڈسٹری بھی شامل کی جائے۔ اس سلسلے میں روز کیمیکل انڈسٹری کو اپنے زمرے میں داخل کرنا چاہتا ہوں.....آپ تو جانتی ہی ہیں کہ روز کیمیکل انڈسٹری بھی بہت بڑی انڈسٹری ہے اس لیے ہم نئے شراکت نامے کو ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ اس شراکت نامے کے مطابق آپ کا حصہ تیس فیصدی رہے گا.اور روز کیمیکل انڈسٹری کا بھی تیس فیصدی اور ہمارا چالیس فیصدی رہے گا کیونکہ ہم Managing اختیارات اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔''

کومل نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔

''آپ میری ایک بات کا جواب دیں گے۔''

''بولئے مس کومل!''

''آپ کا نام مسٹر انل ہے۔''

''انل ورما....اور آپ کا یہ شک بھی صحیح ہے کہ کبھی میں نے آپ کے پاس ڈرائیور کے طور پر کام کیا ہے۔''

نہ جانے کس قسم کا لاوا کومل کے سینے میں دبا ہوا تھا جو ایک دم پھٹ پڑا۔

''میرے ڈرائیور تم....میری کرسی پر.....کیوں....؟ کیسے.....اٹھو میری کرسی سے اٹھ جاؤ۔''

کیبن سے باہر بھی کومل کی آواز سنی گئی۔

انل نے کہا۔

''مس کومل میں سمجھتا تھا کہ بدلے ہوئے حالات کو آپ پہچان پائیں گی لیکن آپ کے

دل میں اب بھی میرے لیے صرف نفرت ہے.....نفرت.....!''

انل کومل کا جواب سنے بنا کیبن سے باہر آ گیا اور اطمینان سے چلنے لگا۔

منیجر اسے کار تک چھوڑنے آیا.....اس نے منیجر کے ساتھ ہاتھ ملایا۔اور بیوک کار میں بیٹھ گیا۔

کاروں کا یہ قافلہ پالی ہل کی طرف روانہ ہو گیا۔

کومل کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ انل کبھی اس کا ڈرائیور رہا تھا، یہ سچ ہے کہ دنیا ایک کھیل تماشا ہے۔لیکن اتنا بڑا کھیل تماشا کومل نے سنیما کے پردے پر بھی نہیں دیکھا تھا اور حقیقت کی دنیا میں محال تھا۔اسے انل کے جملے یاد آئے۔

''آپ کے دل میں میرے لیے اب بھی صرف نفرت ہے نفرت.....!'' کومل بڑبڑائی۔

''ہاں...... ہاں میرے دل میں تمہارے لیے صرف نفرت ہے نفرت۔تم یرے پاس ایک معمولی ڈرائیور رہ چکے ہو۔''

## (14)

ڈنر کے سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے، کومل بھی کب چاہتی تھی کہ انل کے اعزاز میں وہ ڈنر کا اہتمام کرے۔انل جو کبھی اس کا معمولی ڈرائیور تھا۔اس کا ماضی کیا تھا......وہ بہرحال ایک حقیقت تھی، اور حقیقت سے آنکھیں مونڈھی نہیں جاتیں۔

''آج پھر 'بلیو برڈ' میں اس نے اپنی مقدار سے زیادہ شراب پی، آج وہ پھر لڑکھڑانے لگی۔زندگی میں جو سکون اور اطمینان آ گیا تھا، انل کے واپس آنے پر وہ کومل سے دور ہو گیا۔

والدین کی موت کے بعد کومل کو ہر نوجوان سے نفرت ہو گئی، اس کی زندگی کا سکون بکھر گیا.....وہ بھی ایک نوجوان تھا جس کے ساتھ اس کی شادی ہو رہی تھی۔

باپ نے کہا تھا۔

''تین چار دن کے بعد تمہاری منگنی امیش کے ساتھ ہونے والی ہے۔''

''میں اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی.....'' کومل نے جواب دیا تھا۔

''لیکن کیوں بیٹی.....؟'' ماں نے پوچھا تھا۔

''کل وہ میرے ساتھ کلب میں تھا.....اس نے جس طرح میرے ساتھ سلوک کیا، وہ مجھے

کچھ اچھا نہیں لگا.....وہ اوباش قسم کا نوجوان ہے۔

''وہ بڑے باپ کا لڑکا ہے.....'' باپ نے کہا ''اور جانتا ہے کہ تمہاری شادی اس کے ساتھ ہو رہی ہے۔''

''اخلاق.....ڈیڈی اخلاق.....وہ اخلاق نہیں جانتا.....وہ شراب میں بہک کر کوئی بھی حرکت کر سکتا ہے، میں کبھی امیش سے شادی نہیں کروں گی.....''

ڈیڈی نے چیخ کر کہا۔

''تم نے ہمارے بے جا پیار کا غلط فائدہ اٹھایا۔ تمہاری شادی امیش سے ہو کے رہے گی۔''

ماں نے کہا ''ہاں بیٹی، شادی امیش کے ساتھ ہی ہوگی، ہم نے وچن دیا ہے۔''

وہ دونوں شوالی مندر جانے کے لیے کار میں روانہ ہو گئے، لیکن اس دن دونوں نے کومل کو جاتے وقت پیار نہیں کیا۔ کومل کو یہ بات بری لگی اور امیش کے لیے اس کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی.....امیش وہ پہلا نوجوان تھا، جس کی وجہ سے کومل کے ماں باپ اور کومل کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔ لیکن اس دن اس کے ماں باپ واپس نہیں آئے۔ وہ ایک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئے.....کومل یہ سن کر بے ہوش ہو گئی اور جب ہوش میں آئی، تو اس کے مزاج میں تلخی آ گئی تھی۔ اور ہر نوجوان کے لیے اس کے دل میں نفرت کی جڑوں نے مضبوطی پکڑ لی تھی۔

اس واقعہ کے ٹھیک دو سال بعد انل اس کے پاس بحیثیت ڈرائیور ملازم ہو گیا۔

انل نوجوان تھا، خوبرو تھا۔

امیش بھی نوجوان تھا خوبرو تھا۔

اس پس منظر میں انل کے لیے کومل کے دل میں نفرت ابھری اور ابھرتی گئی۔

پھر جب انل نے اس کی تلخ مزاجی کا مقابلہ تلخی سے کیا تو اس نے بھی اس کے سامنے امیش کی شکل اختیار کی۔ پھر اس کے جانے کے بعد اس کا بوڑھا منیجر سادھو رام چلا گیا.....شمبھو کاکا چلے گئے اور اس نے اپنا نظام بکھرتے اور ٹوٹتے ہوئے محسوس کیا اور وہ اس بے ترتیبی کا ذمہ دار صرف انل کو ٹھہرانے لگی.....انل سے بدلہ.....قتل.....اور نہ جانے کیا کیا منصوبے اس کا ذہن ترتیب دینے لگا اور اب وہ اس کے سامنے ہرنام انڈسٹری کا چیئرمین بن کے اسے چیلنج کر رہا تھا۔

''بولو تمہاری حقیقت کیا ہے.....میری دولت نے تمہاری کمپنی کو ڈوبنے سے بچایا، تمہاری شہرت کو بچایا.....غصے میں اس نے شراب کا سہارا لیا۔

وہ ہار گئی......

انل نے اسے شکست دی.....

یہی احساس اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا..... بلیو برڈ کلب سے جب وہ لڑکھڑاتے ہوئے باہر آنے لگی، تو روی کھنہ نے اسے سہارا دینا چاہا.....

کومل نے کرخت آواز میں کہا۔

"Do not touch me under stand"

آج تک کومل کے جسم کا ایک بھی لمس کوئی نوجوان حاصل نہ کرسکا تھا۔ امیش اس لیے کومل سے ہاتھ دھو بیٹھا کیوں کہ وہ شادی سے پہلے کومل کے قریب ہونا چاہتا تھا، اور روی کھنہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہ گیا.....وہ بڑبڑایا۔

''میڈم میرا بھی وقت آنے والا ہے۔ تمہارے ڈرائیور کے ہاتھوں پہلے ہی ذلیل ہوا ہوں اور اب تمہارے ہاتھوں بھی.....''

## (15)

انل اندھیرے میں بیٹھا دن کے واقعات کا جائزہ لینے لگا.....وہ کومل کے بارے میں سوچنے لگا۔

''وہ اپنی تلخ مزاجی کو چھوڑ نہیں سکی.....حالانکہ میں نے اس کے لیے خسارے والی کمپنی میں پیسے لگائے، کیونکہ وہ جیسی بھی تھی مجھے اچھی لگی تھی، لیکن اس کے دل میں آج بھی میرے لیے نفرت اور صرف نفرت ہے۔''

وہ نہ جانے سوچوں کے کتنے فاصلے طے کرتا رہا.....شمبھو نے بلب جلا دیا.....

''بیٹا اندھیرے میں کیوں بیٹھا ہے؟''

''کاکا.....اندھیرا تب اچھا لگتا ہے جب آدمی اپنے آپ کو روشنی میں نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''بیٹھو کاکا.....میں دیکھ رہا ہوں، تمہاری آنکھیں مجھ سے یہ سوال کر رہی ہیں کہ میں کیسے

کروڑ پتی بنا..... کومل کی آنکھیں بھی یہی سوال مجھ سے کر رہی تھیں۔"

"کومل سے ملے تھے بیٹے..... کیسی ہے وہ؟"

"اچھی ہے....... خیر شمبھو کا کا سن لو، میں کیسے امیر بنا۔ میرا باپ بہت بڑا آدمی تھا..... دولت مند تھا..... لیکن اس نے اپنے باپ یعنی میرے دادا کی دولت صرف اس لیے ٹھکرائی کیونکہ اس نے گاؤں میں جا کر ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ وہ قول کا پکا تھا..... آدمی تھا..... دادا نے چاہا تھا کہ وہ اس کی شادی ایک امیر لڑکی سے کر دے۔ لیکن میرا باپ راضی نہ ہوا..... دادا نے دھمکی دی کہ وہ اسے جائداد کے حقوق سے الگ کر دے گا، لیکن میرا باپ بھی اپنے باپ کی طرح ضدی تھا...... اس نے تمام دولت پر لات مار دی اور میری ماں کے ساتھ سادہ طریقے کی زندگی گزارنے لگا۔ لیکن زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ دس سال کے بعد مر گیا۔

میری ماں گاؤں کی ہونے کے باوجود پڑھی لکھی عورت تھی۔ اس نے میرے باپ کی موت کے بعد گاؤں چھوڑ دیا.... دہلی آ گئی اور ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئی اور میری پرورش کرنے لگی....!

میں جب بیس سال کا ہو گیا، بی اے کی فرسٹ کلاس کی ڈگری حاصل کرنے کی خبر ماں کو سنانے گیا..... لیکن وہ یہ خبر سننے سے پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی.....

میرا دادا اپنے بیٹے کی موت کی خبر کے بعد دس سال تک مجھے ڈھونڈتا رہا، لیکن اسے ہمارا پتہ تب تک نہ چل سکا جب تک میری ماں زندہ تھی۔

میرا دادا میرے پاس آیا۔ اور اپنی زیادتیوں کے لیے معافی مانگنے لگا۔ لیکن میں بھی ضدی باپ کا بیٹا تھا۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا۔

"میں آپ کی دنیا میں نہیں آؤں گا۔"

وہ مجھے منانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن میں نہیں مانا..... اور دہلی چھوڑ کر ممبئی آ گیا..... لیکن میرا پیچھا سایے کی طرح کرنے لگا..... وہ کالا سایہ بہت دنوں تک میرا پیچھا کرتا رہا۔

دراصل وہ کالا سایہ میرے دادا کا جاسوس تھا۔ اچانک وہ ایک دن غائب ہو گیا..... کیونکہ میرا دادا ایک پیچیدہ قسم کے مرض میں مبتلا ہو گیا.... میرے دادا ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ میں کینسر کے علاج کے لیے آئے تھے۔ دوبارہ جب مجھے کالا سایہ ملا، اس دن کومل نے میرے کتابوں کا اسٹال جلا دیا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا کہ میرا دادا کینسر کا مریض ہے.....میں نے جب یہ سنا تو میرے اندر سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی۔

میرا دادا صرف تین ماہ اور زندہ رہا۔''

شمبھو نے کہا۔

''میری آنکھوں نے جب پہلی بار آپ کو دیکھا تھا کہ یہ بابو جو اوپر سے نظر آتے ہیں، اصل میں وہ نہیں ہیں، سچ تھا اور آپ ہی وہ آدمی ہوں گے جو کومل بیٹی کے اندر سوئی ہوئی عورت جگا دیں گے۔''

''کاکا مجھے لگتا ہے اس معاملے میں میری ناکامی ہوگی۔''

''نہیں بیٹا کامیابی ہوگی۔'' شمبھو نے اعتماد بھری آواز میں کہا۔

''ہم کل دوسرے بنگلے میں جائیں گے۔''

''کہاں....؟''

''وہ تمہیں کل معلوم ہو جائے گا۔''

اور کل...کل کے بارے میں کل ہی معلوم ہو جائے گا...وہ دونوں آنے والے کل میں کھو گئے۔''

## (16)

شمبھو کاکا کو نہیں معلوم تھا کہ جس نئے بنگلے میں وہ جا رہا ہے، وہ دراصل کومل کی کوٹھی کے سامنے برسوں سے بند پڑا ہوا بنگلہ ہے۔ کومل کے پاس جب وہ ملازمت کرتا تھا تب اکثر اس بنگلے کے سامنے رک کر سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے اس گھر کے مکیں کہاں ہوں گے، کس حال میں ہوں گے......اسے کیا معلوم تھا کہ انل جو کومل کی کوٹھی کے ''سرونٹ کوارٹر'' میں پڑا تھا.....دراصل سامنے والے بنگلے کا مکین اور مالک ہے.....

شمبھو سوچتا رہا کہ حقیقت کیسے کیسے انوکھے رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

انل ڈرائنگ روم میں ریڈیوگرام پر پرانا فلمی ریکارڈ سن رہا تھا.... مادھورام نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''نمسکار.....!''

''ارے....آئیے.....سادھورام جی....''

اس نے نہایت عزت کے ساتھ منیجر کو ایک آرام کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا.....ریڈیو گرام بند کر کے پوچھا۔

"کارڈ چھپانے کا کام مکمل ہو گیا.....؟"

"جی کام بھی ہو گیا اور لوگوں تک پہنچائے بھی گئے...کل یہاں بہت گہما گہمی ہو گی۔"

"سادھو رام جی میں آپ کے کام سے بہت خوش ہوں۔"

"جب آپ نے مجھے ڈرائیوری کی نوکری پر رکھا تھا تبھی میں نے جان لیا تھا کہ آپ جو بھی کام ہاتھ میں لیتے ہیں، وہ خلوص اور نیک نیتی سے انجام دیتے ہیں، اس لیے میں نے اپنے ساتھ یہ فیصلہ کیا تھا کہ زندگی نے اگر موقعہ دیا تو میں آپ کے خلوص اور نیک نیتی سے فیض یاب ہونے کی کوشش کروں گا.....مجھے یہ بھی کہنے دیجیے سادھو رام جی کہ آپ نے خلوص اور نیک نیتی کی ایک مثال پیش کی ہے، جب آپ نے خود ہی ہرنام کیمیکل انڈسٹری کے منیجری کا منصب چھوڑ دیا....."

"لیکن آپ نے مجھے کہاں چھوڑ دیا...آپ نے تو میرے ذمے فلمی پروڈکشن کا کام سونپ دیا۔"

"سادھو رام جی ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے، قدم قدم پر ضرورت ہے، آپ کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں.....ہرنام انٹرپرائزز کا چیئرمین ہونے کے ناطے میں آپ کو ایک تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لیجیے.....یہ نئی بیوک کار کی چابیاں ہیں.....اور اس ماہ سے آپ کی تنخواہ چار ہزار روپئے ماہانہ ہو گی۔"

"بیٹے....." سادھو رام نے کہا "عمر تو ہم نے دوسرے کے یہاں کام کرتے ہوئے بتا دی.....لیکن عمر کا جتنا حصہ اب باقی ہے میں آپ کی کمپنی میں تن من سے لگا دوں گا۔"

انل نے اس کے ہاتھ میں کارڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ہاتھ میں اب بھی کچھ کارڈ ہیں....."

"ہاں، آپ کے آس پاس کے ہمسایوں کے لیے....." اور پھر کارڈ کو انل کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے اجازت دیجیے....."

انل نے سادھو رام سے ہاتھ ملایا اور وہ رخصت ہو گیا۔ اس نے شمبھو کو بلایا اور کہا کہ "کل

شام شمبھو کا کا ہمارے اس بنگلے میں آنے کی خوشی میں ایک بہت شاندار پارٹی ہو رہی ہے۔ کومل کو کارڈ دے کے آؤ۔"

"لیکن......!"

"دے کے آؤ....!"

"اچھا بیٹا....!"

شمبھو نے سوچا کہ جب وہ کومل کے پاس جائے گا تو وہ ضرور اس کو لعنت ملامت کہے گی....لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ خلاف امید کومل، جو لان میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی، شمبھو کو دیکھتے ہی کہہ پڑی۔

"کاکا، تم کہاں چلے گئے تھے، اپنی بیٹی کو اکیلا چھوڑ دیا۔"

شمبھو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے.....کومل کے والدین کے فوت ہو جانے کے بعد وہ پہلی بار کومل میں پہلی جیسی کومل پا رہا تھا۔

شمبھو نے کہا۔

"میں تو اسی شہر میں پڑا رہا بیٹی...... یوں تو میں اپنے گاؤں واپس جانا چاہتا تھا، لیکن انل بیٹے کے آدمیوں نے مجھے ریلوے اسٹیشن سے ڈھونڈ نکالا۔ تب سے میں اسی کی نوکری میں ہوں....."

"لیکن کاکا، اس کے پاس.....جب کہ تم....."

"بیٹی، جس طرح ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی، اسی طرح ضروری نہیں کہ جو چیز تانبہ نظر آئے وہ واقعی تانبہ ہی ہو، انل بیٹا اصل میں کچھ اور تھا اور نظر کچھ اور آیا تھا....."

"کیا مطلب....؟" کومل نے سوال کیا۔

اس پر شمبھو نے کومل کو انل کی ساری کہانی سنا دی۔

"دراصل وہ اپنے دادا سے جھگڑا کر کے ممبئی آیا تھا۔"

"کچھ بھی ہو کاکا....." کومل نے تلخ آواز میں کہا "لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک زمانے میں وہ میرا معمولی ڈرائیور رہ چکا ہے۔"

"میرا خیال ہے بیٹی کہ کل جو گزر گیا، وہ جھوٹا تھا.....آج جو ہے وہ ہمارے سامنے ہے اور حقیقت ہے....." شمبھو نے کہا۔

''ہر بات آسانی سے بھلائی نہیں جا سکتی.....

پھر کومل نے کہا'' یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے....؟''

اس نے کارڈ کومل کے ہاتھ میں دے دیا۔

''بیٹی وہ جو تمہارے سامنے کا بنگلہ ہے، وہ بھی انل کا ہے۔اس بنگلے میں آنے کی خوشی میں وہ کل شام پارٹی دے رہے ہیں، آپ کو آنے کے لیے کہا ہے۔''

وہ سوچنے لگی کہ انل میرے سامنے والے بنگلے میں ہی کیوں آیا۔آخر وہ چاہتا کیا ہے..... آخر وہ بار بار اس بات کو کیوں دہرانا چاہتا ہے کہ میری حقیقت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔''

اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''مجھے تم سے سخت نفرت ہے، انل سخت نفرت۔میں کل پارٹی میں شرکت کرنے آؤں گی اور سب سے تمہاری اصلیت کہوں گی.....کہوں گی کہ تم میرے ہاں ایک معمولی ڈرائیور رہے ہو....''

کومل نے شمبھو سے کہا۔

''کاکا میں تم سے مانگوں گی دو گے۔''

''بیٹی میری جان تمہارے کام آجائے تو حاضر ہے۔''شمبھو نے کہا۔

''وچن دو.....''

''وچن دیا.....بیٹی.....!''

''کاکا تم میرے پاس آجاؤ....کاکا تمہارے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا اپنا کوئی نہیں ہے۔''

''بیٹی....میں نے تمہیں وچن دیا ہے۔میں آؤں گا، تمہارے پاس واپس آؤں گا...''

اسی وقت انل کے ڈرائنگ روم میں رحمت بھائی اس سے کہہ رہا تھا۔

''بیٹے خان، آخر تم چھپے رستم نکلے، میری دوستی کا معاوضہ میرے جیسے مفلس آدمی کے ساتھ ساجھے داری میں موٹر گیراج کھول کے چکا دیا....لیکن تم نکلے یار......اناڑی کھلاڑی...''

''وہ کیسے....؟''

''وہ اس طرح کہ دوستی پیسوں کے بل بوتے پر نہیں ہوتی، دوستی صرف دوستی چاہتی ہے، وہ

اور کوئی مطلب نہیں جانتی..... میں نے تمہیں یار بنایا اس لیے کہ میرے دل نے کہا کہ رحمت یہ آدمی تیرا ہے اور تیرا یار ہے، یاری نبھانا لیکن پیسوں کو بیچ میں لا کے یار انل تم اناڑی کھلاڑی ثابت ہوئے۔"

"نہیں رحمت بھائی تم غلط سمجھ رہے ہو..... میں نے موٹر گیراج دوستی کا معاوضہ چکانے کے لیے نہیں کھولا..... میں چاہتا تھا کہ تم میری نظروں کے سامنے رہو..... میں تمہیں دیکھ کر ان اچھے برے دنوں اور ان واقعات کو یاد کرتا رہوں جب تمہارے سوا اور کوئی نہ تھا۔"

"لیکن میرے یار، رحمت بھائی کے لیے یہ کافی تھا کہ جب تم بڑے سے بڑے آدمی سے یہ کہتے ہو کہ رحمت میرا دوست ہے اور مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے..... اس لیے میں نے اپنی دوستی کے درمیان سے دولت کی دیوار ہٹا دی..... میری کمائی کے پیسوں سے ایک چھوٹا موٹا اسپتال بن جائے گا۔ یہ تمہاری اور میری دوستی کی یادگار ہوگی۔"

"رحمت تم نہ صرف ایک عظیم دوست ہو بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہو....."

اسی وقت شمبھو کاکا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

"کیوں شمبھو کاکا، کیا بات ہے....." انل نے شمبھو کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"بیٹے، میں اجازت لینے آیا ہوں..... میں بیٹی کے پاس جاؤں گا..... واپس کام کرنے۔"

رحمت بھائی نے شمبھو سے کہا۔

"لیکن شمبھو کاکا، یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ جب دوسروں نے آپ کو چھوڑ دیا، تب ہم نے آپ کو اپنایا اور اب جب دوسرے اپنے پاس بلا رہے ہیں تم ہم کو چھوڑے جا رہے ہو۔"

"نہیں.....!" انل نے رحمت کو روکتے ہوئے کہا "شمبھو کو جانے دو یہ میرے پاس مہمان بن کے آئے تھے اور مہمان رہنے کے لیے نہیں جانے کے لیے آتے ہیں....."

"بیٹا..... بیٹا....." شمبھو الفاظ ڈھونڈنے لگا۔

"نہیں کاکا..... میں خوش ہوں۔ تم واپس اپنی جگہ جا رہے ہو۔"

شمبھو انل سے اجازت لے کر کومل کے پاس آیا۔

"بیٹی میں واپس آ گیا....."

"شمبھو کاکا تم واپس آ گئے.....! انل نے تم کو آسانی سے چھوڑ دیا۔"

''ہاں بیٹی.....وہ تو دیوتا آدمی ہے''

''دیوتا کو غصہ نہیں آتا.....'' وہ اپنے آپ سے سوچنے لگی، اس نے سوچا تھا کہ شمبھو کا اس کے یہاں سے واپس آنا، انل کو ناگوار گزرے گا، ہنگامہ ہوگا، اور پہلی بار وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے....'' کومل بڑبڑا کر رہ گئی....''اس کے ہر منصوبے پر انل پانی کیوں پھیر دیتا ہے۔ کیوں.....؟''

رحمت نے انل سے پوچھا۔

''آخر یہ کومل کب اپنا رویہ تمہاری جانب سے بدلے گی، تا کہ کوئی ڈھنگ کی بات ہو۔''

''رحمت بھائی کومل ایک عام لڑکی نہیں ہے وہ اپنے اندر ایک علیحدہ دنیا رکھتی ہے، اس کو سمجھنا آسان نہیں۔''

پھر دونوں دوست کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

## (17)

دوسری شام انل کا بنگلہ رنگ و نور میں ڈوبا ہوا تھا۔

جب پارٹی عروج پر پہنچ گئی، تب کومل آ گئی.....!

انل کے لیے کومل کا آنا غیر متوقع تھا۔ لیکن کومل کی آمد سے وہ خوش ہوا.....کومل نے کہا۔

''چیئرمین صاحب! آپ کو نئے بنگلے پر آنا مبارک ہو۔'' پاس ہی کھڑے فلمی جرنلسٹ کے کانوں میں کومل کا یہ جملہ پڑا.....انل نے مسکراتے ہوئے پھولوں کا گلستہ لے لیا اور کہا۔

''شکریہ۔''

اس پارٹی میں شہر کے سرکردہ تاجروں کے علاوہ سرکاری آفیسرز، مفکر، وکلا، اور ڈاکٹر تھے۔ اس کے علاوہ روشن محفل۔ مشہور زمانہ ایکٹریس کلاوتی، پدمنی اور مینا شباب.....کلاوتی نے انل کے پاس آ کے کہا۔

''ڈارلنگ تم یہاں کہاں کھو گئے.....'' پھر اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوتے کہا ''آج میں نے تمام انگیجمینٹ Engagements کینسل کرا دیئے تا کہ میں تمہارے پاس رہوں......''

انل اچھی طرح جانتا تھا کہ کلاوتی انل کو صرف اس لیے لگا رہی ہے کہ وہ اس کی اگلی فلم کی ہیروئن رہے۔ انل نے بھی سنجیدگی سے کہا

''ہمیں بھی تمہیں دیکھے بغیر چین کہاں آتا ہے ڈارلنگ؟''

کومل کے لیے یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا.... کلاوتی کے یہ ناز و نخرے اور پھر محبت جتانے کے یہ طریقے، اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''رنگ و روغن چڑھاتے ہوئے یہ عورت اپنے آپ کو کیا سمجھ رہی ہے..... لیکن یہ جلن کیوں....؟ کلاوتی سے جلن کیوں؟ مجھے کیا ہے انل کسی کے ساتھ گل چھرے اڑائے مجھے کیا ہے..... انل مرا اڈرائیور رہا ہے، ایک معمولی ڈرائیور..... کلاوتی میرے ڈرائیور پر مر رہی ہے، مجھے کیا ہے، لیکن دماغ کی یہ آواز کومل کو کھوکھلی محسوس ہو رہی تھی..... دل اس کی آواز کا ساتھ نہیں دے رہا تھا..... وہ سوچنے لگی کہ وہ اس محفل میں انل کو تماشہ بنانے آئی تھی، لیکن خود ہی تماشہ بن کے رہ گئی...... وہ بدلے ہوئے حالات میں نروس ہونے لگی۔ اور جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''آپ......''

''میں جا رہی ہوں..... میری طبیعت ناساز ہوگئی ہے......''

''لیکن......''

''میں نے کہا..... نا..... میری طبیعت ناساز ہوگئی ہے.....'' وہ ترش آواز میں بول پڑی۔

فلمی جرنلسٹ نے کلاوتی کے تمام جملے سنے اور اب کومل کے بھی تمام جملے سنے اور انہیں دو اور دو چار بنانے لگا۔

واسودیو جو کبھی کالا سایہ بن کے انل کا تعاقب کرتا رہا تھا، انل کے سامنے آیا.... انل نے کہا۔

''میم صاحب کو ذرا باہر تک چھوڑ کے آیئے.....''

کومل کے جانے کے بعد انل کا دل بھی پارٹی میں نہ لگا.... فلم جرنلسٹ سب کچھ نوٹ کر رہا تھا۔

دوسرے دن مشہور فلمی اخبار ''جل ترنگ'' میں سرخیوں میں یہ خبر آگئی ''مشہور ایکٹریس کلاوتی نے ہرنام فلم کارپوریشن کے مالک انل ورما کی محبت میں تلخی کا باعث بننے کی کوشش کی۔

سرخیوں کے نیچے لکھا تھا۔

''کومل کیمیکل انڈسٹری کی مالکن خوبصورت پری وش کومل دیوی اور ہرنام انٹر پرائز زاور ہرنام فلم کارپوریشن کے مالک انل ورما کے درمیان بہت عرصے سے معاشقہ چل رہا ہے.....کومل دیوی انل ورما کی پارٹی میں آئی، اور چیئر مین صاحب (کومل پیار سے انل ورما کو چیئر مین صاحب کہتی ہے) کہہ کے مبارک باد دی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی.....پھر نہ جانے فلم ایکٹریس کلاوتی کو کیا سوجھا کہ وہ کومل دیوی کے سامنے انل ورما سے اظہار عشق کرنے لگی.....کومل دیوی غصے سے لال پیلی ہوگئیں اور پارٹی ختم ہونے سے پہلے ہی چلی گئیں۔ جانے سے قبل وہ انل ورما سے ترش کلامی کے ساتھ پیش آئی۔ مس کلاوتی، دومحبت کرنے والے دلوں کے درمیان دیوار بن گئی.....اب خدا ہی جانے اس محبت کا انجام کیا ہوگا.....''

کومل نے جب ''جل ترنگ'' کے نمائندے کی اس توڑ مروڑ رپورٹ کو پڑھا تو غصے سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی.....وہ دوڑتے ہوئے انل کے بنگلے میں پہنچ گئی۔

انل لان میں بیٹھا ہوا تھا، کومل کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

''آپ.....؟''

''پڑھو.....!'' جل ترنگ اخبار دیتے ہوئے کومل نے کہا۔

انل نے اخبار پڑھا۔

''یہ غلط ہے، جھوٹ ہے، بہتان ہے......'' کومل چیخ پڑی.....پھر یہ سب اخبار میں کیسے آیا.....تم نے کتنے پیسے ان اخبار والوں کو دیے؟''

''کومل.....'' وہ پہلی بار چیخ پڑا ''یہ ٹھیک ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن اس کا اعلان نہیں کرتا پھرتا ہوں۔ پھر اخبار والوں سے اپنی یک طرفہ محبت اور شہرت کا ڈنکا پیٹنے سے کیا فائدہ؟''

کومل اس کے جواب سے مبہوت رہ گئی.....انل کی صاف گوئی نے اس کا دماغ صاف کر کے رکھ دیا، اور کومل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اسی وقت نہ جانے کہاں سے روی کھنہ نمودار ہوا.....اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ڈرائیور! آخر تم جیت گئے.....اور میں ہار گیا۔ ڈرائیور، آج سے تین سال پہلے میں نے کومل کو پانے کا منصوبہ بنایا تھا.....لیکن سب ایک خواب ہی ثابت ہوا.....'' پھر وہ تلخ آواز میں انل سے کہنے لگا ''لیکن تم ٹھہرے ایک ڈرائیور، تم نہیں جیت سکتے.....روی کھنہ کے ہوتے ہوئے تمہاری

جیت نہیں ہوسکتی۔''

اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا پستول نکال لیا۔

''ڈرائیور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!''

''روی تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' کومل نے کہا۔

''میں تو تمہاری محبت میں دیوانہ ہو گیا ہوں......''

''اور اب قتل کرنے والا ہوں۔'' اس نے پستول کا ٹریگر دبایا.....اسی وقت گولی سے تیز رفتار ایک رام پوری چاقو اس کے ہاتھ کو چیرتا ہوا گزر گیا.....!

انل روی پر جھپٹ پڑا، اور اس پر قابو پالیا.....چاقو چلانے والا راکیش لان سے دوڑتا ہوا آ گیا....راکیش نے انل سے کہا۔

''سر چوٹ تو نہیں آئی؟''

''راکیش تم.....!'' کومل نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں میڈم اسٹال کی کتابوں کو آگ لگانے کے بعد، انل صاحب نے مجھے ڈھونڈ نکالا..... میری اس غلطی کو تو انل صاحب نے یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ میں آئندہ سے شریفانہ زندگی بسر کروں۔''

واسودیو اور کومل نے بے ہوش انل کو گاڑی میں رکھا.....بے ہوشی میں انل بڑبڑا رہا تھا۔

"I love you Komal I love you."

کومل کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

پیار کے شدید جذبے میں وہ انل کے ماتھے کو چومے جا رہی تھی۔اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ آج تک جس سے جو نفرت کرتی آئی ہے۔وہ نفرت نہیں، محبت تھی!

''شدید محبت.....!''

☆☆

## تبصرہ کتب

❁......رسالہ: شیرازہ اردو (صوفی غلام محمد نمبر)

❁......ناشر: کلچرل اکیڈیمی

❁......مبصر: نور شاہ

ریاستی کلچرل اکادمی اپنے مقبول جریدے ''شیرازہ'' کی وساطت سے ریاست جموں و کشمیر کی معتبر اور نامور شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کر کے جو نمایاں کردار نبھا رہی ہے وہ قابل تعریف ہے اور قابل توجہ بھی ۔ یہ ایک تاریخی نوعیت کا ادبی اور عملی کام ہے۔تاریخ ہمیشہ انسانی سوچ کے جزیروں میں پوشیدہ ہو کر اپنے عہد کے قلم کاروں کو اپنا حصہ بناتی ہے۔تاریخ ہمیشہ تخلیق کار کی ذاتی زندگی اور ذاتی معاملات سے قطع نظر صرف تخلیقات کو مرکزی حیثیت بخشتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ'' شیرازہ'' ہماری تاریخ کا ایک حصہ بن کر ہمارے قلمکاروں ، تخلیق کاروں ،ادیبوں ،شاعروں ،فن کاروں اور مصوروں کو ایک نئے انداز ،ایک نئے اسلوب سے پیش کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہے۔شیرازہ اب قریب قریب ساٹھ برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور اس دوران شیرازہ نے یہ منفرد مقام حاصل کرنے کے لئے جو تخلیقی کرب جھیلا ہے، جو جدو جہد کی ہے وہ دیکھنے سے نہیں بلکہ محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔

شیرازہ کا ''صوفی غلام محمد نمبر'' جلد نمبر ۵۵ شمارہ ۳-۲ پر مشتمل ہے۔یہ خاص شمارہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔مضامین حصہ اوّل میں شائع کئے گئے ہیں اور حصہ دوم افسانوں کے لئے مخصوص رکھا گیا ہے۔مضامین کی تعداد ۲۳ ہے اور یہ مضامین ریاستی قلم کاروں نے مختلف عنوانات کے تحت قلم بند کیے ہیں۔ان مضامین میں صوفی صاحب کی زندگی کے کچھ جانے پہچانے اور کچھ جانے انجانے پہلوؤں کی عکاسی نہایت محبت اور خلوص سے کی گئی ہے۔اُن کی ادبی اور صحافتی زندگی کے سفر کو خوش اسلوبی ،شائستگی ،سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

غلام نبی خیال، طاہر محی الدین، ڈاکٹر آفاق عزیز، ش۔م۔احمد، ذیشان فاضل اور قاسم سجاد نے صوفی مرحوم کے صحافتی خدوخال نفاست کے ساتھ اُبھارے ہیں۔ان لکھنے والوں میں اگر بشیر احمد بشیر بھی شامل ہوتے تو شاید صوفی صاحب کے کچھ گمنام خدوخال بھی سامنے آجاتے۔اس خاص نمبر میں اُن کے کارٹونوں کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔دوسرا حصہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ مرحوم صوفی صاحب کے تیرہ (۱۳) کشمیری زبان میں تحریر کردہ افسانوں کو اردو کا روپ خوبصورتی سے دیا گیا ہے۔صوفی صاحب نے بہت سارے افسانے اور خاکے ضبط تحریر میں لائے ہیں، لیکن شمارہ ہذا میں شامل افسانوں کا انتخاب نہایت ہی چابک دستی کے ساتھ کیا گیا ہے۔کچھ افسانے پڑھ کر اگر چہ خاکوں کا گماں ہوتا ہے لیکن یہ میرا موضوع نہیں ہے۔لیکن میں اعتراف کرنا چاہوں گا کہ ان افسانوں کے اکثر کردار مقامی ہیں۔میں ان زندہ جاوید کرداروں کو جانتا ہوں۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں اور صوفی صاحب شہر سرینگر کے اُس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جو ڈل جھیل کے کنارے آباد ہے اور اُن کی کہانیوں کے اکثر کردار، اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ چہرے نسوانی یا مردانہ اس قدر شناسا لگتے ہیں کہ اجنبیت کا شبہ تک نہیں ہوتا۔اُن کے افسانوں میں 'گنجا، رمضان بوڑھا، مالا بی بی، کوئلہ چور، علی حجام، سلطان تولہ اور احمد ریشی کے کردار اُن کے آبائی علاقہ ڈلگیٹ درگجن سے تعلق رکھتے ہیں۔

> ''یہ سارے کردار زندہ جاوید ہیں۔کشمیری زبان میں خاکہ نگاری کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ہر زمانے، ہر دور میں کچھ نمایاں کردار نظر آتے ہیں۔یہ کردار نہ مرتے ہیں اور نہ ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔
> ایسے کردار میری نظروں میں سماج کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں''

ان افسانوں کے تعلق سے اس شمارے میں میرے علاوہ جن دوسرے قلم کاروں نے صوفی صاحب کے افسانوی سفر پر گفتگو کی ہے اُن کے افسانوی فن کو پرکھا ہے، افسانوی کرداروں کے ذریعہ زندگی کی کڑوی سماجی سچائیوں کو دریافت کیا ہے۔اُن کے افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت کی تلاش کی ہے، اُن کے صاف اور خالص افسانوی نثر کی تعریف کی ہے اُن میں مشعل سلطان پوری، زاہد مختار، ولی محمد خوشباش اور حسرت حسین شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ صحافتی دنیا میں وہ صحافی نہایت خوش بخت ہے جس نے اپنے ذوق شوق کے مطابق صحافتی کام کرنے یا صحافی کا کردار نبھانے کے لئے راہ ہموار کرلی ہو۔اس پس منظر میں مرحوم صوفی غلام محمد کا نام اپنی نمایاں صحافتی کارکردگی کی بدولت جانا جاتا ہے۔

مرحوم صوفی صاحب نے سرینگر ٹائمنز کی بنیاد اس مقصد و مدعا سے ڈالی تھی کہ ریاست میں ہو رہی سیاسی نا عاقبت اندیشی، ظلم و جبر، ناانصافی اور سماجی استحصال کی صحیح اور بروقت عکاسی کی جائے۔وہ جب تک زندہ رہے، اُن کے قلم کی قوت ساتھ دیتی رہی۔وہ انسانی ضمیر کو اپنے اخباری اداریوں میں بیدار کرتے رہے۔اپنی سوچ و فکر سے انسانی زندگی کو بلندیوں پر لے جا کر خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے رہے۔انہوں نے اپنی صحافتی زندگی میں بڑے اُتار چڑھاؤ دیکھے۔شیرازہ کے ''صوفی نمبر'' میں اہل قلم حضرت نے بڑے موثر انداز میں صوفی صاحب کی صحافتی زندگی کے بہت سارے پہلوؤں کی عکاسی کر کے ایک نڈر، باصلاحیت، دلچسپ اور غیر مصلحت پسند صحافی کو اپنے اپنے انداز سے خراج عقیدت پیش کر کے ریاستی کلچرل اکادمی کے اس ادبی دستاویز کو ایک تاریخی حیثیت دی ہے۔ہر تحریر دل کو چھوتی ہے۔سارے مضامین قابل ستائش اور قابل مطالعہ ہیں۔

☆☆

❁......کتاب: پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار

❁......مرتب: پریمی رومانی

❁......مبصر: ڈاکٹر چمن لعل بھگت

''پریم ناتھ پردیسی۔عہد، شخص اور فنکار'' آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی کی تحریر کردہ تصنیف ہے جو ریاست جموں کشمیر کے سب سے بڑے افسانہ نگار جن کا اصلی نام مدھوسودھن تھا، لیکن ادبی دنیا میں پریم ناتھ پردیسی کے نام سے متعارف ہیں، کی شخصیت اور فکر و فن کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل زیرِ نظر کتاب کو ڈاکٹر برج پریمی کے صاحب زادے جو اُردو حلقوں میں ڈاکٹر پریمی رومانی کے نام سے جانے جاتے ہیں، نے ترتیب و تہذیب دیا ہے۔رچنا پبلی کیشنز جموں (توی) سے شائع شدہ ''پریم ناتھ پردیسی۔عہد، شخص اور فنکار'' کو پردیسی کے بڑے فرزند مرحوم

سوم ناتھ سادھو کے نام نذر کیا گیا ہے۔اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں پریمی رومانی (مؤلف) نے ''میری بات'' میں پریم ناتھ پردیسی کو نہ صرف کشمیر کا سب سے بڑا کہانی کار قرار دیا ہے بلکہ اُردو افسانے کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے بامِ عروج تک لے جانے والا کشمیر کا ''پریم چند'' بھی کہا ہے۔مختلف انداز میں لی گئی پریم ناتھ پردیسی کی پانچ تصاویر کے ساتھ ساتھ پردیسی کی اہلیہ آنجہانی کملاوتی، پردیسی کے بڑے صاحبزادے آنجہانی سوم ناتھ سادھو اور پردیسی کے چھوٹے فرزند ایس، کے، سادھو کے علاوہ پریم ناتھ پردیسی کے معاصرین جن میں پریم ناتھ بزاز، بابائے صافت لالہ ملک راج صراف، راجندر سنگھ بیدی، راما نند ساگر، محمود ہاشمی اور شیام لال ایمہ کے نام سرِفہرست ہیں، کی تصاویر بھی زیرِ بحث کتاب میں شامل ہیں۔علاوہ ازیں آنجہانی سوم ناتھ سادھو کا ایک خط بنام ڈاکٹر برج پریمی بھی ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی کی کتاب ''پریم ناتھ پردیسی۔عہد،شخص اور فنکار'' تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں حصّہ اول کی پانچ کڑیاں ہیں۔پہلی کڑی ''حیات''،''شخصیت کے اہم گوشے'' اور ''فکری اور ادبی پس منظر'' تین ذیلی ابواب پر مشتمل ہے جن میں فاضل مصنف نے پریم ناتھ پردیسی کے آباواجداد کا ذکر کرتے ہوئے انہیں کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان ''سادھو'' کا وارث بتایا ہے۔اس کے علاوہ پیدائش، تعلیم وتربیت، گھریلو زندگی، تخلیقی سفر کا آغاز، ملازمت کا تفصیل سے ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ پردیسی کے سیاسی نظریے کو بھی زیرِ بحث لایا ہے۔ڈوگرہ راجاؤں کا اُردو شعروادب کے تئیں خدمات سرانجام دینے اور اُس دور کے اُردو ادبی منظرنامے پر بھی روشنی ڈالی گئی۔دوسری کڑی میں پریم ناتھ پردیسی کو اُردو کی ادبی تاریخ مرتب اور مکمل کرنے والی قدآور ہستیوں مثلاً اقبالؔ، چکبست، سرشار، دیا شنکر نسیمؔ، آغا حشر کاشمیری، سعادت حسن منٹو، قدرت اللہ شہابؔ، راما نند ساگرؔ وغیرہ کے قافلے کا ہم سفر بتانے کے علاوہ معمارِ اُردو افسانہ یعنی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سدرشن، مجنوںؔ، اعظم کریوی اور نیاز فتح پوری وغیرہ کے ساتھ گردانا ہے۔حصہ اوّل کی اگلی کڑی ''پریم ناتھ پردیسی کی شاعری'' ہے جس میں پریم ناتھ پردیسی کا تخلص رونقؔ بتایا ہے۔نیز اس بات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ پردیسی نے ابتدا میں ہی شاعری سے مُنہ موڑ کر افسانہ کی طرف رُخ کر لیا تھا۔''پردیسی۔ایک نظر میں'' زیرِ تبصرہ کتاب کا چوتھا باب ہے

جس میں پردیسی کی شخصیت کے مختلف اور اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے گویا کہ ڈاکٹر برج پریمی نے سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے۔ پانچوں کڑی ''پردیسی کا ادب'' میں فاضل مصنف نے پردیسی کے شائع شدہ تین افسانوی مجموعوں میں شامل تمام افسانوں کے علاوہ اُن کے غیر مطبوعہ افسانے، ادب پارے، شاعری اور دیگر ادبی کاوشوں کو ایک مکمل فہرست کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جو پردیسی پر تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک مشعلِ راہ ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی کی تصنیف ''پریم ناتھ پردیسی۔ عہد، شخص اور فنکار'' کا حصہ دوم ''مکتوبات'' دو ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں وہ دس خطوط شامل ہیں جو غلام حیدر چستی، پرتھوی ناتھ کول، کندن لعل، محمود ہاشمی، صمد شاہین، راجندر سنگھ بیدی، صدیقہ بیگم، سہیل عظیم آبادی وغیرہ مشاہیر نے ڈاکٹر برج پریمی کے نام تحریر کیے ہیں جبکہ دوسرے باب میں چھ خطوط شامل ہیں جو ڈاکٹر برج پریمی کو پردیسی کے محاصرین جن میں پریم ناتھ بزاز اور نبیر (ایڈیٹر ملاپ) کے نام سرِ فہرست ہیں، نے لکھے ہیں۔ نجی ہونے کے باوجود ان خطوط کی ادبی اہمیت مسلمہ ہے۔

''پریم ناتھ پردیسی۔ عہد، شخص اور فنکار'' کا آخری حصہ ''پردیسی کی غیر مطبوع تحریریں'' ہے جو دو ابواب پر منقسم ہے۔ باب اوّل میں پردیسی کے اُن افسانوں (اُس پار، پہلا تیر، راگنی کے گیت، اُجڑے مندر کے باہر، کیچڑ کے دیوتا، بڑادِل، مرغی، نرک اور نابینا گویا) اور نثر پاروں (حسین موت، دیہاتی گیت، تمہارا گھر، پُوجاری، تُم، ملنے کے دن، ایک کشمیری گیت، دو آنکھیں، برہمن کے گیت، سازش، ہائے دُنیا، بن مالا، اپنے چاند سے، نیا گیت اور رادھا کا ہار) کو شامل کیا گیا ہے جو اُس دور کے مختلف ماہنامہ رسائل و جرائد میں شائع ہوکر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس حصہ کا دوسرا باب پردیسی کا منتخب کلام ہے جس میں چھ غزلیں اور ایک نظم بعنوان ''کرشن کی یاد'' شامل ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے شواہد کو اکٹھا کر کے کشمیر کے پہلے افسانہ نگار، اعلیٰ پایہ کے ڈراما نویس، رپوتاژ اور نثر پاروں کے مہار تھی، وادی کشمیر میں حلقہ اربابِ ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کے مُوجد اور کشمیر کے عاشق یعنی پریم ناتھ پردیسی کی شخصیت اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کو ٹٹولا ہے یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ کرنے سے نہ صرف پریم ناتھ پردیسی بحیثیت عہد ساز شخص و فنکار اُبھر کر سامنے آتے ہیں بلکہ ریاست

جموں وکشمیر کے شہرت یافتہ فنکاروں کے ادبی کارناموں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اس کے علاوہ ریاست میں اُردو شعروادب اور زبان کے مختلف ادوار کا تعین بھی ہوتا ہے۔نیز فاضل مصنف، کی تخلیقی و فنی صلاحیتوں کا اعتراف بھی ہوتا ہے اور مؤلف کی تخلیقی، تحقیقی، ادبی اور تاریخی دلچسپی بھی جلوہ گر ہے۔ڈاکٹر برج پریمی کی زیرِ بحث تصنیف پریم ناتھ پردیسی کی شخصیت اور فکر وفن پر انسائیکلوپیڈیا کا درجہ بھی رکھتی ہے اور اردو ادب میں ایک گراں قدر سرمایہ و اضافہ کی حیثیت بھی۔

☆☆

❁......شعری مجموعہ:۔فصیلِ شہر سے

❁......شاعر:۔پرویز مانوس

❁......مبصر:۔سہیل سالم

اچھی شاعری زندگی کے گہرے شعور، انسانی اقدار کے شدید احساس اور جمالیاتی پہلوؤں کے صحیح ادراک سے وجود میں آتی ہے۔ایسی شاعری معراج کمال کو اس وقت پہنچتی ہے، جب شاعر اس میں مفکرانہ آہنگ پیدا کر دیتا ہے۔موجوہ دور کی شاعری میں یہ خصوصیات بمشکل میں ملتی ہیں۔کچھ فنکار ایسے بھی ہے جو اس عام روش سے ہٹ کر اپنا کام کر رہے ہیں۔شاعری جن کے لئے طاق جاں میں چراغاں کرنے کا دوسرا نام ہے۔پرویز مانوسؔ کا شمار بھی ایسے شاعروں میں ہوتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''فصیل شہر سے'' پرویز مانوسؔ کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔''فصیل شہر سے'' کا انتساب انھوں نے اپنی اہلیہ کے نام کر کے لائق خاوند ہونے کا ثبوت دیا ہے۔مذکورہ کتاب میں انھوں نے واردات قلب کو منظر عام پر لانے کے لئے غزلیات کے توسط سے اپنی تشنگی کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے ؎

شب ظلمت کو اک نور سحر دے مولا ‏ ‏ ‏ پھر اسیروں کو رہائی کی خبر دے مولا

اڑ کے آجائے وہ بارود کی اس بستی میں ‏ ‏ ‏ اک فرشتے کی طرح امن کو پر دے مولا

''فصیل شہر سے'' پرویز مانوسؔ کی ایسی چنیدہ غزلوں کا مجموعہ ہے، جس سے میں انھوں نے عصر حاضر کی شہری زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اپنے منفرد لب و لہجے میں بیان کرنے کی

کوشش کی ہے۔انھوں نے زندگی کے نشیب وفراز اور رشتوں کی شکست کی کھل کر عکاسی کی ہے۔یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

جس گھر میں بزرگوں کے ٹھکانے نہیں ہوتے
اس گھر میں تو رحمت کے خزانے نہیں ہوتے

پرویز مانوسؔ فنی شاعر سے زیادہ فطرتی شاعر ہے۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فطری ذوق شوق کو شعر گوئی کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی لئے ان کے یہاں عام انسان کی طبعیت وجبلت کی عکاسی نظر آتی ہے۔شاعر نے چونکہ زندگی کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھا ہے۔اور اس کے مکروفریب اور خودغرضی کو ذاتی طور پر آزمایا ہے۔اسی لئے ان کے یہاں عصر حاضر کے لوگوں کی فطرت کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔مانوسؔ صاحب نے چونکہ زندگی کو زمینی سطح سے دیکھا ہے اور دنیا کے مکروفریب اور اس عہد کی تمام ہی تکالیف دہ اور روح فرسا حالات کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔اس لئے عصر حاضر کے شدید المیہ اور اس کی تباہیوں کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ ؎

نہ میں غربت سے ڈرتا ہوں نہ لاچاری سے ڈرتا ہوں
فقط اس دور کے آدم کی عیاری سے ڈرتا ہوں
نہ میرا کچھ بگاڑیں گے کبھی اغیار کے پتھر
یہاں میں فقط اپنوں کی گلباری سے ڈرتا ہوں

موجودہ عہد جس بحران اور تعطلل کا شکار ہے،انسانیت جس بے چینی سے دوچار ہے، پرویز مانوسؔ اس سے بجا طور واقف ہیں۔ان کی موزونی طبع نے انھیں شعری پیراہن عطا کیا ہے جو تمام تر شعری لوازمات سے مزین ہیں۔ان کی شاعری میں ناکامیوں، پریشانیوں کا ذکر تو ہے لیکن وہ کہیں قنوطیت کے شکار نہیں ہیں۔تاریکی اور بادوباروں میں ان کی شاعری بجلی کی چمک کی مانند ایک امید توقع ہے۔شعر ملاحظہ فرمائیں: ؎

اوس کے بدلے خون کی بوندیں دھرتی پر جب ٹپکیں گی
جذبوں کے کچھ پھول کھلیں گے انگاروں کی بستی میں

پرویز مانوسؔ نے سیاسی،تہذیبی اور معاشرتی موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنیا اور

انفرادی رنگ کے پردے میں اجتماعی تجربات کی ترجمانی کی ہے۔ مانوسؔ صاحب نے اپنے تجربات میں نئی ذہنی رو کو عام کیا ہے جو بدلتے حالات اور اس کی تشریح و تعبیر سے وجود میں آتی ہے نیز انہوں نے اپنے شاعرانہ خیالات میں جو سیاسی، سماجی، مذہبی، تاریخی اور فلسفیانہ عناصر شامل کیے ہیں وہ دراصل جدید ماحول کے خاص اور عام دونوں طبقوں کے محسوسات ہیں۔ پرویز مانوسؔ کی تخلیق کے مقامی سروکار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سینے میں بے بسوں، بے کسوں، اور مظلوموں کے لئے دردمندی کا جذبہ ہردم موجزن رہتا ہے۔ ظلم کے بوجھ سے دبے بے بس کشمیریوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی کے رجحان کو دیکھ کے وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔

کس نے سوچا تھا یہ بستی ماتمی ہو جائے گی     چادرِ شب پھر لہو سے چمپئی ہو جائے گی

پھر سے وارد ہو چکا ہے شہر میں ابن زیاد     لگ رہا ہے خون سے تر ہر گلی ہو جائے گی

میں سمجھتا ہوں کہ شعر ایسا ہو جو پڑھنے کے بعد سیدھا دل میں اتر جائے اور شاعر کے جذبات وخیالات کا اظہار بھی ہو جائے۔ پرویز مانوسؔ کے اس شعری مجموعہ کی وہی خوبی ہے ان کے کلام میں پرواز ہے، گہرائی ہے، روانی ہے۔ انھوں نے اس مجموعے میں متعدد بار آسمان، سورج، لہو، خوشبو، سمندر، کشتی اور اڑان وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ان کے خیالات کی گہرائی کی عکاسی ہوتی ہے اور انھوں نے ایک فن کار کی نظر سے دیکھا ہے۔ قارئین کے لئے یہ دعوت فکر بھی ہے۔ شاعر معاشرے کی آنکھ ہوتی ہے ایسے میں حالات حاضرہ سے بے خبری کیسے ممکن ہو۔ موجودہ زمانے میں معاشرتی اقدار کے زوال، بے انصافی اور نفانفسی کا اظہار پرویز مانوسؔ نے جہاں اپنا شاعرانہ فرض ادا کیا وہیں آئندہ آنے والے دور کے لیے لمحہ موجوہ کو سمجھنے کے لئے تصاویر بھی چھوڑ دی ہیں۔ ان کا کلام نئے رنگ، ڈھنگ کے پہلوؤں کا وہ گلدستہ ہے جو روایت کے گلابوں پر رکھا ہوا ہے جس میں تازہ پھولوں کی خوشبو ہے۔ شاعر کی زبان ستھری اور سلیس نظر آتی ہے۔ پوری کتاب میں اور شعروں میں لفظیات بے حد متناسب اور پیچیدگی سے پاک ہے۔ اسی انداز نے ان کے شعری مجموعے کو قابل قدر بنایا ہے۔ ہم ایسی امید کرتے ہیں کہ "فصیل شہر سے" بہت جلد ہی اپنے سنجیدہ قارئین کے حلقوں میں پسندیدگی کا مقام حاصل کرلے گا۔

☆☆

URDU

# SHEERAZA

ISSN 2277-9833

Volume: 55 Number: 10-12

*Chief Editor*
*M. Ashraf Tak*

Published by:

*Jammu & Kashmir*
*Academy of Art, Culture and Languages*